﴿جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں﴾

نام کتاب : تفہیم المسائل (جلد چہارم)

مصنف: پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

صفحات:

تعداد:

قیمت:

☆......ناشر......☆

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۱۴/انفال پلازہ اردو بازار، کراچی

ملنے کا پتا:

دارالعلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون:021-6314508/6324236

مکتبۂ اہلسنت جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

فون:042-7634478

WWW.NAFSEISLAM.COM

☆انتساب☆

میں اپنی اس ناچیز علمی کاوش کو اپنے ایک جدِّ اعلیٰ حضرت قبلہ قاضی عبد الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ وقدس اللہ سرہ العزیز کے نام سے منسوب کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، جو اپنے عہد کے ایک عالمِ اجل، جامع العلوم، صاحب ورع وتقویٰ اور ولی کامل تھے۔

15، ستمبر 2007ء

العبد الضعیف

منیب الرحمن

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

مضمون	صفحہ نمبر
آغازِ تکلّم	14
﴿کتاب العقائد﴾	16
کلمۂ کفر	18
توہینِ نبی	19
نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کے بارے میں	20
اہانتِ معاویہ	27
نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت	29
غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا	31
آثارِ قیامت میں ''تقاربِ زمانی'' کا مفہوم	38
زمانے کو برا کہنے کی ممانعت	41
﴿کتاب الطہارت﴾	44
غسل کے بعد وضو	46
بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل	47
﴿کتاب الصلوٰۃ﴾	48
طلوع آفتاب اور نماز	50
تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم	52

ظہر کے پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟ 57
جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے، اس جگہ پر نماز پڑھنا 60
مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر محفوظ کرنا 61
نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت کہہ دینا 62
امام یا مؤذن کا غیر شادی شدہ ہونا 65
تراویح کی امامت کا استحقاق 66
جسمانی نقص سے امامت میں فرق 67
نابینا کی امامت 69
امام صاحب کی رہائش 71
نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم 73
قراءت کی غلطی سے فسادِ نماز 75
قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپسی اسی جگہ سے پڑھنا 77
ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کرنے کا حکم 78
مسجد میں جماعتِ ثانی 79
WWW.NAFSEISLAM.COM

خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا ہے 83
نمازِ قصر میں وطن کی اصطلاح 85
اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی 88
خطبۂ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت 92
نمازِ جمعہ کے بعد طویل دعا 97
کپڑا لٹکا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم، نماز میں ''کفِ ثوب''، جرِّ ثوب اور اسبال ازار'' کا حکم 100
تسبیحات فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنَن ونوافل کے بعد؟ 113
﴿کتاب المساجد﴾ 120
مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے مدرسے کا حکم 122
مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا 126
منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں 129
مسجد کی بالائی منزل پر جماعت 130
فنائے مسجد کا حکم 131
چندہ جس مقصد کے لئے جمع کیا گیا ہے، اسے اس کے بجائے دوسرے مصارف پر صرف کرنا 134
مسجد کا استعمال شدہ سامان کسی دوسری مسجد میں دینا 137
WWW.NAFSEISLAM.COM

خزانچی کے گھر سے مسجد کی رقم کی چوری 138
مسجد اور مسلک 139
مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی کراہت اور عذر کی بنا پر جواز کی صورتیں 141
نامکمل وقف 146
﴿کتاب الجنائز﴾ 148
غسلِ میت سے پہلے ایصالِ ثواب یا قرآن خوانی 150
مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین 152
پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت 154
جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا 159
مردہ پیدا ہونے والے بچے کے کفن دفن کا طریقہ 161
﴿کتاب الزکوٰۃ﴾ 164
زکوۃ کی رقم سے قرض کی ادائی 166
زکوۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی / زکوۃ کی رقم ھبہ یا قرض کہہ کر دینا 166
ادھار کی رقم سے زکوۃ کی ادائیگی 168
اسپتال کے لئے زکوۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری 169
زکوۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا 169

ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوۃ واجب نہیں 171
زکوۃ کی رقم سے ڈائلیسس مشین کی خریداری 174
مقامی مدارس میں زکوۃ اور نفلی صدقات کا استعمال 176
زکوۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط 177
زکوۃ کا استحقاق 178
﴿کتاب الصوم﴾ 180
دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم 182
عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا 184
غسل واجب ہو اور صبح صادق 185
﴿کتاب الحج﴾ 188
فلسفہ وروح حج 190
قرعہ اندازی اسکیم پر حج 196
اسقاطِ فرض کے لئے حج بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ 197
حج قران میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا ایک 199
صدقہ لازم آئے گا یا دو دو
دم کی ادائیگی حدودِ حرم میں 201
احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم 202
دورانِ حج ناپاکی 204
WWW.NAFSEISLAM.COM

حج وعمرہ کے مسائل 205

عمرے کی ادائیگی کے لیے محرم 230

حج سے تمام گناہوں کا معاف ہو جانا 231

﴿کتاب النکاح﴾ 234

حرمتِ رضاعت 236

ثبوتِ رضاعت 238

خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے 239

حرمتِ مصاہرت 243

حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں 247

شادی اور تقریبات پر فائرنگ اور آتش بازی 250

جبری نکاح کا حکم 252

جعلی نکاح نامے کی حیثیت 254

غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت 255

میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا 256

حرمتِ نکاح 262

حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح 263

WWW.NAFSEISLAM.COM

لاعلمی میں بہن بھائی کا نکاح 265
تحلیلِ شرعی کے لئے زوجِ غیر کے ساتھ نکاحِ صحیح ضروری ہے 266
عنین کا حکم 267
حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے 271
﴿کتاب الطلاق﴾ 276
"دلالتِ حال" نسبت طلاق کے لئے کافی ہے 278
ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق 280
طلاقِ ثلاثہ کے بعد شوہر اول سے نکاح کا حکم 283
الفاظِ طلاق 285
مذاکرۂ طلاق 287
تین طلاق کا حکم 289
طلاق میں اضافت 293
بیوی کو مشروط طلاق دینا 296
خلع اور حقِ حضانت 297
طلاقِ بائن 299
"تم تو میری بیوی نہیں ہو"، الفاظِ طلاق نہیں 301
مسئلۂ طلاق 302
مشروط طلاق 304

طلاق معلق بالشرط 306

خلع 307

زوجِ مفقو دالخبر 307

تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے 313

طلاقِ مغلظہ کے بعد تعلقات 314

ثبوتِ طلاق کے طریقے 116

طلاقِ غیر مدخولہ 318

تحلیلِ شرعی کے لئے شخصِ غیر کی قید 319

طلاق ہوئی یا نہیں؟ 320

جبری طلاق کی ایک صورت 321

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (1) 325

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (2) 326

امام شافعی کے نزدیک تین طلاق کا حکم 328

انکارِ طلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے 329

طلاقِ مدہوش 333

فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤدّبانہ گذارشات 335

ماں کا حقِ نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں 343

بچوں کی کفالت 346

﴿کتاب العدت﴾ 350

عدت 352

کیا میں دورانِ عدتِ طلاق گھر سے باہر جاسکتی ہوں؟ 353

عدتِ وفات 354

مدّتِ عدت 356

ازدواجی تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے 359

دورانِ عدت جنازے میں شرکت 359

﴿کتاب الفرائض﴾ 362

ترکہ کی تقسیم 364

ایک یا دو اشخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہوجانا 368

لاوصیۃ لوارث 369

تقسیمِ ترکہ میں مقدم کون؟ 370

تقسیم ترکہ اور برٹش لاء 375

لاولد چچا کے ترکے میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حقِ وراثت 377

لاولد پھوپھی کے ترکے میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے 379

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت 380

تقسیمِ وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت	383
شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیم ترکہ	385
بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟	386
زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی	387
کیا سوتیلا بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے	388
ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق	389
غیر وارث کو ترکے سے حصہ	390
تقسیم ترکہ	392
ڈان	393
ترکے میں سوتیلی اولاد کا حصہ نہیں	395
پنشن ترکے میں شامل نہیں	395
مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے	397
﴿حلال وحرام،جائز وناجائز﴾	400
قتلِ خطا	402
قتلِ شبہ عمد	405
غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا	408

WWW.NAFSEISLAM.COM

محافلِ میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ ''اس میں حضور ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اوراس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے'' 412
خاتون مبلغہ کا غیر شرعی طرزِ عمل 418
مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے 426
مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے 427
شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی 432
پرائز بانڈز اور شیئرز کا شرعی حکم 433
ٹریفک سگنل توڑنے کا شرعی حکم 434
کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج 435
بجلی کی چوری 436
انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائشِ نسل کا جواز 438
روحانی علاج کی شرعی حیثیت 439
﴿متفرق﴾ 442
والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجرِ آخرت باطل نہیں ہوتا 444

WWW.NAFSEISLAM.COM

پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایام تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم 446
قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے
استخارہ کا مفہوم، شرعی حیثیت اور استخارہ کے نام پر ماضی کے 448
احوال بتانا
قیامِ تعظیمی کا شرعی حکم 454
نیاز کا مفہوم اور جواز 460
رجب کے کونڈے اور "تبارک" کی روٹیاں 461
قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا 465
ایصالِ ثواب کا کھانا اور صدقۂ جاریہ 471
یومِ میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعیّن 478
محافلِ میلاد میں مخلوط اجتماعات 484
تبرکات انبیاءِ کرام کا احترام 485
عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں 489
نمازِ تراویح کی امامت کا معیار 490
مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت 491

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلیٰ اٰلہ الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقھاء المجتھدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

آغازِ تکلّم

تفہیم المسائل کی جلد چہارم پیشِ خدمت ہے۔ بنیادی طور پر یہ سوال و جواب روز نامہ ایکسپریس میں شائع ہوتے رہے ہیں، کچھ ایسے سوال وجواب ہیں، جو اخبار میں شاملِ اشاعت نہ ہو سکے، وہ بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ بعض اوقات ایک جیسے سوال مختلف سائلین کی جانب سے آتے ہیں، اس لئے نفسِ مسئلہ اور جواب میں درج مواد کا تکرار ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اشاعت سے پہلے نظرِ ثانی کے لئے اپنے دارالعلوم کے استاذِ حدیث وصدر مدرّس علامہ احمد علی سعیدی صاحب زیدمجدھم کو دیا، انہوں نے کافی محنت سے پڑھا، جہاں ضروری عربی عبارات شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، وہ شامل کرائیں اور مکرّرات کو حذف کرایا۔ حتمی مراحل میں تصحیح کے لئے فاضل مصنّف وصاحبِ طرز ادیب علامہ محمد اعظم سعیدی نے سرسری مطالعہ کیا اور جو فروگزاشت رہ گئی تھیں، ان کی نشاندہی فرمائی۔ اس کتاب میں شامل مسائل کے حل میں میرے معاون مفتی عبدالرزاق نقشبندی

WWW.NAFSEISLAM.COM

زید مجدہٗ کا علمی تعاون شامل حال رہا ہے۔ کمپوزنگ اور بار بار تصحیح میں عزیزم یاسر رحمٰن نے مسلسل محنت کی، میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔ ہم تمام درپیش مسائل میں اپنے دارالعلوم کے شیخ الحدیث، امام المفسرین والمحدثین فی العصر علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم سے مشاورت بھی کرتے رہتے ہیں اور تمام متعلقہ مقامات پر ''تبیان القرآن'' اور ''شرح صحیح مسلم'' سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ علامہ صاحب کی ''نعمۃ الباری'' شرح صحیح بخاری کی چوتھی جلد پر کام ہو رہا ہے اور ''کتاب الصِّیام'' کے نصف تک مکمل ہوچکی ہے۔ پہلی جلد جو'' کتاب التیمم '' پر مکمل ہوئی ہے، ان شاء اللہ العزیز عیدالاضحیٰ کے موقع پر طبع ہوکر مارکیٹ میں آجائے گی اور اہلِ علم ''شرح صحیح مسلم'' کے انداز سے ہٹ کر ایک منفرد طرز میں اسے پائیں گے۔ اللہ عزّوجلّ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ تمام تر علمی، فکری اور جسمانی قُویٰ کی سلامتی کے ساتھ انہیں اس عظیم کام کی تکمیل کی توفیق و سعادت نصیب فرمائے، ممکنہ طور پر یہ شرح بارہ مُجلّدات میں مکمل ہوگی۔ ہم نے اپنی بشری استطاعت کی حد تک اس کتاب کی لفظی و معنوی صحت کی سعی کی ہے، لیکن ہماری سعی میں خطا اور لغزش کا امکان موجود ہے، بلکہ ہم جیسے کم علم اور خطا کار انسانوں سے ایسی خطاؤں کا وقوع بھی ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے۔ اہلِ علم سے گذارش ہے کہ ہماری کسی خطا پر آگاہ ہوں تو ضرور مُطّلع فرمائیں، ہم ان کے شکر گزار رہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اس عاجزانہ سعی کو قبول فرمائے، اور اسے

سابقہ مجلّدات کی طرح قبول عام عطا فرمائے، آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ افضلُ الصَّلٰوۃِ والتَّسلیمات۔

العبد الضعیف

منیب الرحمٰن

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

کلمۂ کفر

سوال: 1

زید اور بکر میں کسی فقہی مسئلے کی وجہ سے بحث ہوئی اور جبکہ زید طالب علم ہے، اور زید نے کہا کہ فلاں مسئلے کے بارے میں فلاں فلاں علماءِ کرام وفقہاءِ عظام نے یہ یہ فرمایا ہے کہ جبکہ تمہاری بات ان کے خلاف جاتی ہے، تو اس پر بکر سے کچھ جواب نہ بنا اور بکر نے یہ کہا کہ "میں اپنے مرشد کے فرمان کے آگے (معاذ اللہ) تمام عالموں اور مفتیوں کے فتووں کو جوتے کی نوک پر اڑاتا ہوں"۔ آیا بکر کا یہ جو جملہ ہے کہ "میں ان کے فتووں کو جوتے کی نوک پر اڑاتا ہوں"۔ بکر کا یہ قول کہنا کیسا ہے، جواب عنایت فرمائیں، (محمد راحیل قادری، ملیر سٹی، کراچی)۔

جواب:

اللہ اور رسول کے علاوہ دوسرے کسی بھی شخص کا قول وعمل مطلقاً واجب العمل اور حجت نہیں ہے، کسی شخص کا اپنے پیر ومرشد یا استاد کا یا کسی دوسرے معظم شخص کے بارے میں یہ نظریہ رکھنا کہ ان کا فرمان میرے لئے مطلقاً واجب العمل ہے، غلو یعنی مبالغہ آرائی اور گمراہی ہے، متبع سنت عالم دین پیر ومرشد سے عقیدت رکھنا اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنا فعل مستحسن ہے، لیکن اس کے نتیجے میں علماءِ دین اور ان کے شرعی فتووں کی حقارت کرنا یہ کفر ہے۔ استفتاء میں مذکور خط کشیدہ الفاظ میں مذکور فی السوال شخص نے علم اور علماء کی بالقصد والارادہ توہین کی ہے اور فقہاءِ کرام کی تصریحات کی رو سے شرعی فتاویٰ اور بغیر کسی دنیاوی عداوت کے علماء کی تذلیل وتحقیر کفر ہے، لہٰذا مذکورہ

فی السوال شخص اپنے ان کفریہ الفاظ کی وجہ سے کافر ہوا، اس پر توبہ کرکے تجدید ایمان اگر شادی شدہ ہے، تو تجدید نکاح فرض ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

رجل عرض علیه خصمه فتوی الائمة فردها وقال چه بارنام فتوی آوردهٔ قیل یکفر وکذا لولم یقل شیئاً ولکن القی الفتوی علی الارض وقال این چه شرع است۔

ترجمہ: ''ایک شخص پر اس کے فریقِ مخالف نے ائمۂ فقہاءِ کرام کا فتویٰ پیش کیا، اس نے جواباً کہا کتنی بار فتویٰ کا نام لوگے، ایک قول کے مطابق وہ کافر ہوجائے گا، اسی طرح اگر اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن فتویٰ زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ یہ کہاں کی شریعت ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد2، ص: 272، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

توہینِ نبی

سوال :2

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیانِ شرع اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ''میرے باپ کی بات کا درجہ میرے نزدیک نبی کی بات سے کم نہیں''، اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس کا مذکورہ جملہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟، (محمد قاسم، بہاول نگر)۔

جواب:

جس شخص نے یہ جملہ کہا العیاذ باللہ وہ کافر ہوگیا اور اس پر لازم ہے کہ وہ اس بات سے رجوع کرے اور دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو دوبارہ نکاح کرے، کیونکہ اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو نبی ﷺ کے برابر قرار دیتا ہے اور اس میں نبی ﷺ کا استخفاف ظاہر ہے اور اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا

ہے کہ جب وہ اپنے باپ کی بات کو نبی ﷺ کی بات کے برابر سمجھتا ہے تو وہ اپنے باپ کو معاذ اللہ نبی ﷺ کے برابر سمجھتا ہے۔

نبی ﷺ کی بات کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:

وما ینطق عن الھوی o ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

ترجمہ: ''اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے، نہیں ہوتا ان کا فرمانا مگر وحی جو (ان کی طرف) کی جاتی ہے، (النجم:3,4)''۔

آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے قول کو اپنا قول فرمایا ہے۔اور مذکورہ شخص کا یہ جملہ کفریہ ہے، لہٰذا وہ اپنی بات سے رجوع کرے اور کلمہ پڑھے، شادی شدہ ہے تو دوبارہ نکاح کرے، علامہ امجد علی اعظمی ایک سوال کے جواب میں درمختار کے حوالے سے لکھتے ہیں: ما یکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح و اولادہ اولاد زنا وما فیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ و تجدید النکاح ۔

ترجمہ: ''جس نے کفر پر اتفاق کیا اس کا عمل اور نکاح باطل ہو گیا اور اس کو توبہ و استغفار اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے بعد جو اولاد پیدا ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی، (فتاویٰ امجدیہ جلد چہارم ص:399 مکتبۂ رضویہ آرام باغ کراچی)۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کے بارے میں

سوال:3

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ معاذ اللہ! رسول اللہ کے والدین کریمین جہنمی ہیں اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں پیش کرتے ہیں:

(1): ''حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ مُلیکہ کے دو بیٹے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ہماری ماں شوہر کا احترام کرتی تھی، اولاد پر مہربان

تھی، اور مہمان (کے ساتھ حسن سلوک کا بھی) ذکر کیا، سوائے اس کے کہ اس نے زمانہ جاہلیت میں بچی کو زندہ درگور کر دیا تھا، (تو نبی کریم ﷺ نے) فرمایا: تم دونوں کی ماں جہنم میں ہے، وہ پلٹ کر جانے لگے اور نا گواری ان کے چہرے پر واضح نظر آ رہی تھی، پھر (نبی کریم ﷺ) نے ان دونوں کو واپس بلوایا، وہ دونوں لوٹ کر آئے اور ان دونوں کے چہروں سے اس امید پر مسرت جھلکنے لگی کہ (شاید کوئی امید افزا) صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری ماں بھی تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے'' (آگے حدیث طویل ہے) مسند احمد، رقم الحدیث: 3787)''۔

(2): ''حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے (وفات یافتہ) باپ کہاں ہیں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: جہنم میں، جب وہ لوٹ کر (جانے لگا) تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: ''بیشک میرا اور تمہارا باپ (دونوں) جہنم میں ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 490)''۔ ان احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کی بابت شرعی موقف واضح کیجیے، (علی حسن نقوی)۔

جواب:

یہ احادیث ان دونوں کتب احادیث میں موجود ہیں۔ مسند احمد کے حاشیے پر اس حدیث کی متعدد توجیہات بیان کی گئی ہیں، جو یہ ہیں: (1) سند کے لحاظ سے یہ حدیث ضعیف ہے، اور حدیث ضعیف پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کے ایک راوی عثمان بن عمیر کو، جس کی کنیت ابوالیقظان ہے، امام دارقطنی کے حوالے سے ذھبی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام ہیثمی نے "المجمع" میں اسے روایت کر کے تبصرہ کیا ہے کہ اسے امام احمد، امام بزار اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ان سب کی اسناد میں عثمان بن عمیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ایک توجیہہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ "امی مع امکما"، "یعنی میری ماں تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے" اس سے مراد یہ کہ دونوں عالم برزخ میں ہیں، یہ کلمات آپ نے "توریہ" کے طور پر فرمائے تا کہ سائل کو کم از کم وقتی طور پر ذہنی اذیت سے نجات مل جائے۔ "توریہ" سے مراد ایسا ذو معنی کلمہ استعمال کرنا جو دو معانی کا حامل ہو، ایک معنی قریب جو متبادر الی الفہم ہو (یعنی فوراً سامع کے ذہن میں آجائے) اور دوسرا دور کا معنی ہو، قائل کی اصل مراد دور کا معنی ہو لیکن مخاطب قریب کا معنی مراد لے اور ایسا دین کی کسی حکمت کے تحت کرنا جائز ہے۔ یا اس کی ایک توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کے ابوین کی اس وقت تک بذریعہ وحی خبر نہیں دی گئی تھی، اور یہ مفہوم حدیث کے آخری کلمات سے مستفاد ہوتا ہے کہ "میں نے ان کی بابت اپنے رب سے دریافت نہیں کیا" یعنی اس وقت تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رب کے درمیان اس مسئلے میں مراجعت نہیں ہوئی، بعد میں ہوگئی اور آپ کو اپنے ابوین کریمین کا جنتی ہونا بذریعہ وحی بتادیا گیا۔

چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن انس بن مالك قال فخطب رسول الله ﷺ فقال: "انا محمد بن عبدالله بن عبدالمُطّلب بن هاشم بن عبدمناف بن قُصَي بن كِلاب بن مُرّة بن كَعب بن لُؤَي بن غالب بن فِهر بن مالك بن نَضر بن كِنانة بن خُزَيمة بن مُدرِكة بن الياس بن مُضَر بن نَزار"۔ وَمَا افترق النّاس فرقتين الا جعلني الله في خيرهما فاُخرِجتُ مِن بَين ابَوَين، فلم يُصِبني شَئي من عَهد الجاهلِيّة۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

وخَرَجتُ من نکاحٍ، ولم اُخرَج من سَفاحٍ، من لَّدُن آدمَ حَتّٰی اِنتَهیتُ الیٰ ابی واُمّی فانا خیرکم نَفسا، وخیرکم اباً۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطّلب بن ہاشم بن عبدمُناف ابن قُصَی بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب، بن لُؤی بن غالب بن فِہر بن مالک بن نَضر بن کنانہ بن خُزیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مُضر بن نزار ہوں۔ جب بھی لوگوں کے دو گروہ ہوئے، مجھے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے سب سے بہتر گروہ میں رکھا۔ پس میرا اپنے ماں باپ سے ظہور ہوا تو مجھے زمانہ جاہلیت کی بدکاریوں میں سے کسی چیز نے نہیں چھوا تھا اور میں نکاح کے ذریعہ پیدا ہوا اور میں بدکاری کے ذریعہ پیدا نہیں ہوا، حتیٰ کہ حضرت آدم سے لے کر میں اپنے ماں باپ تک پہنچا، پس میں بھی تم سے خیر اور بہتر ہوں اور میرے باپ بھی تم سب سے خیر اور افضل ہیں، (دلائل النبوت للبیہقی، جلد: 1، ص: 174,175، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

عن علی ابن ابی طالب اَنّ النبی ﷺ قال خَرَجتُ مِن نکاح ولم اُخرَج مِن سَفاح مِن لَّدُن آدمُ اِلیٰ اَن وَلَدَنِی اَبِی وَاُمّی، لَم یُصِبنِی مِن سَفاحِ الجَاھِلِیّۃِ شَئی۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں، میری ولادت ناجائز طریقے سے نہیں ہوئی، آدم علیہ السلام سے لیکر اس وقت تک جب کہ میرے والد اور والدہ نے مجھے جنا، مجھے زمانۂ جاہلیت کی کسی غلط چیز نے نہیں چھوا، (دلائل النبوت لابی نعیم، جلد: 1، ص: 11، بیروت)''۔

علامہ ابن جوزی متوفی 579ھ لکھتے ہیں:

عن ابن عباس قال قلتُ :یارسول اللّٰہ ﷺ اَیۡنَ کُنتَ وآدمُ فِی الجنّۃ؟ قال:کُنتُ فِی صُلۡبِہٖ واُھۡبِطَ الی الارض واَنَا فِی صُلۡبِہٖ، ورکبتُ السفینۃ وفی صلب ابی نوح وقُذِفتُ فِی النّار فی صُلب ابی ابراھیم لم یَلتقِ لی اَبوان قطُّ علی سفاحٍ لم یَزَل یَنۡقُلُنِی من الاَصلاب الطّاھِرَۃِ الی الاَرحامِ النَقِیّۃ مُھَذَّباً۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! تب آپ کہاں تھے؟، جب آدم علیہ السلام جنت میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں ان کی صُلب (پشت) میں تھا اور جس وقت انہیں زمین پر اتارا گیا اس وقت بھی میں ان کی صُلب میں تھا، اور مجھے اپنے باپ نوح کے صُلب میں کشتی میں سوار کیا گیا، اور مجھے اپنے باپ ابراہیم کی پشت میں آگ میں ڈالا گیا، اور میرے والدین کبھی بھی برائی پر نہیں ملے میں پاک اور طاہر پشتوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہوں، (الوفا باحوال المصطفیٰ، جلد:1، ص:28، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے آبوین کریمین یعنی حضرت عبداللہ و آمنہ رضی اللہ عنہما سے لے کر حضرت آدم و حوا علیہما السلام تک آپ کے تمام آباء واجداد اور اُمّہات وجدات کے بارے میں امت کا اجماعِ اکثری اور علماء حق کا موقف یہ ہے:

1۔ان میں سے بعض انبیاءِ کرام ورُسُلِ عظام علیہم الصلاۃ والسلام تھے۔

2۔دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور غیر تحریف شدہ شکل میں پایا، وہ اس عہد کے مومنین کاملین تھے۔

3۔دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور

غیر تحریف شدہ شکل میں نہیں پایا، بلکہ ایک نبی کے وصال فرمانے کے بعد جب طویل عرصہ گزر گیا، تو ان کی تعلیمات فراموش کردی گئیں یا ان میں تحریف کردی گئی اور مسخ کردیا گیا۔ اس دور کو زمانۂ فترۃ وحی اور زمانۂ انقطاعِ وحی (Gap Period of Revealation) کہا جاتا ہے، ایسے دور میں لوگ تفصیلی شرعی احکام کے مُکلّف نہیں ہوتے بلکہ دینِ فطرت اور توحید کے مکلّف (Accountable) ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی (Existence of God) اور اَحدیّتِ باری تعالیٰ (ONENESSO of God) کے پابند ہوتے ہیں۔ امت کا اجماعِ اکثری اور علماءِ حق کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وہ آباء واجداد، جو زمانۂ "فترۃ وحی" میں گزرے، ان میں سے کوئی بھی مشرک، کافر اور ملحد نہیں تھا، سب کے سب دینِ فطرت اور دینِ توحید پر قائم رہے۔ آپ ﷺ کے اجداد عالی نسب، حضرت کعب بن لُؤیّ، حضرت قُصَیّ، حضرت عبدالمُطّلب، وغیرھم کے جو خطبات اور ارشادات تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں، وہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔

4۔ رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی مشرک اس لئے بھی نہیں ہوسکتا کہ آپ کا فرمان ہے: لم ازل انقل من اصلاب الطاهرين الى الارحام الطاهرات والمشركون نَجَسٌ۔

ترجمہ: "میرا (نورِ نبوت اور جوہرِ وجود ہر دور میں میرے آباء واجداد کی) پاک پشتوں سے (میری اُمّہات وجدّات کے) پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا اور مشرک تو ہوتے ہی ناپاک ہیں"۔ اور سورۂ توبہ آیت نمبر: 28 میں اللہ تعالیٰ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ: "اِنَّمَا المشرکون نَجَسٌ"، کہ مشرک تو ناپاک ہی ہوتے ہیں"۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جو اپنے ان تمام آباء واجداد اور اُمّہات وجدّات کو طاہرین وطاہرات قرار

دیا ہے اس سے دونوں طرح کی طہارت مراد ہے، ایک سفاحت سے پاکیزگی کہ سب کا تعلق باقاعدہ نکاح سے قائم ہوا، غیر اخلاقی اور غیر شرعی طریقے سے نہیں، اور دوسرا شرک اور عقائدِ باطلہ سے پاکیزگی۔

5۔پس جن آیات واحادیث میں آپ ﷺ کے باپ کے مشرک ہونے یا جہنم کے عذاب میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے، ان مقامات پر آپ کے حقیقی والد مراد نہیں بلکہ مجازی باپ یعنی چچا مراد ہے، جیسے واذقال ابراھیم لابیہ ازر اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَة۔ ترجمہ: ''اور (اے رسول! اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ کے (جدِ اعلیٰ) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے (مجازی) باپ آزر سے کہا کہ آپ (اپنے خود ساختہ) بتوں کو خدا مان رہے ہیں، (الانعام:75)''۔سوال میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، برسبیل تسلیم اس کی بھی یہی تاویل کی جائے گی۔اور عربی زبان میں چچا پر باپ (اَب) کا اطلاق کیا جاتا ہے، ہمارے ہاں اردو میں بھی ''تایا ابو'' وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ اورحدیث مبارک میں بھی ہے: فَاِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِیہ۔ ترجمہ: ''بیشک ایک شخص کا چچا اس کے باپ ہی کے مرتبے میں ہوتا ہے، (ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب مناقب اہل البیت)''۔

المنجد میں صِنْوٌ اور صَنْوٌ کے معنی ہیں: سگا بھائی، چچا یا ایک اصل سے پھوٹنے والی دو شاخیں۔ماضی قریب کے ایک عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی تصنیف قصص القرآن میں آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ قرار دیتے ہوئے استدلال کیا ہے کہ جب حقیقی معنی مراد لیا جا سکتا ہو تو مجازی معنی کی طرف عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے اور کونسا قرینہ ہے؟۔ہم کہتے ہیں کہ جب ہم نے عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں ایک اصول طے کر لیا ہے کہ حضور کے آباءِ کرام میں کوئی بھی کافر و مشرک نہیں گزرا تو یہی مجاز

کی طرف عدول کا قرینہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام والدین کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں، تو عرض کرتے ہیں: رَبَّنَا اغْفِرْلِي وَلِوَالِدَيَّ۔ ترجمہ: "اے ہمارے پروردگار! تو مجھے اور میرے والدین کو بخش دے"، (ابراہیم: 41)"۔ "اَب" کا اطلاق مجازاً چچا پر ہوسکتا ہے، لیکن "والد" کا اطلاق صرف حقیقی باپ پر ہی ہوسکتا ہے، جس کے نسب سے وہ پیدا ہوا ہے، چنانچہ علامہ قاضی ثناء اللہ مظہری لکھتے ہیں: فھذہ الاٰیۃ تَدُلُّ عَلیٰ اَنَّ وَالِدَیْہ علیہ السلامُ کانا مسلمَینِ وانّما کَانَ آزَرُ عَمًّا لہٗ و کان اسمُ اَبِ ابراھیم تَارِخ ولاَجْلِ دَفْعِ تَوَھُّمِ آزرَ قال والِدَیَّ یعنی مَنْ وَلَدَانی حقیقۃً ولم یَقُل اَبَوَیَّ لِاَنَّ الاَبَ یُطْلَق علی العَمِّ مَجازا۔

ترجمہ: "یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کے والدین مسلمان تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور آپ کے والد کا نام تارخ تھا۔ اور اس وہم کو دور کرنے کے لئے کہ باپ سے مراد چچا ہے آپ نے دعا میں "وَالِدَیَّ" کا لفظ استعمال کیا، یعنی جنہوں نے مجھے حقیقت میں جنا ہے اور "اَبَوَیَّ" کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ اب کا لفظ بطور مجاز چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا رہتا ہے، (تفسیر مظہری)"۔ واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام چچا مومن نہیں تھے، ایک چچا عبدالعزیٰ ابولہب تو رئیس المشرکین تھا، بلکہ یہ واحد مشرک تھا جس کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک مکمل سورت "اَللَّھَب" نازل ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے "آبوین کریمین" کو اللہ تعالیٰ کے دیئے اختیار سے زندہ کیا، ان پر ایمان (توحید و رسالت) کی دعوت پیش کی، انہوں نے اسلام قبول فرمالیا اور پھر ان کا ایمان پر وصال ہوا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: لیکن متاخرین میں علماء نے حضور ﷺ کے والدین کریمین، بلکہ

حضرت آدم علیہ السلام تک آپ کے تمام آباء واُمّہات کا ایمان ثابت کیا ہے، اس اثبات کے لئے انہوں نے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ان حضرات کو دعوتِ اسلام نہ پہنچی، بلکہ یہ حضرات زمانہ فترۃ میں ہی انتقال کر چکے تھے، ان کو حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ نہ ملا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے والدین کریمین کو خدا تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا سے آپ کے دستِ اقدس پر دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ آپ پر ایمان لائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کے زندہ کرنے کی حدیث اگر چہ اپنی حد ذات میں ضعیف ہے، لیکن متعدد طریق سے اس کی تصحیح اور تحسین کر دی گئی ہے اور یہ بات گویا متقدمین سے پوشیدہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت متاخرین علماء پر کھول دی۔ "واللہ یختص برحمتہ من یشاء" اس بارے میں رسائل تصنیف کئے اور دلائل سے اس مسئلے کا اثبات فرمایا، مخالفین کے شبہات کے جوابات دیئے۔ ان دلائل اور جوابات کو اگر یہاں نقل کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ان کے رسائل میں دیکھ لیا جائے، واللہ اعلم، (اشعۃ اللمعات، جلد:1، ص:718، مطبوعہ مطبع: تیج کمار، لکھنؤ)"۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے "تبیان القرآن" جلد سوم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے، اہلِ ذوق اس کا مطالعہ فرمائیں۔

اہانتِ معاویہ

سوال: 4

میں اسلامیات کی کتاب کا ایک صفحہ منسلک کر رہا ہوں جو saint

josiph اسکول کے O-Level میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اس میں حضرت امیر معاویہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں کئی گستاخیاں کی گئی ہیں۔آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں فتویٰ جاری کریں تاکہ مصنف، اسکول اور پبلشر کے خلاف مقدمہ قائم کیا جا سکے۔

نوٹ: انگلش عبارت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

21 رمضان کو حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؓ کو چالیس ہزار افراد کی رضامندی سے خلیفہ بنایا گیا۔لیکن حضرت امیر معاویہؓ حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے انہوں نے جاسوس کوفہ بھیجے تاکہ وہاں کے حالات کا پتہ چل سکے۔حضرت امام حسنؓ کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو خط لکھا اور اپنی خلافت کا حق بتایا۔مگر حضرت امیر معاویہؓ نے مزید جاسوس بھیجے اور اس شخص کیلئے جو حضرت امام حسنؓ کو قتل کرے دو ہزار درہم اور اپنی بیٹی نکاح میں دینے کا انعام مقرر کیا۔

آخر میں ایک صلح نامہ ہوا جس کے بعد حضرت امام حسنؓ مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ خون خرابے سے بچنے کیلئے وہ خلافت چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ کو اس بات سے تسلی نہ ہوئی اور وہ امام حسنؓ کو مارنا چاہتے تھے انہوں نے امام حسنؓ کی زوجہ سے کہا کہ اگر وہ حضرت امام حسنؓ کو زہر دے تو وہ اسکو دو ہزار درہم، دس جوڑے کپڑے سونے کی کشیدہ کاری کیے ہوئے اور کوفہ کی زیتون کے تیل کی تمام پیداوار انعام میں دیں گے اور اس کا نکاح اپنے بیٹے سے کریں گے، (محمد سلیم خمیسہ، شہید ملّت روڈ، کراچی)۔

جواب:

استفتاء میں جس نصابی عبارت کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ عنہ کی اہانت پر مشتمل ہے اور ان کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، کاتب وحی ہیں ایسی عبارات کو نصابی کتب میں شامل کرنا قوم کی بچوں کے عقائد کو مسخ کرنے اور انہیں گمراہ کرنے کی سازش ہے، اس کے ذمہ داروں کو قومی اور دینی مجرم قرار دے کر ان کے خلاف مقدمات قائم کرنا چاہئیں۔

وفاقی وصوبائی وزارت تعلیم کیلئے ضروری ہے کہ ایسی نصابی کتاب کو فوراً منسوخ کرے، بازار میں موجود اسکے تمام نسخے ضبط کیے جائیں اور مصنف، تابع اور ناشر کے خلاف کاروائی کی جائے۔ صحابہ کرام ہماری تمام وراثت دینی کے امین ہیں، قرآن وسنت کی حقانیت وحجیت کا مدار صحابہ کرام کی صداقت، عدالت اور امانت کو تسلیم کیئے جانے پر ہے، ورنہ ہمارے پاس تمام دینی سرمایہ جس میں کتاب وسنت، عقائد وایمانیات، ارکان اسلام اور جملہ ضروریات وتفصیلات دین شامل ہیں، غیر مستند، غیر معتبر اور نا قابل اعتبار قرار پائے گا۔ صحابہؓ کرام کو سبّ وشتم کرنا، ان کا استخفاف وتوہین کرنا حرام ہے، جمہور فقہائے امت کے نزدیک موجب کفر ہے اور ایسے شخص کی ضلالت، فسق وفجور اور مبتدع ہونے پر سب کا اتفاق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت

سوال:5

(ا): اگر غیر مسلم کلمہ پڑھ کر پھر بھی غیر مسلم کے طور طریقوں کو نہ چھوڑے، اور دین کو نہ سیکھے۔ فرائض وواجبات کی ادائیگی کا پاس نہ رکھے۔ غرض اپنا چال چلن اور طور طریقے نہ بدلے تو شرع میں کیا حکم ہے؟

سوال:6

کوئی غیر مسلم یوں کہتا ہے کہ میں کلمہ تو پڑھ لوں یا جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں (یعنی کلمہ پڑھادیں یا نہ پڑھائیں)، یعنی غیر مسلم تذبذب کے ملے جلے جذبات رکھتا ہے؟ دلائل وبراہین قرآن وسنت کی روشنی میں اس عقدہ کو حل فرمادیں، (حافظ غلام فرید، کراچی)۔

جواب:

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی سچائی سے ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے، اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نومسلم کو احکامِ شرع کی تعلیم دیں فرائض وواجبات کی ادائیگی کی تعلیم وتلقین کریں پھر بھی اگر وہ اپنی غیر مسلمانہ روش ترک نہ کرے تو محض اس کا دعویٔ مسلمانی قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اعمال صالحہ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کا تارک اور محرمات کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جائیگا۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا شخص اور شراب پینے والا اور دوسری برائیوں کا مرتکب شخص گنہگار کہلائے گا۔ بدعمل مسلمان کو یا اپنی بدعملی کی وجہ سے خود کو کافر کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہیے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے، وہ کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

من کفر باللّٰہ من م بعد ایمانہ الّا من اُکرِہَ وقلبہ مطمئنّ م بالایمان ولکن مّن شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب مّن اللّٰہ ج ولھم عذاب عظیم O

ترجمہ: ''جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا، اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، (النحل: 106)''۔

لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم۔

ترجمہ: ''اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو، (التوبہ: 66)''۔وفی المحیط من قال فانا کافرا وفا کفر قال ابوا لقاسم ھو کافر من ساعتہ۔

ترجمہ: ''اور محیط میں ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں کفر کروں گا، ابوالقاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا، (شرح فقہ اکبر ص ۱۸۳)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن یرضیٰ یکفر نفسہ فقد کفر

ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: دوم، ص: ۲۵۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویکفر فیھما) لرضاہ بالکفر۔

ترجمہ: '' کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد 5 ص: 393 دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرارِ کفر، بھی کفر ہے، تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی سچائی سے تمام ضروریاتِ

دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔ اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے اور بے یقینی کی سی کیفیت کے ساتھ یا کسی کی خوشی کی خاطر کلمہ پڑھ لینا ایمان نہیں، واللہ اعلم۔

غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا

سوال: 7

ایک مسلمان شخص اپنے کسی عیسائی دوست کی ترغیب پر ان کے معبد (گرجا) میں جاتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر انہی جیسی عبادت کرتا ہے اور اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم تھا محض ان کی دلجوئی کے لئے اُس نے ایسا کیا۔ آپ براہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا اسلامی نقطہ نظر سے اس طرح کرنا جائز ہے؟ اور اس کا یہ عمل اس کے ایمان پر اثر انداز ہوگا کہ نہیں؟۔ (حافظ غلام مرتضٰی سیالوی، ضلع اٹک)۔

جواب:

یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، اس لئے ہم صورتِ مسئلہ سے ہٹ کر اسلام کا اصولی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دینی امور میں غیر مسلموں، مبتدعین اور بے دین لوگوں سے تعلق کی دو صورتیں ہیں، ایک مداہنت ہے اور دوسری مدارات۔ مداہنت شرعاً ممنوع اور حرام ہے اور مدارات جائز بلکہ اس سے اگر دینی فائدہ ہوسکتا ہے تو شرعاً مطلوب ہے۔ پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے

ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

(1)وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ O ترجمہ:''انہوں نے یہ چاہا کہ اگر آپ (دین کے معاملے میں) ان سے (بے جا) نرمی کریں تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے،(القلم:9)''۔

(2)وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔

ترجمہ:''اور تم ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو، جنہوں نے ظلم کیا ہے، ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی،(ھود:113)''

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ۔

ترجمہ:''اے ایمان والو! میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ اس حق کا کفر کرتے ہیں، جو ان کے پاس آچکا ہے،(الممتحنہ:1)''۔

مداہنت کی تعریف:

مداہنت یہ ہے کہ کوئی مومن خلافِ شرع کوئی برائی دیکھے اور قدرت کے باوجود اس سے منع نہ کرے، روک ٹوک نہ کرے، اس رویے کے محرکات کئی ہو سکتے ہیں، مثلاً (الف) دینی بے غیرتی اور بے حمیتی (ب) اس بات سے شرمائے کہ دوسرے اسے دقیانوسی اور قدامت پسند کہیں گے (ج) دنیوی مفاد اور طمع کے سبب کسی بااثر یا بااختیار شخص کی خلافِ شرع حمایت کی بنا پر ایسا کرے۔

مدارات کی تعریف:

مدارات یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے، بے جا سختی نہ برتے، کسی دینی حکمت یا مصلحت کے تحت نرمی سے پیش آئے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ظالم وجابر کے ناروا ظلم سے بچنے کے لئے اس سے الجھنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرے۔ ظاہر ہے یہ رخصت ان لوگوں کے لئے ہے جو اہلِ عزیمت واستقامت نہیں ہوتے، طبعاً کم ہمت ہوتے ہیں، اگر چہ دل سے برائی اور برے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرقات ج:9،ص:331 پر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اَشِعَّۃُ اللّمعات ج:4،ص:174 پر اپنے اپنے انداز میں یہ تعریفات بیان کی ہیں، ہم نے ان سے استفادہ کر کے آسان الفاظ میں بیان کردیا ہے۔

ایک چیز کافروں سے موالات یعنی دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کرنا ہے، اس کی بھی قرآن مین ممانعت آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ۔

ترجمہ: ”مومن (اپنے) مومن (اہلِ دین) کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، (آل عمران:28)“۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ ۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تم ایمان والوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ، (آل عمران:118)“۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بعضهم اولياء بعض ط ومن يتولهم منكم فانه منهم۔

ترجمہ"اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ (مسلمانوں کے خلاف) ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اور تم میں سے جو کوئی (مسلمانوں کو چھوڑ کر) انہیں دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہوگا، (المائدہ: 51)"۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ۔

ترجمہ:"اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ جلائے گی، (ھود: 113)"۔

غیر مسلموں کے ساتھ روزمرّہ کے معاملات

ایک صورت کفار کے ساتھ روزمرّہ معاملات کی ہے، جس میں ان کے ساتھ لین دین، تجارتی معاہدات، معاملات کرنا، اگر ایک دفتر یا ادارے میں کام کر رہے ہیں یا محلے میں رہ رہے ہیں، تو کسی، چاپلوسی اور خوشامد کے بغیر محض انسانی بنیادوں پر حسن اخلاق سے پیش آنا، وہ کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہوں تو ان کی مدد کرنا، بشرطیکہ وہ کوئی حرام یا شرعاً ممنوع کام نہیں ہے۔ اتفاقاً کوئی صورت پیش آگئی تو ایک ٹیبل یا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھالینا، بشرطیکہ اس دسترخوان پر کوئی حرام چیز نہ ہو، بعض اوقات بین المذاہب مکالمہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے مجلس کا انعقاد ناگزیر ہے۔ یہ رویہّ اسلام کے مفاد میں نہیں ہے کہ غیر مسلم یہ سمجھیں کہ مسلمان ان سے بلاوجہ نفرت کرتے ہیں یا یہ لوگ مردم آزار اور انسانیت دشمن ہیں۔ اسی طرح اگر غیر مسلموں سے شرعی حدود کے اندر معاہدات، معاملات یا کاروبار کیا ہے تو مسلمان کو امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہونا چاہئے، ان کی کسی بھی خیانت، کِذب، بدعہدی، ملاوٹ اور بد معاملگی کی وجہ سے لوگ اسلام پر طعن کریں گے۔ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''اور مُعاملتِ مجرّدہ سوائے مرتدین کے ہر کافر سے جائز ہے جبکہ اس میں کوئی اعانت کفر یا معصیت نہ ہو نہ ہی اِضرارِ اسلام و شریعت (یعنی جس میں شریعت یا اسلام کا نقصان ہو)، ورنہ ایسی معاملت مسلم سے بھی حرام ہے چہ جائیکہ کافر سے، قال تعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ ترجمہ: ''گناہ وظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ: 2)''، (تبیان القرآن، جلد: 11، ص: 844)''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''موالات و مجرد معاملت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، دنیوی معاملت جس سے دین پر ضرر نہ ہو سوا مرتدین کے کسی سے ممنوع نہیں، ذمّی (اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری) تو معاملت میں مثل مسلم ہے: لھم مالنا و علیھم ماعلینا۔ ان کے لئے وہی (حقوق) ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور جو (فرائض) ان پر ہیں وہی ہم پر ہیں، (یعنی دنیاوی منافع میں ہماری طرح ان کو بھی حصہ دیا جائے گا اور دنیوی مواخذہ ان پر بھی وہی ہوگا جو ایک مسلمان پر کیا جائے گا)۔ اور غیر ذمی سے بھی خرید و فروخت، اجارہ و استیجار، ہبہ و استیہاب (یعنی ہبہ کا لین دین) بشروطہا (اپنی شرعی شرائط کے مطابق) جائز اور خریدنا مطلقاً ہر مال کا، کہ مسلمان کے حق میں متقوّم ہو اور بیچنا ہر جائز چیز کا جس میں اعانتِ حرب (یعنی مسلمانوں کے خلاف جنگی مدد کرنا) اور اہانتِ اسلام نہ ہو، اسے نوکر رکھنا جس میں کوئی کام خلافِ شرع نہ ہو، اس کی جائز نوکری کرنا جس میں مسلم پر اس کا استعلا (یعنی اسے دینی امور میں بالادستی دے دی جائے) نہ ہو، ایسے ہی امور میں اجرت پر اس سے کام لینا یا اس کا کام کرنا بمصلحت شرعی اسے ہدیہ دینا جس میں کسی رسم کفر کا اعزاز نہ ہو، اس کا ہدیہ قبول کرنا جس سے دین پر اعتراض نہ ہو، حتیٰ کہ کتابیہ سے نکاح کرنا بھی فی نفسہ حلال ہے، وہ

صلح کی طرف جھکیں تو مصالحت کرنا مگر وہ صلح (منع ہے) جو حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال، یونہی ایک حد تک معاہدہ اور موادعت کرنا بھی اور جو جائز عہد کرلیا اس کی وفا فرض ہے اور غدر (دھوکہ دینا) حرام الی غیر ذالک من الاحکام۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:14، ص:420، 421 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

مسلمانوں کا غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں جا کر ان کے طریقے پر عبادت کرنا حرام ہے اور اگر وہ طریقہ اپنی وضع کے اعتبار سے کفر ہے جیسے بتوں کے سامنے سجدہ کرنا یا آگ کی پرستش کرنا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے کے آگے سجدہ کرنا تو یہ کفر ہے۔ اور اس میں یہ عذر مقبول نہیں ہوگا کہ دل میں ایمان ہے اور محض غیر مسلم کی دل داری کے لئے ایسا کیا ہے، شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر حال پر ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے ہندوؤں کے ساتھ مندر میں عبادت کئے جانے کی بابت سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا:

الاشباہ والنظائر میں ہے: عبادۃ الصنم کفر ولا اعتبار بما فی قلبه و کذا لو تزنر بزنار الیهود والنصاریٰ دخل کنیستهم اولم یدخل۔

ترجمہ: "بت کی پوجا کرنا کفر ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اسی طرح اگر کسی نے یہودیوں اور عیسائیوں کا زنار گلے میں باندھا (اس نے بھی کفر کیا)، خواہ وہ ان کے گرجوں (چرچ) میں داخل ہو یا نہ ہو، (۲) سائل یہ پوچھتا ہے کہ وہ حرکاتِ ملعونہ جائز ہیں یا نہیں، یہ پوچھے کہ کفر ہے یا نہیں، ان کی عورتیں نکاح سے نکلیں یا نہیں ان حرکات سے، جامع الفصولین منح الروض الازہر میں ہے: من

خرج الی السدۃ (قال القاری ای مجمع اهل الکفر) کفر لان فیه اعلان

الکفر و کانه اعان علیه.

ترجمہ: ''جو کوئی (دارالاسلام کو چھوڑ کر) کفار و مشرکین کے مجمع میں جائے (التتـــــمـــــة، محدث وفقیہ ملا علی قاری نے فرمایا: اس کا معنی مجمع اہل کفر ہے) تو وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اس میں کفر کا اعلان ہے، گویا وہ کفر پر ان کی امداد کر رہا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں: کفر کے اہتمام میں شریک ہونا اور اس پر راضی ہونا کفر ہے، الرضا بالکفر کفر (کفر پر راضی ہونا کفر ہے) وہ لوگ اسلام سے نکل گئے اور انکی عورتیں ان کے نکاح سے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص: 296، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: فی "التاتر خانیة": یکرہ للمسلم الدخول فی الْبِیْعَةِ وَالْکَنِیْسَةِ وَاِنَّمَا یکرہ من حیث انه مَجْمَعُ الشیاطین لا من حیث انه لیس له حق الدخول قال فی "البحر" و الظاهر انها تحریمیة لانها المرادة عندا طلاقهم، وقد افتیت بتعزیر مسلم لازم الکنیسةمع الیهود۔ فاذا حرمت دخول فالصلوٰۃ اولیٰ۔

ترجمہ ''تاتارخانیہ میں ہے: یہودیوں کی عبادت گاہ اور عیسائیوں کے گرجے (چرچ) میں کسی مسلمان کا داخل ہونا مکروہ ہے اس لئے کہ وہ شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہے اس لئے نہیں کہ وہاں داخل ہونے کا حق نہیں ہے ''بحرالرائق'' میں فرمایا ظاہر یہ ہے کہ کراہت سے مراد کراہتِ تحریمی ہے کیونکہ جب مطلقاً مکروہ بولا جائے، تو اس سے ''کراہتِ تحریمی'' مراد ہوتی ہے، (فقہاء کرام نے) ایسے مسلمان کو سزا دینے کا فتویٰ دیا ہے جو یہودیوں کے ساتھ ان کے معبد (گرجا) میں مستقل آتا جاتا رہتا ہو، پس جب وہاں داخل ہونا حرام قرار پایا، تو نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ حرام ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص: 40، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔ البتہ یہود و نصاریٰ

کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مکالمے کے لئے مسلمانوں کے رہنما ان کی عبادت گاہوں میں جائیں، مشترکہ عبادت مقصود نہ ہو بلکہ ان کے طریقِ عبادت کا مشاہدہ مقصود ہو، تو یہ مباح ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بعض اوقات مسلمانوں رہنماؤں کو غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کے ساتھ امن اور عدل کے مشترکہ مقاصد کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے، اس کی رخصت ہے۔ اسی طرح اگر اہلِ مذاہبِ سماوی دنیا میں ریاستی و گروہی ظلم اور جبر و تشدد کے خلاف بلا امتیاز مذہب انسانیت کے مفاد میں مشترکہ آواز بلند کریں، تو اس کی رخصت ہے۔

آثارِ قیامت میں "تقارُبِ زمانی" کا مفہوم

سوال:8

رسول اللہ ﷺ نے جو مختلف آثارِ قیامت بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "زمانے میں قربت ہو جائے گی" اس سے کیا مراد ہے؟ (محمد انس محبوب، ایبٹ آباد)

جواب:

یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علاماتِ قیامت متعدد بیان فرمائی ہیں، جنہیں اصطلاح محدثین میں "**اشراط الساعة**" کے عنوان کے تحت کتب احادیث میں جمع فرمایا ہے، انہی روایات میں ہے: عن انس بن مالك قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تقوم الساعة حتیٰ يتقارب الزمان فتكون السنة كالشهر والشهر كالجمعه وتكون الجمعة كاليوم ويكون اليوم كالساعة وتكون الساعة كالضرمة۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیا

مت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ باہم قریب ہو جائے گا، پھر سال مہینے کی طرح ہو جائے گا اور مہینہ ہفتے کی طرح، اور ہفتہ دن کی مانند اور دن ایک گھڑی کی مانند اور ایک گھڑی چنگاری کی مانند ہو جائے گی، (سنن الترمذی، رقم الحدیث:2332 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

''**تقارب زمانی**'' کے حقیقی اور قطعی معنی کیا ہیں؟، یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ ہی کو معلوم ہے، لیکن ہماری فہمِ ناقص میں جو معنی و مفہوم بظاہر مراد ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(1) یہ کہ زمانے سے برکت اٹھ جائے گی، اور مقاصدِ خیر کے لئے اس کی افادیت کم ہو جائے گی۔

(2) لوگ اپنے مشاغلِ دنیا اور لہو ولعب میں اس قدر مشغول ہو جائیں گے کہ اعمالِ خیر اور فکرِ آخرت کے لئے ان کے پاس فرصت ہی نہیں ہوگی، ترغیباتِ دنیا میں مشغولیت، فراوانی تعیّشات، فواحش ومنکرات کا عام ہونا اور خواہشاتِ نفس کے پیروکاروں کے لئے ان کا حصول آسان ہونا اور ان میں ہمہ وقتی انہماک، کثرتِ مال کی خواہش اور حصول، ان لذات میں انسان اتنا کھو جائے گا کہ اسے سال مہینوں میں، مہینے ہفتوں اور ہفتے دنوں میں اور دن لمحوں میں اور لمحے آگ کے شراروں تک گزرتے ہوئے محسوس ہوں گے، لیکن لذّتِ کام ودہن، ہوائے نفس اور جنسی شہوات کی پیاس بجھ نہیں پائے گی۔

(3) جس طرح رنج والم، درد وکرب اور آفت وبلا کے زمانے میں ایک ایک پَل کا گزرنا دشوار ہو جاتا ہے، لگتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے، ایک ایک گھڑی قیامت بن کر گزر رہی ہے، حالانکہ کمّیت کے اعتبار سے شب وروز اور ماہ وسال کے پیمانے وہی

ہوتے ہیں، گردشِ لیل ونہار کا دورانیہ وہی رہتا ہے، لیکن مصیبت کا ایک ایک پل بھاری ہو جاتا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے وقت یا مکان کی مقدار اور ظرفیت تو وہی رہتی ہے، لیکن برکت سے کیفیتِ اجرا ور مقدار اجر میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ذیل میں احادیث ملاحظہ کیجئے:

(1)عن ابی هریرة رضی اللّٰہ عنه قال :قال رسول اللّٰہ ﷺ فی الجماعة تضعف علیٰ صلوته فی بیته وفی سوقه خمسا وعشرین ضعفا۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کے گھر پر یا بازار میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں با جماعت نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا زیادہ ہے، (صحیح بخاری و مسلم)''۔

(2)عن عبد اللّٰہ بن عمر قال : قال رسول اللّٰہ ﷺ : صلوٰة الجماعة تفضل صلوة الفذّ بسبع وعشرین درجة۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باجماعت نماز کا ثواب انفرادی نماز سے ستائیس درجے زیادہ ہے، (صحیح بخاری و مسلم)''۔

(3)عن انس بن مالك قال : قال رسول اللّٰہ ﷺ : صلوة الرجل فی بیته بصلوة وصلوته فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوٰة وصلوته فی مسجد الذی یجمع فیه بخمس مائة صلوٰة وصلوته فی المسجد الاقصیٰ بخمسین الف صلوة وصلوٰته فی مسجدی بخمسین الف صلوة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوٰة۔

ترجمہ: ''انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی

شخص کے گھر پر (فرض) نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کے برابر ہے، اور اس کا اپنے (محلے یا) قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب 25 نمازوں کے برابر ہے، اور اس جامع مسجد میں پڑھنے کا ثواب 500 نمازوں کے برابر ہے، اور اس کا مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور اس کا مسجد الحرام میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، (ابن ماجہ)''۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عبادت ایک ہی ہے لیکن مقامات کے اعتبار سے اجر وثواب کے پیمانے بڑے ہو جاتے ہیں، اسے ہم برکت سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے: شب قدر کی فضیلت ایک ہزار مہینوں کے برابر ہے (سورۃ القدر:3)۔

تقارب زمانی کا ایک معنی یہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی کو کشادہ کر کے فرمایا: بعثت انا والساعة کهاتين و جمع بين اصبعيه۔

ترجمہ: ''میرے اور قیامت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جیسے میری ان دو انگلیوں کے درمیان''، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث 4040 دار الفکر، بیروت)''۔

قرآن نے بھی فرمایا: اقتربت الساعة وانشق القمر۔ ترجمہ: ''قیامت قریب آ گئی اور چاند شق ہو کر (دو ٹکڑے) ہو گیا، (سورۃ القمر:1)''۔ دراصل انگشت ہائے مبارک کا درمیانی فاصلہ اگرچہ کم ہے، لیکن آپ نے پورے کرۂ زمین کا نقشہ بنا ہوا دیکھا ہو گا جو چند فٹ کے کاغذ پر سما جاتا ہے، مگر اس میں نیچے سکیل لکھا ہوتا ہے، کہ اس نقشے میں ایک انچ کی لکیر کئی ہزار میٹر کو تعبیر کر رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہی کیفیت حضور ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیانی فاصلے کی ہو۔ (4) چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب سے معلوم تھا کہ ابتدائے تخلیق کائنات سے آپ کے عہد مبارک تک کتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے کروڑ سال گزر چکے ہیں، ماہرین

ارضیات اپنے علم طبیعات وارضیات کے مطابق بعض چیزوں کی عمر کروڑوں سال بتاتے رہتے ہیں تو علم نبوت میں ان کروڑوں سال کے مقابلے میں قیامِ قیامت تک اتنی ہی مدت باقی ہو جسے آپ نے تقابل کرتے ہوئے دو انگلیوں کے درمیانی فاصلے سے تعبیر کیا، اور جوں جوں قیامت قریب ہوتی چلی جائے گی، کائنات کی عمر اپنی کل مدت تخلیق کے اعتبار سے اسی طرح سمٹی ہوئی نظر آئے گی۔

زمانے کو برا کہنے کی ممانعت

سوال :9

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ غلطی کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں، انہیں اس پر ٹوکا جائے تو یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ کیا کریں زمانہ ہی برا ہے، پہلے کہتے تھے "چودھویں صدی ہے" اب کہتے ہیں: "پندرھویں صدی ہے" یہ سب کچھ تو ہونا ہے، کیا یہ رویہ یا طرز عمل درست ہے؟ شریعت مطہرہ اور کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیجئے، (نعیم الرحمٰن، کوہاٹ)۔

جواب :

یہ سوچ، یہ انداز فکر بالکل غلط اور باطل ہے، یہ وہی فریب نفس ہے اور اغواء نفس ہے جس سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں تعلیم امت کے لئے ارشاد فرمایا کرتے تھے: "نعوذ باللہ من شرور انفسنا" یعنی اے اللہ! ہم اپنے نفس کی شرارتوں اور فکری کجروی سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔ "زمانہ" کیا ہے، گردش لیل ونہار کا نام ہے، مرور ایام کا نام ہے، دنوں، ہفتوں اور ماہ وسال کے گزرنے کا نام ہے، سورج وہی ہے، چاند وہی ہے، زمین وہی ہے، نظام قدرت بھی وہی ہے، لہذا زمانے کا کیا قصور؟ قصور ہر شخص کا اپنا ہے، کوتاہی عمل ہر ایک کی اپنی ہے

،اور ہر ایک اپنے عمل کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کل نفس بما کسبت رھین۔

ترجمہ: "ہر شخص اپنے اعمال کے عوض رہن ہے"، (الطّور: 21)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: "کل نفس بما کسبت رھینا "، ترجمہ "ہر شخص اپنے عمل کے بدلے رہن ہے"، (المدثر: 38)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولا"، ترجمہ: "بلاشبہ (قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی) سماعت بصارت اور فہم وادراک (کی ساری صلاحیتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی"، (بنی اسرائیل: 36)۔ لہٰذا کسی شخص کا اپنی کوتاہی فکر وعمل کے لئے زمانے کو برا کہنا یا اسے جواز بنانا ہرگز درست نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال النبی ﷺ: " قال اللہ: یؤذینی ابن آدم، یسبّ الدھر وانا الدھر، بیدی الامر، اقلب اللیل والنھار۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بنی آدم مجھے اذیت دیتا ہے، (وہ اس طرح کہ) وہ دہر (زمانے) کو گالی دیتا ہے، حالانکہ "دہر" تو میں ہوں، زمانے پر قبضہ واختیار میرا ہی ہے، گردش لیل ونہار میں کرتا ہوں، (صحیح بخاری ومسلم رقم الحدیث 7491-6181)"۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: انا الدّھر (یعنی میں زمانہ ہوں) اور یہ اطلاق مجازی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ میں زمانے اور زمانے کے اندر رپید اہونے والے حوادث وواقعات کا خالق ہوں، اس کا سبب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں

لوگوں کی عادت تھی کہ جب کوئی اندوہناک حادثہ ہوتا تو زمانے کو برا کہتے تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانے کو برا مت کہو، کیونکہ جن مصائب وحوادث کی بنا پر تم زمانے کو برا کہہ رہے ہو، وہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق ہے، (شرح صحیح مسلم للنووی ج2ص 237 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی)۔اس حدیث کی شرح میں علامہ امام حافظ بن احمد بن علی بن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ایک روایت میں یہ بھی ہے: ولاتقولوا خیبة الدهر، یعنی یوں نہ کہو کہ ہائے زمانے کی محرومی، ناکامی، آگے چل کر وہ فرماتے ہیں: زمانے کو برا کہنے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا رد ہے جو زمانے کو حوادث وآفات کا فاعل حقیقی یا مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یہ نظریہ باطل ہے، کیونکہ فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، جب مصائب نازل کرنے والے کو برا کہو گے، تو یہ "برا کہنا" اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا، لہٰذا اس حدیث کے ظاہری کلمات کی تین تاویلیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی زمانے میں ہونے والے جملہ امور کی تدبیر فرمانے والا ہے، دوسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی زمانے کا مالک ومختار ہے، تیسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی گردش لیل ونہار فرمانے والا ہے، اسی لئے ان کلمات کے بعد فرمایا: "بیدی اللیل والنھار"، شب وروز کا نظام میرے دست قدرت میں ہے، (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، ج 10 ص 564-565)"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يقلب الله الليل والنهار ان فی ذالك لعبرة لاولی الابصار۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ گردش لیل ونہار کا (نظام) فرماتا ہے، بلاشبہ اس میں اہل عقل وخرد کے لئے (بڑی) نصیحت ہے، (النور:44)"۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الطہارۃ﴾

غسل کے بعد وضو

سوال: 10

پاک ہونے کے لئے غسل کا طریقہ کیا ہے؟ کیا غسل کرنے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟، (عبدالجبار پردیسی، لانڈھی)۔

جواب:

آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غسلِ واجب کا طریقہ دریافت کررہے ہیں، ناپاکی یا جنابت کی حالت میں غسل کا طریقہ یہ ہے: پہلے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئیں، بدن پر جہاں کہیں نجاست لگی ہو، اس کو دور کریں، پھر وضو کریں، پھر تین مرتبہ داہنے کندھے پر اور تین مرتبہ بائیں کندھے پر پانی بہائیں، پھر سر پر اور تمام بدن پر تین مرتبہ پانی بہائیں۔ اور اگر ایک ساتھ سارے بدن پر تین مرتبہ پانی بہادیا، جیسے آج کل شاور کے نیچے غسل کرتے ہیں، تو بھی درست ہے اور کسی نہر یا بڑے تالاب میں بھی غسل کرسکتے ہیں۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کانت رسول اللہ ﷺ اذا اغتسل من الجنابۃ دعا بشئی نحو الحلاب فاخذ بکفہ بدأ بشق رأسہ الایمن، ثم الایسر، ثم اخذ بکفیہ فقال بہما علیٰ رأسہ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کا ارادہ کرتے تو (دودھ دان کی قسم کا) ایک برتن منگواتے، پھر اس سے پانی لے کر پہلے سر کی دائیں جانب دھوتے، پھر بائیں جانب، پھر دونوں ہاتھوں سے پانی لے کر سر پر بہاتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 710)''۔ غسلِ جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسلِ طہارت اور غسلِ مسنون میں فرض نہیں

،سنت ہے۔غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں رہتی ،اگر غسل میں پورے بدن پر پانی ڈالنے سے پہلے صحیح طریقے سے کلی کرلی ہے اور ناک میں پانی ڈال لیا ہے،تو اب غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے، غسل کے لئے نیت کرنا سنت ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل

سوال: 11

کئی ایک گھرانوں میں جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے،تو پیدائش کے وقت بچے کو غسل دینے کے بعد چالیس روز تک نہ ماں غسل کرتی ہے،اور نہ ہی بچے کو غسل دیا جاتا ہے، کیا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟،(برکت علی، گلشن اقبال، کراچی (معرفت دین و دانش، روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد ضرورت کے وقت اس بچے کو غسل دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور یہ نظریہ غلط ہے کہ ایک مرتبہ غسل دینے کے بعد اسے دوبارہ غسل نہیں دے سکتے ،سوائے اس کے کہ ڈاکٹر طبی طور پر غسل دینے کو اس کے لئے نقصان دہ قرار دے۔بچے کی پیدائش کے بعد ماں (زچہ) کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے،اس کو نفاس کہتے ہیں،شرعی اعتبار سے نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے،اگر چالیس دن تک اس کا خون جاری رہتا ہے،تو اس عرصے میں وہ شرعی طور پر ناپاک رہے گی،اور ان ایام میں وہ نماز نہیں پڑھے گی اور نہ ہی بعد میں اس پر ان نمازوں کی قضا ہے،اسی طرح اس کے لئے قرآن کو چھونا اور زبانی قرآن کی تلاوت کرنا بھی منع ہے،البتہ کلماتِ قرآن بطورِ ذکر، تسبیح و دعا پڑھ سکتی ہے۔اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہتا ہے،تو اب یہ "نفاس" نہیں ہے، بلکہ وہ غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازوں کا سلسلہ شروع کر دے، ہاں اگر خون اتنی دیر بھی نہ رکتا ہو کہ ایک وقت کی

نماز پڑھ لے، تو ہر نماز کے لئے تازہ وضو کر کے نماز پڑھ لیا کریں (وضو سے پہلے خون آلود مقام دھولیں)، اور اس وقت کے اندر مزید جتنی قضا نمازیں، نوافل وغیرہ پڑھ سکتی ہوں، پڑھ لیں اور تلاوت بھی کرسکتی ہیں۔ شرعاً نفاس کی کم از کم کوئی مقرر مدت نہیں ہے، بس جس دن خون رک جائے، وہ غسل کر کے پاک ہو لے اور نماز کا سلسلہ شروع کردے، اگر نہیں کرے گی تو گنہگار ہوگی اور وہ نمازیں اس کے ذمے قضا ہوں گی۔ تاہم جب تک نفاس کا سلسلہ جاری ہے، وہ شرعی پاکی کے لئے تو غسل نہیں کرے گی، البتہ جسمانی میل پسینہ دور کرنے کے لئے، طبیعت کے تکدر اور انقباض کو دور کرنا چاہے تو غسل کرسکتی ہے۔

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الصلوٰۃ﴾

طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ عید

سوال: 12

طلوعِ آفتاب ہونے پر کتنی دیر تک نماز پڑھنا مکروہ ہے؟ ایک دیوبندی امام نے نمازِ عید الاضحیٰ کی جماعت صبح سات بج کر پچیس منٹ پر کھڑی کر دی جبکہ اس روز طلوعِ آفتاب سات بج کر سترہ منٹ پر تھا۔ کیا ان کی نمازِ عید ہوگئی یا نہیں؟ نیز کورنگی میں واقع دارالعلوم کراچی کے نماز سے متعلق نظام الاوقات کے نقشے کے مطابق طلوعِ آفتاب کے بعد صرف دس منٹ تک نماز پڑھنا مکروہ ہے جبکہ ہم اہلسنت وجماعت کے یہاں طلوعِ آفتاب سے لے کر بیس منٹ تک مکروہ وقت ہے، جیسا کہ بہارِ شریعت وغیرہ کتب میں مذکور ہونے کے ساتھ ساتھ عمل بھی اسی پر ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیلی اور مدلل روشنی ڈالیں، (عبداللہ قادری، کراچی)۔

جواب:

اوقاتِ مکروہہ (طلوع، غروب اور نصف النہار شرعی) ان تینوں وقتوں میں کوئی نماز نہ فرض نہ واجب نہ نفل نہ ادا نہ قضا یونہی سجدۂ تلاوت بھی جائز نہیں ہاں اگر اس دن کی نمازِ عصر ادا نہ کی ہو تو اگرچہ سورج غروب ہو رہا ہو تو بھی پڑھ لے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ثلاث ساعات لاتجوز فيها المكتوبة ولاصلاة الجنازة ولاسجدة التلاوة اذا طلعت الشمس حتى ترتفع وعند الانتصاف الى أن تزول وعند احمرارها الى أن تغيب الاعصر يومه ذالك فانه

يجوز اداؤه عند الغروب هكذا فی فتاویٰ قاضی خان۔
ترجمہ:''تین ساعتیں جن میں کسی قسم کی نماز، نمازِ جنازہ، سجدۂ تلاوت جائز نہیں، جب سورج طلوع ہونا شروع ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور نصف النہار شرعی سے نصف النہار حقیقی یعنی آفتاب ڈھلنے تک ہے، آفتاب کے زرد ہونے سے غروب تک مگر یہ کہ اس دن کی نمازِ عصر غروب کے وقت بھی پڑھ لے، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 54 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔
امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:
''جب سے آفتاب کی کرن چمکے اس وقت سے بیس منٹ گزرنے تک نماز ناجائز اور وقتِ کراہت ہوا، اور ادھر جب غروب کو بیس منٹ رہیں، وقت کراہت آجائے گا، اور آج کی عصر کے سواء ہر نماز منع ہوجائے گی، (فتاویٰ رضویہ جلد: 5، ص: 138، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔سائل کے مطابق مذکورہ دیوبندی امام نے سات بج کر پچیس منٹ پر عید کی نماز کھڑی کردی، یہ نماز مکروہ ہوئی، کیونکہ طلوعِ آفتاب اور نماز میں آٹھ منٹ کا وقفہ ہوا اور امام احمد رضا قادری کے نزدیک طلوعِ آفتاب کے کم از کم بیس منٹ بعد نماز پڑھنی چاہئے، اس سے پہلے پڑھی تو مکروہ ہوگی۔ دار العلوم کراچی کے نظام الاوقات کو بھی اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کی رو سے بھی طلوعِ آفتاب کے دس منٹ بعد تک نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور استفتاء میں درج صورتِ مسئلہ کے مطابق مذکورہ امام نے طلوعِ آفتاب کے آٹھ منٹ بعد نمازِ عید کی جماعت کھڑی کی، لہٰذا سب کی نماز مکروہ ہوئی اور اس کی ذمہ داری امام پر عائد ہوتی ہے۔نمازِ عید سے متعلق علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:
ووقت صلاة العيدين من حين تبيض الشمس الى ان تزول كذافي السراجية و كذا في

التبیین۔ والافضل أن یعجل الاضحی ویؤخر الفطر کذا فی الخلاصہ۔

ترجمہ: ''اور نمازِ عیدین کی ادائیگی جب سورج روشن ہو جائے، سے اس کے زوال (نصف النہار شرعی) تک ہے، ''سراجیہ'' اور ''تبیین'' میں اسی طرح ہے عید الاضحی میں جلدی اور عید الفطر میں تاخیر کرنا افضل ہے، ''خلاصہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاوٰی عالمگیری جلد 1 ص:150 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

طلوع سے مراد آفتاب کا کنارہ ظاہر ہونے سے اس وقت تک ہے کہ اس پر نگاہیں خیرہ ہونے لگیں جس کی مقدار کنارہ چمکنے سے بیس منٹ تک ہے۔

تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم

سوال: 13

بے نمازی کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترک نماز کرنے والا کافر ہو جاتا ہے؟، (محمد عمیر، بلدیہ ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

نماز اسلام کا بنیادی رکن ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو بیان کرتے ہوئے توحید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز کا ذکر فرمایا۔ قرآن میں ترکِ نماز پر بڑی وعید آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا

(1) ترجمہ: ''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے، جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی، تو عنقریب وہ (جہنم کے گڑھے) غی میں جا گریں گے، (مریم: 59)''۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ o إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ o فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ o عَنِ الْمُجْرِمِينَ o مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ o قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ o وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ o

(2) ترجمہ: "ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے، سوائے دائیں طرف والوں کے، وہ جنتوں میں (ہوں گے اور) مجرموں کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے، (پھر وہ مجرموں سے کہیں گے) کون سا جرم تمہارے دوزخ میں داخل ہونے کا سبب بنا؟، وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المدثر: 38-44)"۔

وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ o الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ o

(3) ترجمہ: "سوان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں، (الماعون: 5-4)"۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَى يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ط

(4) ترجمہ: "بے شک منافق اپنے (زعم میں) اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں، درآں حالیکہ اللہ ان کو دھوکے کی سزا دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی (اور بے دلی) سے اور وہ اللہ کا ذکر (تو) بہت ہی کم کرتے ہیں، (النساء: 142)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (هي فرض عين على مكلف ــــــ ويكفر جاحدها) لثبوتها بدليل قطعي (وتاركها عمدا مجانة) أي تكاسلا فاسق (يحبس حتى يصلي) لانه يحبس لحق العبد فحق الحق احق۔ الخ

ترجمہ: ''ہر مکلّف یعنی عاقل وبالغ پر نماز فرض عین ہے،اس کی فرضیت کا منکر کافر کیونکہ نماز کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اور جو قصداً چھوڑے، (اگر چہ ایک ہی وقت کی)،وہ فاسق ہے، (جو نماز نہ پڑھتا ہو) اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ (وہ توبہ کرے) اور نماز پڑھنے لگے، کیونکہ جب بندے کے حق کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے تو اللہ کا حق اس کا زیادہ حقدار ہے کہ (اس کی نافرمانی پر) اسے قید کیا جائے۔

نمازی کے حکم کے بارے میں ائمہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قوله وعندالشافعي يقتل) وكذا عند مالك واحمد وفي رواية عن احمد وهي المختارة عندجمهور اصحابه انه يقتل كفراوبسط ذالك في الحلية۔

ترجمہ: ''صاحبِ درمختار کا قول کہ وعندالشافعي يقتل یعنی امام شافعی کے نزدیک بے نمازی کو قتل کیا جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا بھی ہے اور امام احمد بن حنبل سے ایک قول جو کہ ان کے اصحاب کے نزدیک قولِ مختار بھی ہے یہ منقول ہے کہ (بے نمازی کو) ان کے کافر ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور حلیہ میں میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا گیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2 ص: 7 ,6 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی ترکِ نماز پر وعید آئی ہے:

(1) عن جابر قال:قال رسول الله ﷺ:بين العبدوبين الكفر ترك الصلوة۔

ترجمہ: ''بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کا ترک ہے، (مشکوۃ :بحوالہ صحیح مسلم)''۔

(2) عن عبدالله بن شقيق قال: كان اصحاب رسول الله ﷺ لا يرون

شیئامن الاعمال ترکہ کفراغیر الصلوۃ ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نماز کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے (یعنی اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے)، (مشکوٰۃ: بحوالہ ترمذی)''۔

(3) عن ابی الدرداء قال: اوصانی خلیلی ان لا تشرك باللّٰه شیئا وان قطعت وحرقت ولا تترك صلوٰۃ مکتوبۃ متعمدا فمن ترکھا متعمدا فقد برأت منه الذمة ولا تشرب الخمر فانها مفتاح کل شر۔

ترجمہ: ''ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ: مجھے میرے (محبوب) دوست (رسول اللہ ﷺ) نے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا خواہ تجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے اور جلا دیا جائے (یہ حکم عزیمت پر مبنی ہے، کم ہمت لوگوں کے لئے حالتِ اکراہ میں قرآن نے رخصت رکھی ہے) اور کسی فرض نماز کو جان بوجھ کر (ہرگز) نہ چھوڑنا، پس جس نے (فرض نماز کو) قصداً چھوڑا اس سے (اللہ اور رسول کا) ذمہ (یعنی عہد اور امان) اٹھ گیا اور شراب نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے، (مشکوٰۃ: بحوالہ ابن ماجہ)''۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اس امر پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نماز ہر بالغ، عاقل، طاہر مسلمان پر فرض ہے، سوائے اس خاتون کے جو حالتِ حیض یا نفاس میں ہو یا جو شخص مجنون ہو یا بیہوشی کی حالت میں ہو۔ یہ خالص بدنی عبادت ہے، اس میں نیابت قطعاً قبول نہیں کی جائے گی بالہذا کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے نماز پڑھنا صحیح نہیں جیسے کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے روزہ رکھنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس بات پر مسلمانوں

کا اجماع ہے کہ جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے، وہ کافر و مرتد ہے۔ کیونکہ نماز کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور جو شخص سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرے وہ فاسق اور گنہگار ہے۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: نماز کا ترک دنیوی اور اخروی عذاب کا باعث ہے، (اور اس مقام پر وہ ان قرآنی آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں)۔۔۔ آگے چل کر ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: سستی کی بنا پر یا حقیر جانتے ہوئے نماز کو ترک کرنے کے احکام فقہاء کے نزدیک یہ ہیں:

حنفیہ کے نزدیک تارک الصلوٰۃ فاسق ہے، اسے قید کیا جائے گا اور تعزیری سزا دی جائے گی، یہاں تک وہ توبہ کرے اور نماز پڑھنا شروع کر دے یا قید خانے ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب تارک صلوٰۃ کے بارے میں بہت سخت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: تارک صلوٰۃ کو بر بناء کفر قتل کر دیا جائے گا، شوکانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے اسے قتل کیا جائے گا اور بعض انواع کفر مغفرت اور استحقاق شفاعت سے مانع نہیں ہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک بلا عذر تارکِ صلوٰۃ سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر وہ توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور مالکی اور شافعیہ کے نزدیک یہ قتل بطور حد ہوگا بر بناء کفر نہیں ہوگا یعنی اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے، ایسے شخص کی وفات کے بعد اسے غسل دیا جائے گا، اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص: 502 تا 505، دارالفکر، دمشق)"۔

تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں سب سے نرم اور صائب موقف امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ

تعالیٰ کا ہے اور وہ یہ کہ بلاعذرِ شرعی تارکِ صلوٰۃ فاسق و فاجر ہے، قابلِ تعزیر ہے، اسے قید کیا جاسکتا ہے تاوقتیکہ وہ توبہ کرکے نماز پڑھنا شروع کردے، لیکن اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اس عنوان سے متعلق قرآن مجید کی آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ کو یکجا کرکے دیکھا جائے تو امام اعظم کا موقف ہی صائب اور درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ لایغفر ان یشرك بہ و یغفر مادون ذالك لمن یشاء۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس (جرم) کو تو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا جائے اور اس سے کم تر جو بھی گناہ ہوں، جس کے لئے چاہے، اسے معاف فرمادیتا ہے، (النساء:48)''۔ اس آیہ مبارکہ میں شرک کے سوا ہر گناہ کی مغفرت کی گنجائش موجود ہے، خواہ وہ کسی درجے کا ہو اور یہ مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: من قال لاالہ الااللّٰہ دخل الجنۃ۔ ''یعنی جس شخص نے صدق دل سے کلمۂ طیبہ پڑھا وہ (آخر کار کسی نہ کسی مرحلے پر) جنت میں داخل ہوگا''۔ وہ احادیث جن میں ترکِ نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے، انہیں نماز کی فرضیت کے انکار پر محمول کیا جائے گا، یعنی جو نماز کی فرضیت کا منکر ہوتے ہوئے نماز کا تارک ہو تو وہ بالاجماع کافر ہے، ایسا شخص ملتِ اسلام سے خارج ہے، البتہ جو شخص فرضیتِ نماز کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن کوتاہی کی بنا پر نماز کا تارک ہے تو وہ ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمھم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک فاسق ہے۔ حدیث میں جو ترکِ نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں اس سے مراد اعتقاداً ترک کرنا ہوگا، یعنی انکارِ فرضیت یا تارکِ صلوٰۃ کے ظاہر حال کو بیان کیا گیا ہے کہ عملاً اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ظہر کی پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟

سوال: 14

ظہر کی چار سنتیں جو پہلے پڑھی جاتی ہیں، اگر وہ فرض ادا کرنے سے پہلے نہ پڑھ سکیں تو ان کی معافی ہے؟ یا پڑھا جائے گا۔ اگر پڑھنی ہے تو کس طرح؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں، (عبداللہ، کراچی)۔

جواب:

سنتیں بعض مؤکدہ ہیں جن کی ادا کرنے کے لئے شریعت میں تاکید فرمائی اور شارع علیہ السلام نے اس پر ہمیشگی اختیار فرمائی اور اس کے بے پناہ اجر وثواب کو بیان فرمایا: عن أم حبيبة قالت : قال رسول الله ﷺ : "من صلّى قبل الظهر أربعاً وبعدها أربعاً حرمه الله على النار"۔

ترجمہ: "ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ظہر سے پہلے چار اور بعد میں چار رکعتیں (ہمیشہ) پڑھے اللہ تعالیٰ اس کو آگ پر حرام فرمادے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 427)"۔

عن عنبسة بن ابی سفیان قال: سمعت اختی أم حبيبة زوج النبی ﷺ تقول : سمعت رسول الله ﷺ يقول : "من حافظ على أربع ركعات قبل الظهر و أربع بعدها حرمه الله على النار"۔

ترجمہ: عنبسہ بن ابو سفیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ہمشیرہ، زوجِ نبی ﷺ (ام حبیبہ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ وہ بیان کرتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعات اور ظہر کے بعد کی چار رکعات کی حفاظت کرے، اللہ تعالیٰ اس کو آگ پر حرام فرمادے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 428)"۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں: ''حدیث میں ظہر کے بعد جن سنتوں کا ذکر ہے ان میں سے دو سنت ہیں اور دو مستحب، لہٰذا افضل یہ ہے کہ یہ الگ الگ دوگانے کی شکل میں پڑھی جائیں، ظہر سے پہلے کی چار سنتوں کے برعکس کہ وہ ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائیں گی، جہاں تک یہ سنتیں پڑھنے پر غیر معمولی اجر، (یعنی یہ کہ وہ شخص جہنم کی آگ پر حرام کی نوید کا مسئلہ) ہے، اس سے یا تو مراد یہ ہے کہ وہ دائمی طور پر جہنم میں نہیں رہے گا یا یہ کہ جو شخص سنتوں اور مستحبات کا اتنا اہتمام کرتا ہے، وہ فرائض وواجبات کا اس سے بھی زیادہ پابند ہوگا اور محرمات سے بھی اجتناب کرنے والا ہوگا، تو یقیناً جہنم سے محفوظ رہے گا، (مرقات المفاتیح ،ج:3،ص:113 مکتبۂ امدادیہ، ملتان)''۔

عن عائشة: ان النبی ﷺ کان اذالم یصل اربعاقبل الظھر صلاھن بعدہٗ۔

ترجمہ: ''(امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں نہ پڑھی ہوتیں، تو انہیں بعد میں پڑھ لیتے، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 426 ج 1: ص: 319 دار الکتب العلمیہ، بیروت)''۔

سنتِ مؤکدہ کو سنن الھدیٰ بھی کہتے ہیں، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والسنة نوعان: سنة الھدیٰ، وترکھا یوجب اساءة و کراھیة کالجماعة والأذان والاقامة ونحوھا۔

ترجمہ: ''سنت کی دو قسم ہیں: (جس میں سے ایک) سنن الھدیٰ (سنتِ مؤکدہ) بھی ہے، اور ان کا ترک کرنا، موجبِ گناہ اور باعثِ کراہیت ہے جیسے کہ جماعت، اذان واقامت اور (ان جیسے دیگر) امور کا ترک کرنا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 1 ص:

WWW.NAFSEISLAM.COM

196 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وأما الاربع قبل الظھر اذا فاتته وحدھا بان شرع فی صلاۃ الامام ولم یشتغل بالاربع فعامتھم علی أنه یقضیھا بعد الفراغ من الظھر مادام الوقت باقیا وھو الصحیح ھکذا فی المحیط۔ وفی الحقائق یقدّم الرکعتین عندھما وقال محمد رحمه الله تعالیٰ یقدّم الاربع وعلیه الفتویٰ کذا فی السراج الوھاج۔

ترجمہ:"(جب ظہر کی جماعت کھڑی ہو جائے)اور (مقتدی کے)امام کے ساتھ (جماعت میں) شامل ہونے کی وجہ سے ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو عام فقہائے کرام کی رائے یہ ہے کہ جب تک وقت باقی ہے، (ظہر کے فرائض سے) فارغ ہونے کے بعد پڑھ لے، یہی صحیح ہے،"محیط" میں اسی طرح ہے،اور"حقائق "میں ہے کہ شیخین (امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کے نزدیک (بعد والی) دو رکعتیں پہلے پڑھے،(اور پھر ظہر کی پہلی چار سنتیں جو چھوٹ گئی ہیں، پڑھے)امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے والی چار (سنتیں)پہلے پڑھے(اور پھر بعد والی دو پڑھے)اور اسی پر فتویٰ ہے،"السراج الوھاج" میں اسی طرح ہے،(عالمگیری،ج:1،ص:112،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)"۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ظہر یا جمعے کے پہلے کی سنت فوت ہوگئی اور فرض پڑھ لیے تو اگر وقت باقی ہے،بعد فرض کے پڑھے،اور افضل یہ ہے کہ پچھلی سنتیں پڑھ کر ان کو پڑھے،(فتح القدیر)،(بہارِ شریعت ج:4،ص:101،ضیاء القرآن پبلیکشنز،کراچی)"۔

ظہر سے پہلے کی چھوٹی ہوئی چار سنتوں کو پچھلی دو سنتوں کے بعد پڑھنا زیادہ قرین

قیاس ہے کیونکہ پہلے والی چار تو اپنی جگہ سے ہٹ چکی ہیں تو بعد والی دو تو اپنی جگہ پہ قائم رہنی چاہئیں، یہی شیخین کا مذہب ہے اور صاحبِ فتح القدیر کا مختار ہے۔

جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے، اس جگہ پر نماز پڑھنا

سوال: 15

ہمارے گھر میں فرش کے نیچے گٹر کا پائپ گزرا ہوا ہے۔ کیا اُس فرش پر نماز ہو جاتی ہے؟، (بخت ولی، راولپنڈی)۔

جواب:

نمازی کے بدن، اس کے کپڑے اور جائے نماز (جس جگہ نماز پڑھ رہا ہے) کا نجاستِ حقیقیہ قدرِ مانع سے پاک ہونا، نماز کی شرائط میں سے ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولو کان رقیقاً وبسطه علی موضع نجس، ان صلح ساتراً للعورۃ تجوز الصلاۃ کما فی "البحر" عن "الخلاصۃ"۔ وفی "القنیۃ": لو صلیّ علی زجاج یصف ماتحته قالوا جمیعا یجوز۔

ترجمہ: ''اگر نجس جگہ پر باریک کپڑا بچھا کر نماز پڑھی جو ستر کے کام میں آسکتا ہے (یعنی اس کے نیچے کی چیز نہ جھلکتی ہو) نماز ہوگئی، ''بحر الرائق'' میں ''خلاصہ'' سے اسی طرح منقول ہے۔ ''قنیہ'' میں ہے: اگر شیشہ پر نماز پڑھی اور اس کے نیچے نجاست ہے اگرچہ نمایاں ہو، نماز ہوگئی، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 68 مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مذکورہ صورت میں چونکہ پائپ فرش کے نیچے سے گزر رہا ہے اور نجاست پائپ کے

اندر ہے اور خود پائپ بھی زمین میں دفن ہے اور نمازی نہ تو نجاست پر کھڑا ہے اور نہ ہی اس کے نجاست سے آلودہ ہونے کا کوئی خطرہ ہے لہٰذا اس مقام پر نماز تو جائز ہے، لیکن اگر اس مقام پر پڑھنے سے طبیعت میں کراہت محسوس ہوتی ہے تو دوسری جگہ پڑھ لیں۔

مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر محفوظ کرنا

سوال: 16

ایک نمازی مسجد میں اپنا رومال، تولیہ یا کوئی کپڑا اس لئے رکھے کہ دوسرے کو وہ جگہ ملے اور وہ آدمی ابھی مسجد میں نہیں ہے کہ جس کے لئے جگہ روک رہے ہیں یا اپنے لئے کسی جگہ کو مقرر کرلے کہ وہاں کسی کو نہ بیٹھنے دے، کیا ایسا کرنا درست ہے ؟، (وقاص احمد، کراچی)۔

جواب:

نماز میں اپنے یا کسی دوسرے شخص کے لئے جگہ مخصوص کرنا مکروہ ہے،

حدیث مبارکہ میں ہے:عن جعفر بن عبداللّٰہ: أن تمیم بن محمود اخبرہ، أن عبدالرحمن بن شبل اخبرہ، أن رسول اللّٰہ ﷺ نھیٰ عن ثلاث: عن نقرۃ الغراب، وأفتراش السبع، وأن یوطن الرجل المقام للصلاۃ کمایوطن البعیر۔

ترجمہ: ''عبدالرحمن بن شبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نماز میں) تین باتوں سے منع فرمایا، کوے کی طرح ٹھونگ مارنا، (یعنی جلدی جلدی سجدہ کرنا کہ پیشانی زمین سے ٹکرائے اور مقدارِ سنت تین تسبیحات پڑھنے سے پہلے

اُٹھ جائے) درندے کی طرح پاؤں بچھا کر بیٹھنا اور مسجد میں کوئی شخص جگہ مقرر کر لے جیسے اونٹ جگہ مقرر کر لیتا ہے،(سنن نسائی، رقم الحدیث: 1111)"۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ویکرہ للانسان ان یخص بنفسہ مکانا فی المسجد یصلی فیہ کذا فی التتار خانیہ۔

ترجمہ"کسی شخص کا مسجد میں اپنے لئے کوئی جگہ خاص کر لینا کہ وہیں نماز پڑھے، مکروہ ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد: اول، ص: 108، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

لہٰذا مسجد میں نہ کسی کا اپنے لئے پہلے سے جگہ مختص کرنا درست ہے اور نہ دوسرے کے لئے، اس سے اپنے لئے یا دوسرے کے لئے تعلّی (یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے) کا تاثر پیدا ہوتا ہے اور نماز کے من جملہ مقاصد شرعیہ میں سے بندے میں، عجز وانکسار پیدا کرنا ہے اور اپنے نفس کے عُجب (غرور وتکبر) سے بچنا ہے، پھر مسجد ہی تو وہ مقام ہے جہاں انسانوں کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے، جیسے علامہ اقبال نے کہا:

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے　　　تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز　　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہاں اگر کوئی شخص پہلے سے مسجد میں صف میں بیٹھا ہوا ہے، اور کوئی صاحبِ علم، صاحب ورع وتقویٰ آجاتا ہے، اور وہ شخص اس کی دین داری، تقویٰ اور علم کی وجہ سے اس کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، بشرطیکہ اس صاحبِ علم وتقویٰ کے دل میں ایسی خواہش نہ ہو کہ علم کی بنا پر اس کی تکریم کی جائے یا کوئی معذور و بیمار ہے اور اسے کنارے میں ٹیک لگا کر بیٹھنا ہے تو اس بنا پر کوئی اس کی رعایت کر کے جگہ چھوڑ دے تو یہ جائز اور مستحسن امر ہے اور محاسنِ اَخلاق میں سے ہے، ہاں کسی کی دنیوی وجاہت ومنصب یا دولت کی

وجہ سے اسے تکریم دی جائے تو یہ شرعاً ناپسندیدہ امر ہے۔

نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت کہہ دینا

سوال: 17

اگر مؤذن صاحب نے اقامت کہی اور امام صاحب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خود مصلّے پر نماز پڑھانے آگئے تو کیا اس صورت میں مؤذن کی کہی گئی اقامت کافی ہوگی یا دوبارہ اقامت کہی جائے گی؟۔(اراکین انتظامیہ جامع مسجد نورانی ،لانڈھی 4 کراچی)۔

جواب:

اقامت درست اور کافی ہوگی، دوبارہ نہیں کہی جائے گی۔حدیث مبارک میں ہے:عن زیاد بن الحارث الصدائی ، قال: کنت مع رسول اللہ ﷺ فی سفر۔فأمرنی فأذّنت ۔ فأراد بلال ان یقیم ۔ فقال رسول اللہ ﷺ : "انّ أخا صداءٍ قد أذّن ۔ومن أذّن فھو یقیم "۔

ترجمہ:''زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے آپ ﷺ نے مجھے اذان کا حکم دیا۔پھر (اذان کے بعد)بلال نے ارادہ کیا کہ وہ اقامت کہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:تمہارے بھائی صدائی نے اذان کہی پس جو اذان کہے وہی اقامت کہے،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:717)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

والاحسن أن یکون اماما فی الصلاۃ کذا فی معراج الدرایۃ ۔و الافضل أن یکون المؤذن ھوالمقیم کذا فی الکافی۔ وان أذن رجل و اقام آخر ان

غـاب الاول جـاز من غير كراهة وان كان حاضرا او يلحقه الوحشة باقامة غير ه يكره وان رضى به لا يكره عندنا كذا في المحيط ۔

ترجمہ: ''اور امام ہی اذان دے تو یہ بہت زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ''معراج الدرایہ'' میں ہے، اور افضل یہ ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے'' کافی '' میں اسی طرح سے ہے ۔اور اگر ایک شخص نے اذان کہی اور دوسرے نے اقامت کہی تو اگر پہلا شخص (جس نے اذان کہی) غائب ہے، تو بلا کراہت اقامت جائز ہے اور اگر وہ موجود ہے اور اس کی اجازت کے بغیر دوسرے شخص نے اقامت کہی اور مؤذن کو (دوسرے کا اقامت کہنا) نا گوار ہو تو پھر یہ مکروہ ہے، اور اگر وہ راضی ہے تو ہمارے نزدیک کوئی کراہت نہیں، ''محیط'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 54، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)'' ۔

اس مسئلے سے معلوم ہوا کہ جو شخص امامت کرائے وہ اقامت بھی کہہ سکتا ہے، عموماً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر امام مصلّٰی پر نہ ہو تو اقامت نہیں کہی جائے گی یہ خیال باطل ہے، اقامت کے وقت امام کا مُصلّٰی پر ہونا نہ واجب ہے، نہ سنت نہ مستحب، امام مصلّٰی پر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں برابر ہیں ، بلکہ عہد رسالت میں یہی طریقہ رائج تھا کہ حضور اقدس ﷺ حجرے میں ہوتے ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کی طرف نظریں جمائے رہتے ، جب آپ حجرۂ انور سے نکلتے تو وہ اقامت شروع کر دیتے، صحابہ بھی فوراً اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے، آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اس عجلت کے طریقہ سے منع فرمایا، چنانچہ اس کے بعد جب آپ حجرۂ انور سے نکلتے ، اقامت شروع ہو جاتی ، آپ مصلّٰی پر تشریف لاتے اور جیسے جیسے آپ ﷺ صحابۂ کرام کی صفوں سے گزرتے، وہ کھڑے ہوتے جاتے ۔حدیث پاک میں ہے:

عن ابی قتادۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: اذا اُقیمت الصلوٰۃ فلاتقوموا حتی تروني -

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو جب تک تم (خود) مجھے دیکھ نہ لو، (عجلت میں) کھڑے نہ ہوا کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:604)''۔

جو مسئلہ دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آیا جس شخص نے جماعت کے لئے اقامت کہی ہو، وہ آگے بڑھ کر امامت بھی کر سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں اقامت کہنے والا امامت کر سکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اقامت کہہ دی جاتی ہے مگر اقامت کہنے والے کے سوا کوئی امامت کا اہل نہیں ہے تو وہ آگے بڑھ کر امامت کر سکتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ امام تو موجود ہوتا ہے مگر کوئی اقامت کہنے والا نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں امام اقامت کہہ سکتا ہے۔

نوٹ: جماعت کے قیام کے لئے جماعت سے پہلے اقامت کہی جاتی ہے، اسے حدیث وفقہ میں ''اقامت'' کہا جاتا ہے، اور یہ عنوان اس کلمے سے ماخوذ ہے: قد قامت الصلوٰۃ، (نماز یعنی جماعت کھڑی ہوگئی ہے)۔

اقامت کے لفظی معنی ہیں: ''کھڑا کرنا'' اور یہاں مراد ہے ''جماعت کا قائم کرنا''۔ ہمارے ہاں عرف عام میں لوگ اسے ''تکبیر'' کہتے ہیں، ''تکبیر'' کے معنی ہیں ''اللہ اکبر'' کہنا یا اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرنا۔ چونکہ اس کا پہلا کلمہ ''اللہ اکبر'' ہے، اسی لئے اسے تکبیر بھی کہہ دیتے ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

امام یا موذن کا غیر شادی شدہ ہونا

سوال: 18

امامت یا موذن کے فرائض کی ادائیگی کے لئے کیا یہ شرط ضروری ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔کیا امام کی غیر موجودگی میں موذن (جو کہ غیر شادی شدہ ہے)امامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے ؟،(حافظ معشوق علی سکندری ،موذن جامع مسجد صدیقیہ D-5 نیو کراچی)۔

جواب :

شرائطِ امامت میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ امام شادی شدہ ہو،شرائطِ امامت چھ ہیں،اسلام،عاقل،بالغ،مرد ہونا،قراءت پر قادر ہونا،معذور نہ ہونا ۔

امامِ معیّن ہی امامت کا زیادہ حق دار ہے اگر چہ حاضرین میں کوئی اس سے زیادہ علم اور زیادہ تجوید والا ہو،اور اگر امامِ معیّن کسی بناء پر موجود نہ ہو یا آنے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی جگہ موذن نماز پڑھانے کا زیادہ اہل ہے کہ یہ اس کے فرائض میں شامل ہے ،ہاں اگر کسی مسجد میں امامِ معیّن کے ساتھ نائب امام بھی علیحدہ سے مقرر ہو تو نماز پڑھانے کا اختیار اسے حاصل ہوگا لیکن اگر موذن ہی نائب امام ہے تو پھر نماز وہی پڑھائے۔جس وقت امام یا موذن کا تقرر کیا جاتا ہے تو مسجد کمیٹی امام یا موذن سے متعلق معلومات جمع کرتی ہیں تو اس وقت شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونا سب معلوم ہو جاتا ہے بعد میں اس بات کو عذر بنانا محض فتنہ انگیزی ہے،لیکن بہر حال غیر شادی شدہ ہونا امام یا موذن کو ان کے فرائض سے علیحدہ کرنے کے لئے عذر نہیں ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

تراویح کی امامت کا استحقاق

سوال : 19

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ ایک مسجد کے امام صاحب حافظِ قرآن، قاری وعالمِ دین ہیں، مذکورہ امام کے ہوتے ہوئے انتظامیہ کے بعض افراد نے نمازِ تراویح کے لئے دوسرے حافظ کا انتظام کیا ہے جو صرف حافظ ہے، عالم وقاری نہیں، انتظامیہ کے ان افراد نے مذکورہ امام صاحب کو کہا کہ آپ کو اجازت ہے کہ کسی اور مسجد میں تراویح پڑھالیں۔ واضح ہو کہ مقررہ امام صاحب پر انتظامیہ یا کسی اور مقتدی کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ امام صاحب اور مقتدی صاحبان کی شدید خواہش ہے کہ وہ خود تراویح پڑھائیں۔

جس حافظ کو تراویح کے لئے مقرر کیا جارہا ہے وہ انتظامیہ کے کسی ممبر کا رشتے دار ہے ۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ انتظامیہ کا یہ عمل شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا انتظامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ تراویح پڑھانے کا جو حق مقررہ امام کو حاصل ہے، بغیر کسی شرعی وجہ کے کسی اور کو تفویض کردے؟ اس حافظ کے پیچھے جو عالم نہیں ہے رمضان میں نمازِ عشاء ،وتر وتراویح پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ ۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں ،(فخر عالم، مہاجرین مسجد بزرٹہ لائن کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں امام معین (جو کہ عالم دین ہونے کے ساتھ قاری وحافظ بھی ہے) ہی نمازِ تراویح کی امامت کا زیادہ حقدار ہے، بلکہ افضل یہ ہے کہ وہی نمازِ تراویح پڑھائے، دوسرے کی اقتداء نہ کرے۔

علامہ نظام الدین تراویح کی بحث میں لکھتے ہیں:

ولو كان الفقيه قارئا فالافضل والاحسن ان يصلي بقرأة نفسه ولا يقتدي بغيره كذافي فتاوی قاضيخان ۔

ترجمہ: اوراگر (تراویح پڑھانے والا) عالم ہوتو افضل ہے بلکہ احسن یہی ہے کہ وہ خود پڑھائے دوسرے کی اقتداء نہ کرے فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 116 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔ جب امام خود حافظ قرآن ہے اور تراویح پڑھانے کا خواہش مند بھی ہے تو اسے کسی دوسری جگہ جاکر پڑھانے کی کیا ضرورت ہے اس بات کا وہ زیادہ حق دار ہے کہ خود اپنی مسجد میں تراویح پڑھائے ہاں !اگر وہ بخوشی اجازت دے تو دوسرے شخص کو مقرر کیا جاسکتا ہے، انتظامیہ کے افراد کا ازخود فیصلہ کرنا جانبداری اور ناانصافی پر مبنی ہے انہیں چاہئے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کریں، شرعی معاملات میں مداخلت انتظامیہ کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے اور اگر وہ انتظامی امور کے اہل نہ ہوں شرعی معاملات میں ضد اور ہٹ دھرمی اختیار کرتے ہوں تو ایسے لوگوں کو معزول کردینا چاہئے اور ان کی جگہ نیک اور دین دار لوگوں کا انتخاب کرنا چاہئے۔

جسمانی نقص سے امامت میں فرق

سوال: 20

ہماری مسجد میں نئے پیش امام صاحب مقرر کیے گئے ہیں، جو کہ بہترین قاری عالم و مقرر ہیں، لیکن ان کے ایک پیر میں نقص ہے، یعنی تھوڑا لنگڑا کر چلتے ہیں، جو ایک واضح نقص ہے، لیکن سجدہ کی حالت میں ان کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں۔ نمازی حضرات معترض ہیں کہ شرعی اعتبار سے ایسا شخص امامت نہیں کراسکتا ہے، اوراس کے پیچھے نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی، برائے مہربانی شریعت کی رو سے فتویٰ

عنایت فرمائیں۔(قدیر احمد انصاری، جنرل سکریٹری، جامع مسجد باب الاسلام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو كان لقدم الامام عوج وقام على بعضها يجوز وغيره اولى كذا في التبيين ۔

ترجمہ: ''اگر امام کے پیر میں ٹیڑھا پن (ایسا نقص ہو) کہ پورا پاؤں زمین پر نہیں جما سکتا، تب بھی اس کی امامت جائز ہے، مگر (اس کے مقابلے میں) غیر معذور کی امامت بہتر ہے، (فتاوی عالمگیری جلد 1 ص: 83 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا: ایک آدمی جس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں نہیں ہیں، کیا وہ ان لوگوں کی امامت کرسکتا ہے؟، جن کے دونوں پاؤں درست ہوں۔

اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''شریعت میں نماز کے احکام میں معذور اس کو کہتے ہیں، جس میں وضو توڑنے والی کوئی بات پائی جائے، اس طرح کہ وہ وضو کرکے نماز پڑھنے کا وقت بھی نہ پاسکے کہ وضو ٹوٹ جائے، مثلاً بار بار پیشاب کے قطروں کا آنا، ہر وقت ریح کا خارج ہونا یا بدن سے خون یا پیپ کا بہتے رہنا، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے غیر معذور کی یا اس سے کم عذر والے کی نماز نہیں ہوتی، جیسا کہ بہارِ شریعت میں لکھا ہے۔

پیر کی انگلیاں کٹی ہونے کی وجہ سے اس قسم کا معذور نہیں ہے، وہ اپنے قدم زمین پر لگا کر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز بھی ہوجائے گی اور اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ انگلی موڑنے کا حکم اس کے لئے ہے، جس کے پیر میں انگلی ہو اور جس کے پاؤں میں انگلی ہی نہیں ہے، اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص: 179، مطبوعہ

بزمِ وقارالدین، کراچی)''۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورامام کی اقتدا میں نماز جائز ہے، بقول سائل امام صاحب کے پاؤں کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں، اگر خدانخواستہ ان کے پاؤں کی انگلیاں سرے سے نہ ہوتیں، اور پاؤں زمین پر لگ جاتا، تب بھی ان کی امامت درست ہوتی، یا انگلیاں سالم ہوتیں مگر ٹانگ کے لنگ کی وجہ سے پاؤں زمین پر لگ جاتا اور انگلیاں بر بنائے عذر رلگ جاتیں، تب بھی امامت درست ہوتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

ترجمہ: ''اوراس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، (الحج:78)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن انس، عن النبی ﷺ قال: ''یسّروا ولا تعسّروا وبشّروا و لا تنفّروا''۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''(دین میں) آسانی پیدا کرو، دشواری نہیں اور (لوگوں کو رحمت باری کی) بشارت سناؤ، انہیں دین سے متنفر نہ کرو (صحیح البخاری رقم الحدیث: 69 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

نابینا کی امامت

سوال: 21

کسی نابینا قاری وحافظِ قرآن امام کے پیچھے پنج وقتہ نماز اور نمازِ جمعہ ادا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ یعنی کیا نابینا کو امام بنانا جائز ہے؟، (حافظ قاری خلیق اللہ ،نواب شاہ)۔

جواب:

امام ابوداؤد سجستانی اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن أنس ان النبی ﷺ استخلف ابن أم مکتوم یؤم الناس وھو اعمیٰ ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (غزوۂ تبوک کے موقع پر عبداللہ) ابن اُم مکتوم کو (مدینہ منورہ میں) اپنا خلیفہ بنایا تاکہ وہ لوگوں کی امامت کریں، حالانکہ وہ نابینا تھے، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 595 المکتبۃ المکیہ، مکہ)''۔

اس کی شرح میں علامہ علی القاری الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ابن الملک نے کہا نابینا کی امامت کی کراہت تب ہے جبکہ قوم میں اس کے مقابلے میں تندرست شخص اس سے بڑا عالم یا اس کے برابر درجے کا عالم موجود ہو، اور ابن حجر نے کہا کہ اس میں نابینا کی امامت کا جواز ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بینا کی امامت اولیٰ ہے یا نابینا کی (جبکہ دونوں دستیاب ہوں)، (مرقاۃ المفاتیح، جلد:3، ص: 84 مکتبہ امدادیہ، ملتان)''۔

نابینا شخص اگر احتیاط برتتا ہے یعنی کپڑوں یا بدن پر کوئی چیز لگ جائے تو کسی بینا شخص کو دکھا کر اطمینان کر لیتا ہے کہ کہیں نجاست تو نہیں لگی؟، اور اگر نجاست لگ گئی ہو تو دھو لیتا ہے، ایسے نابینا کی امامت جائز ہے، مگر مکروہِ تنزیہی ہے اور اگر وہ حاضرین میں مسائل نماز کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکرہ) تنزیھاً (امامۃ اعمیٰ) ونحوہ الأعشی۔"نھر"(الا ان یکون)ای غیرالفاسق (أعلم القوم) فھو اولیٰ ۔

ترجمہ: ''نابینا اور ایسا شخص جسے رات کو نظر نہ آتا ہو، اس کی امامت مکروہ تنزیہی ہے (بحوالہ البحر) اور اگر یہ زیادہ صاحب علم ہو تو اس کی امامت بہتر ہے، (رد المحتار علی الدر المختار جلد: 2ص: 255 ,254دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔چونکہ علامہ حصکفی نے نابینا کا ذکر فاسق اور اعرابی کے سیاق میں کیا ہے،اس لئے اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وحاصلہ ان قولہ" الا ان یکون أعلم القوم "خاص بالاعمیٰ، اما غیرہ فلا تنتفی الکراھۃبعلمہ۔

ترجمہ: ''اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ (علامہ حصکفی کا یہ قول کہ) ''اگر وہ پوری قوم سے زیادہ عالم ہو'' (تو وہ نابینا امامت کا زیادہ حق دار ہے) نابینا کے ساتھ خاص ہے ،جہاں تک غیرِ نابینا (کی امامت) کا تعلق ہے،تو علم کی بنا پر اس کی کراہت منتفی نہیں ہوگی ـــــــاور آگے چل کر لکھتے ہیں: کہ اگر نابینا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عالم ہے تو استحقاقِ امامت کا معاملہ بالکل برعکس ہوگا (یعنی نابینا عالم ہی زیادہ حق دار ہوگا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:2ص:255دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ اندھے کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی یا تحریمی یا نہیں اور یہ امامت کے واسطے سزاوار ہے یا نہیں، جواب میں وہ لکھتے ہیں: اندھا اگر تمام موجودین میں سب سے زیادہ مسائل کا جاننے والا نہ ہو اور اس کے سوا دوسرا صحیح القراءت ،صحیح العقیدہ ،غیر فاسقِ معلن حاضر جماعت ہے،تو اندھے کی امامت مکروہِ تنزیہی ہے،اور اگر وہی سب سے زیادہ علم نماز رکھتا ہے تو اسی کی امامت افضل ہے، (فتاویٰ رضویہ،جلد 6ص:520 رضا فاؤنڈیشن،لاہور)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''نابینا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے،جبکہ دوسرے لوگ

مسائل طہارت ونماز میں اس سے زائد یا اس کے برابر ہوں، اور اگر سب سے زائد یہی علم رکھتا ہو، تو اس کی امامت میں اصلاً کراہت نہیں، بلکہ اس صورت میں اسی کو امام بنانا بہتر ہے۔ بحرالرائق میں ہے: قید کراھۃ امامۃ الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لا یکون افضل القوم فان کان افضلھم فھو اولیٰ۔ مکروہ تنزیہی ناجائز نہیں ہوتا مگر اس سے بچنا بہتر، اور کرنا برا ہے مگر گناہ نہیں، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 107 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)"۔

امام صاحب کی رہائش

سوال: 22

ہماری مسجد کے امام، صاحبِ حیثیت ہیں، پھر بھی مسجد میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں، جبکہ وہ با آسانی رہائش اور دیگر ضروریات اپنے خرچے پر انجام دے سکتے ہیں، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ادا ہو جائے گی؟، (عبدالمجید بندھانوی، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر امام صاحب کے تقرر کے وقت ان کی شرائط ملازمت میں مکان کی سہولت بھی شامل تھی، جو آپ نے ان کو فراہم کی ہے تو خواہ وہ صاحبِ حیثیت ہوں، ان کا مسجد کے مکان میں رہنا جائز ہے۔ امامت کا منصب چونکہ کل وقتی ہے، کسی بھی وقت امام کی خدمات کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لئے مساجد کے ساتھ عملے کے مکانات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عرف عام میں بھی اسے لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے۔

فقیہ العصر علامہ محمد نور اللہ نعیمی (فتاویٰ نوریہ جلد 1 ص: 184) لکھتے ہیں: "تکمیل تعمیر

کے بعد ضروریات مسجد میں سے امام اول نمبر میں ہے کیونکہ مسجد کی صرف ظاہری تعمیر کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کی معنوی اور حقیقی تعمیر نہ ہو حتیٰ کہ مسجد کے لئے روشنی پانی وغیرہ کے وسیع تر انتظام سے امام کی ضروریات مقدم ہیں"، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لا ثم الیٰ ماھو اقرب الی العمارۃ واعم للمصلحۃ کالامام للمسجد والمدرس للمدرسۃ یصرف الیھم بقدر کفایتھم ثم السراج والبسط کذلک الی اخر المصالح

ترجمہ: "وقف قائم کرنے سے جس چیز کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کا تعمیر کرنا (اور آباد کرنا) ہے، خواہ واقف اس کی شرط لگائے یا نہ لگائے، پھر جو امر (مسجد کی) کی آبادکاری کے لئے ضروری ہے اور مصلحت ومفادِ وقف میں جو زیادہ شامل ہے، (وہ ضروری ہے)، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسہ کے لئے مدرّس، ان پر ضرورت اور کفایت کے مطابق وقف کا مال خرچ کیا جائے (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:320)"۔ مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کا مصرف بننے کے لئے امام کا نادار ہونا شرط نہیں ہے۔ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات اور صدقاتِ واجبہ کا مصرف بننے کے لئے نادار ہونا شرط ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم

سوال: 23

امام صاحب نے عشاء کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اعلیٰ کی آخری چار آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں سورۂ اعلیٰ کی شروع کی تین آیا

ت تلاوت کیں۔نماز کے بعد چند لوگوں نے امام صاحب کو بتایا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھائی ہے،اس لئے دوبارہ نماز پڑھائیں مگر امام صاحب اور چند اورافراد نے نماز کو جائز قرار دیا۔اور دوبارہ نماز نہیں پڑھائی۔آپ سے التجا ہے کہ برائے کرم مجھے صحیح راہ دکھائیں،عین نوازش ہوگی ،(محمد علی،۹۸فیز ااسٹریٹ نمبر ۶ ڈیفنس آفیسر ہاؤسنگ اسکیم۔ملیر کینٹ کراچی)۔

جواب:

نماز میں قرآن ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ احکامِ قراءت میں سے ہے،احکامِ نماز سے نہیں،اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے لیکن نماز واجب الاعادہ نہیں ہوگی اور اگر بھولے سے پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلافِ ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے،اس کو چھوڑنا مکروہ ہے،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

لا بأس أن یقرأ سورة ویعیدھا فی الثانیةوان یقرء فی الاولیٰ من محل وفی الثانیة من آخر ولو من سورة ان کان بینھما آیتان فأکثر۔ ویکرہ الفصل بسورة قصیرة و أن یقرأ منکوساً الّا اذا ختم فیقرأ من البقرة۔ وفی "القنیة": قرأ فی الأولیٰ الکافرون وفی الثانیة ۔ ألم ترأوتبت۔ ثم ذکر یتم، وقیل یقطع ویبدأ ۔

ترجمہ:"اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا،یا پہلی رکعت میں ایک سورت کے ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں دوسرے مقام سے،اگر چہ ان دونوں کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو،اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے،اور سورت کا الٹا پڑھنا (یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا کہ جو ترتیب کے اعتبار سے

پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو) مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختمِ قرآن میں پھر سورۂ بقرہ سے تلاوت کی جائے۔اور ''قنیہ'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ کافرون پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۂ الم تر (الفیل) یا تبت (سورۂ لہب)، پھر (دورانِ تلاوت) یاد آیا تو اسی سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے، (ردالمحتار علی المختار جلد:2،ص:238،مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی)''۔

علامہ ابن عابدین شامی (وأن یقرأ منکوساً) کی تشریح میں لکھتے ہیں: بأن یقرأ فی الثانیة سورة أعلی مما قرأ فی الاولیٰ، لأن ترتیب السور فی القراءة من واجبات التلاوة

-

ترجمہ: ''یعنی دوسری رکعت میں اُس سے پہلے والی سورت تلاوت کرنا، جو پہلی رکعت میں پڑھی تھی (مکروہ ہے)، اس لئے کہ قراءت میں سورتوں کا ترتیب سے پڑھنا واجباتِ تلاوت میں سے ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

أفاد ان التنکیس أو الفصل بالقصیرة انما یکره اذا کان عن قصد، فلو سهوا فلا کما فی "شرح المنیة"۔ واذا انتفت الکراهة فاعراضه عن التی شرع فیها لاینبغی ۔ وفی "الخلاصة ":افتتح سورة وقصدسورة أخری فلما قرأ آیة أو آیتین أراد ان یترک تلک السورة ویفتتح التی أرادها یکره ۔ وفی "الفتح ":ولو کان : أی المقروء حرفاً واحدا۔

ترجمہ: ''اس عبارت سے یہ مستفاد ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنے اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنے کو جو مکروہ لکھا گیا ہے، مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا قصداً

کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر بھول کر ہو تو مکروہ نہیں، اسی طرح ''شرح منیہ'' میں ہے: جب (بھول کر) خلافِ ترتیب سہواً پڑھنے سے کراہت نہیں ہوتی ہو تو جس سورت کو (خلافِ ترتیب) شروع کردیا ہے اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے کہ: کسی شخص کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا مگر اس نے کوئی اور سورت شروع کردی اور ایک یا دو آیات پڑھنے کے بعد اگر وہ یہ چاہے کہ اُس سورت کو چھوڑ کر وہی سورت پڑھے جس کا (دل میں) ارادہ تھا ہو تو یہ مکروہ ہے اور ''فتح القدیر'' میں ہے: اگرچہ ایک حرف ہی پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص: 239، دار احیاء التراث العربي، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام نے پہلی رکعت میں "قل اعوذ برب الناس" پڑھی اور دوسری میں "قل اعوذ برب الفلق" پڑھی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمایئے، آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر بھول کر ایسا کیا نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہیے تھا اور قصداً ایسا کیا تو گناہ گار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدۂ سہو اب بھی نہ چاہیے تھا، توبہ کرے، پہلی میں اگر سورۂ ناس پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی سورۂ ناس ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلافِ اولیٰ ہے اور ترتیب اُلٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 346، 347 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام نے نماز میں ایک ہی سورت ''الاعلیٰ'' کی آیات بھول کر خلافِ ترتیب پڑھی ہیں، لہٰذا نماز بلا کراہت جائز ہے اور جماعت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراءت کی غلطی سے فسادِ نماز

سوال: 24

نماز کے اندر دورانِ قراءت "عَلیٰ اَبَوَیكَ" (سورۂ یوسف) کی جگہ "عَلیٰ اَبَوَیكِ "پڑھ لے تو نماز ہوگی یا نہیں؟ زید نے دورانِ نماز استحوذ علیهم الشیطٰن فانسٰهم ذکراللہ ط اولئك حزب الشیطٰن ط الا انّ حزب الشیطٰن هم الخسرون o (مجادلہ:19) کے بجائے "اولئك حزب الله"پڑھ لیتا ہے، آیا نماز میں کوئی خلل واقع ہوا یا نہیں، اور اگر امام دہرا کر دوبارہ صحیح پڑھ لے تو کیا نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، (یعقوب حنفی، نیا آباد کراچی)۔

جواب:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر نماز میں قراءت کے دوران ایسی غلطی ہوئی ہو، جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ اِعراب کی ایسی غلطی، جس سے معنی میں فساد لازم نہیں آتا، اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور اگر معنی میں اتنا تغیر ہو کہ اس کا اعتقاداً اور قصداً پڑھنا کفر ہو، تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اعادہ لازم ہوگا۔ لفظِ اَبَوَیكَ (کاف پر زبر) مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مؤنث کے لئے اَبَـــــــوَیكِ (کاف کے نیچے زیر) استعمال ہوتا ہے، اس طرح پڑھنے سے نماز ادا ہو جائے گی، احتیاطاً دہرالی جائے تو بہتر ہے۔

سورۂ مجادلہ کی آیت میں اولئك حزب الشیطٰن کے بجائے اولئك حزب الله پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی اور دہرانا واجب، اگر قصداً پڑھا تو کفر لازم ہوگا، ایسی صورت میں تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔ تاہم اگر بھول کر غلط پڑھنے کے بعد واپس دہرا کر صحیح پڑھ لیا تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا کہ امام نے نماز کے اندر سورۃ الحشر کی آیت نمبر 20 میں "ھم الفائزون" کی جگہ "ھم الفاسقون" پڑھ لیا، لیکن اسی وقت آیت کو دوبارہ لوٹا کر صحیح کرلیا۔ نماز ہوگئی یا نہیں؟

وہ جواب میں لکھتے ہیں: نماز میں دورانِ قراءت غلط پڑھنے کے بعد پھر لوٹا کر صحیح طور پر اسے پڑھا تو یہ نماز ہو جائے گی۔ علامہ سید احمد طحطاوی متوفی 1230 نے حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار میں لکھا وفی المضمرات قرأفی الصلوٰۃ بخطأ فاحش ثم اعادو قرأ صحیحافصلوٰتہ جائزۃ۔

ترجمہ: "اور مضمرات میں ہے کہ اگر کسی نے نماز میں فحش غلطی کی، پھر اسے لوٹا کر صحیح پڑھ لیا، تو اس کی نماز جائز ہے، (کتاب الصلوٰۃ، باب مایفسد الصلوٰۃ، جلد 1، ص: 267، المکتبۃ العربیہ، کوئٹہ)"۔

قراءت میں تشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپس اسی جگہ سے پڑھنا

سوال: 25

ایک آدمی نے نماز شروع کی، اس نے سورہ فاتحہ کے بعد قراءت شروع کی، ایک سورت پڑھی درمیان میں بھول گیا اور اس سورت کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری سورت پڑھنا شروع کر دی، کیا اس صورت میں اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟، (بخت ولی، راولپنڈی)۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

جواب:

صورتِ مسئولہ میں نماز درست ہوگئی اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اگر دونوں سورتوں کے درمیان ایک رکن ادا کرنے کی مقدار تاخیر ہوئی تو سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام مغرب میں

رکوع "لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہٗ" پڑھ رہا تھا جب "فِی الْاِنْجِیْل" تک پڑھ لیا، آیت پارہ 22 کا متشابہ لگا اُس کے بعد "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ" تک پڑھی، پھر جب یاد آیا اُسے چھوڑ کر مقامِ اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدہ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہو سکتا ہے تو سجدۂ سہو لازم آیا" کما فی الدر المختار" وغیرہ۔ اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی پھیرنا واجب ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 274، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کرنے کا حکم

سوال: 26

T.V یا Radio یا اس سے ملتے جلتے آلات میں بیانات چل رہے ہوں یا پھر تلاوت ہو رہی ہو تو اگر دورانِ تلاوت آیتِ سجدہ آجائے، یا حضور ﷺ کا اسم گرامی آئے تو کیا سجدہ کرنا یا درود شریف پڑھنا واجب ہے؟۔ احتیاطی طور پڑھ لیتے ہیں لیکن مسئلے کے اعتبار سے وضاحت فرمائیں، (مولانا زاہد اللہ عادل، جامع مسجد اقصیٰ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لا) تجب (بسماعہ من الصدی والطیر) ومن کل تال حرفا، ولا بالتھجی اشباہ۔

ترجمہ: "آیت سجدہ کی گونج سننے یا پرندے (طوطے) کے آیت سجدہ باربار دہرانے سے (اگر اسے پریکٹس کرا دی گئی ہو) سجدۂ تلاوت لازم نہیں آتا۔ اسی طرح کئی افراد

آیتِ سجدہ ایک ایک حرف (الگ الگ) پڑھیں تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، یا اس کے حروف جدا جدا کر کے پڑھے، تو اس کے سننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے "زیلعی" وغیرہ کے حوالے سے پرندے سے اور بازگشت سے آیتِ سجدہ سننے پر سجدۂ تلاوت کے عدمِ وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے جب کہ ایک ضعیف قول کے مطابق اس صورت میں بھی واجب ہے لیکن علامہ شامی عدمِ وجوب کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں: قلت والاکثر علی تصحیح الاوّل وبه جزم فی نورالایضاح ۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا یعنی عدمِ وجوب کا قول اکثر کے نزدیک صحیح ہے اور نورالایضاح میں بھی اس قول کو اختیار کیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج: 2، ص: 509)۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولا تجب اذا سمعها من طیر هو المختار۔

ترجمہ: "اور (اگر) پرندے (مثلاً طوطے سے) آیت سجدہ سنی تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، (ج:1، ص:132)"۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر ریڈیو یا ٹی وی پر قاری براہِ راست (Live) تلاوت کر رہا ہے تو بالاتفاق سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے، اگر ریکارڈنگ چل رہی ہے تو صحیح ترین قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے، اگرچہ بعض فقہاء کرام نے وجوب کا قول کیا ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ اگر آپ متوجہ ہو کر تلاوت سن رہے ہیں اور آیتِ سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کر لیتے ہیں تو اس کی افضلیت میں کوئی شک نہیں ہے، اسی طرح ریڈیو، ٹی وی پر رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک سن کر ہر بار درود پاک پڑھ لینا افضل ہے، "عدمِ وجوب" کا معنیٰ یہ ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار نہیں ہوگا۔

مسجد میں جماعتِ ثانی

سوال: 27

ہم یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ مسجد میں جماعت کے بعد دوسری جماعت کی جاتی ہے لیکن میں نے مسجد بلال ماڑی پور میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ مسجد میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، وضاحت فرمائیے ۔(سید صفی اللہ شاہ ،گڑھی نواب، بٹگرام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: المسجد اذا کان له امام معلوم و جماعة معلومة فی محلة فصلیٰ اهله فیه بالجماعة لا یباح تکرارها فیه باذان ثان اما اذا صلوا بغیر اذان یباح اجماعاً و کذا فی مسجد قارعة الطریق۔

ترجمہ: ''مسجد میں جب امام مقرر ہو اور پابندی سے جماعت ہوتی ہو اور وہاں کے رہنے والے باجماعت نماز پڑھتے ہوں تو ایسی مسجد میں اذانِ ثانی کے ساتھ جماعتِ ثانیہ جائز نہیں ہے البتہ جب وہ بغیر اذان کے جماعت سے نماز ادا کریں تو بالاتفاق دوسری جماعت جائز ہے جیسے شارع عام کی مسجد میں جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 83 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

یکرہ تکرار الجماعة باذان و اقامة فی مسجد محلة لا فی مسجد طریق أو مسجد لا امام له و لا مؤذن۔

ترجمہ: مسجد محلّہ میں اذان و اقامت کے ساتھ دوسری جماعت مکروہ ہے مگر وہ مسجد جو شارع عام پر ہو یا جس مسجد میں امام و مؤذن مقرر نہ ہوں ۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یکرہ تکرار الجماعة فی مسجد محلة بأذان واقامة، الا اذا صلی بھما فیه اولا غیر اھله اواھله لکن بمخافتة الاذان ، ولو کرر اھله بدونھما او کان مسجد طریق جاز اجماعاً کما فی مسجد لیس له امام ولا مؤذن ویصلی الناس فیه فوجاً فوجاً ، فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علی حدة کما فی "امالی قاضیخان"اھ۔

ترجمہ: ''مسجد محلّہ میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر اس صورت میں کہ غیر محلّہ والوں نے وہاں اذان واقامت کے ساتھ اولاً جماعت کرائی ہو یا اہل محلّہ نے آہستہ اذان دیکر جماعت کروائی ہو۔ اور اگر اہل محلّہ نے بغیر اذان و اقامت کے تکرار کی ، تو یہ بالاتفاق جائز ہے یا اگر مسجد شارع ہے تو بالاتفاق تکرار جماعت جائز ہے، جیسا کہ اس مسجد کا حکم ہے، جس کے لئے امام ومؤذن مقرر نہ ہو اور لوگ اس میں گروہ در گروہ نماز ادا کرتے ہوں، تو وہاں افضل یہ ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی اذان واقامت کے ساتھ الگ الگ نماز پڑھے، جیسا کہ ''امالی قاضی خان ''میں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار ، جلد دوم، ص:246-245،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

فقہائے احناف کا معتمد مذہب یہ ہے کہ دوسری جماعت اذان کے اعادہ کے ساتھ مکروہ ہے اور بلا اعادۂ اذان دوبارہ جماعت کرانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ جماعتِ ثانی جماعتِ اولیٰ کی ھیئت پر نہ ہو،علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

عن أبی یوسف أنه اذالم تکن الجماعةعلی الھیئة الأولی لا تکرہ، والا تکرہ، وھوالصحیح ،وبالعدول عن المحراب تختلف الھیئة۔

ترجمہ: امام ابو یوسف سے روایت ہے، جب جماعت پہلی ہیئت پر نہ ہو، تو مکروہ نہیں ورنہ مکروہ ہے یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر ادا کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد دوم، ص: 246 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے "القطوف الدانیہ لمن احسن الجماعۃ الثانیہ" کے نام سے ایک ہی مسجد میں جماعتِ ثانیہ قائم کرنے کے مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، اس میں آپ نے تقریباً 12 ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام بیان فرمائے ہیں، ان میں آج کل کے حالات کی مناسبت سے چند اہم صورتیں یہ ہیں:

(1) جو مسجد شارع عام، بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، ایئرپورٹ، سرائے وغیرہ کی ہے، جہاں لوگوں کے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں، نئی اذان واقامت کے ساتھ کسی کراہت کے بغیر تکرار جماعت جائز ہے۔

(2) ایک مسجد کسی محلے یا بستی کے لئے ہے، وہاں کچھ اجنبی لوگ یا مسافر اذان واقامت کے ساتھ جماعت کر کے چلے گئے تو اہل محلّہ کے لئے دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اس مسجد میں اقامتِ جماعت انہی لوگوں کا حق ہے، جیسے اصولاً تو نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، لیکن اگر ولی کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں نے نمازِ جنازہ پڑھ لی تو ولی کو اعادہ کا حق ہے۔

(3) محلے یا بستی کی جماعت میں بعض اہل محلّہ نے اذان کے بغیر جماعت کر لی تو اب بھی وہاں اذان واقامت کے ساتھ تکرار جماعت جائز ہے۔

(4) محلے یا بستی کی مسجد میں کچھ لوگوں نے آہستہ اذان دے کر جماعت کرا لی تو اہل

محلّہ کا دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اذان کا اصل مقصد اعلانِ عام ہے، جو آہستہ اذان اول سے حاصل نہیں ہوا۔

(5) یا امام کسی دوسرے مسلک کا ہو، مثلاً شافعی، اوراس کے بارے میں ظن غالب یا یقین ہو کہ وہ بعض فقہی مسائل میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ مسلک حنفی کے مطابق وضو نہیں ہوتا، مثلاً (الف) وہ پچھنا لگوانے کے بعد نماز کے لئے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ب) جسم کی کسی عضو یا مقام سے خون نکل کر بہہ جانے سے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ج) نماز کے اندر قہقہہ لگا کر ہنسنے سے نماز تو بالاتفاق فاسد ہو جاتی ہے، مگر شوافع کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، اور اب شافعی امام ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کے لئے وضو کا اعادہ نہیں کرتا (د) امام شافعی المسلک ہے اور وہ وضو کرتے وقت احتیاط پر عمل کرتے ہوئے چوتھائی سر یا اس سے زیادہ کا مسح نہیں کرتا بلکہ چند بالو ں کے مسح پر اکتفا کرتا ہے، تو ان صورتوں میں چونکہ احناف کے نزدیک وضو یا ہوتا ہی نہیں ہے یا فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس سے نماز ادا نہیں کی جا سکتی، اب اگر کہیں صورت حال ایسی ہے کہ امام شافعی المسلک ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے مقتدی سب کے سب یا اکثر حنفی ہیں اور وہ مندرجہ بالا مسائل میں احتیاط پر عمل نہیں کرتا، تو حنفی اپنی نماز کی حفاظت کے لئے جماعت ثانی کر سکتے ہیں۔

(6) پہلی جماعت میں امام ایسی قرأت کرتا ہے، جو موجب فسادِ نماز ہے۔

(7) ظن غالب یا یقین کی حد تک معلوم ہے کہ پہلی جماعت کا امام توہین الوہیت ورسالت کا مرتکب ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں: ''اب محل نظر صرف ایک صورت رہی کہ مسجد محلّہ میں اہل محلّہ نے باذان واقامت بروجہ سنت امام موافق المذہب سالم العقیدہ، متقی مسائل داں، صحیح

WWW.NAFSEISLAM.COM

خواں کے ساتھ جماعت اولیٰ خالی عن الکراہت ادا کر لی، پھر باقی ماندہ لوگ آئے، انہیں دوبارہ اس مسجد میں جماعت قائم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟، اور ہے تو بکراہت یا بے کراہت، اس بارے میں عین تحقیق وحق وثیق وحاصل انیق ونظر دقیق واثر توفیق یہ ہے کہ اس صورت میں تکرار جماعت باعادہ اذان ہمارے نزدیک ممنوع وبدعت ہے، یہی ہمارے امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب مہذب وظاہر الروایہ ہے، متن متین مجمع البحرین وبحر الرائق علامہ زین میں ہے:

ولا تکررھا فی مسجد محلۃ باذان ثان۔

''مسجد محلّہ میں دوسری اذان کے ساتھ تکرار جماعت جائز نہیں، (البحر الرائق، باب الامامۃ جلد: اول ص: 346)''، (فتاویٰ رضویہ جلد: 7 ص: 125 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا ہے

سوال: 28

میں نماز اور روزے جو عورتوں کی مجبوری کے باعث قضاء ہوتے ہیں ان کے بارے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ رمضان کے روزے قضاء ہوتے تو میں بعد میں پورے کر لیتی تھی اور نماز قضاء بھی ادا کر لیتی تھی، پھر بھی اگر کوئی کفارہ وغیرہ ہو تو بتا دیں۔ آپ سے ایک مسئلہ یہ بھی میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کر لیتی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری راہنمائی فرمائیں اور کوئی کفارہ وغیرہ ادا کرنا ہے یا نہیں جو بھی بہتر ہے مشورہ عنایت فرمائیں، (والدہ محمد رئیس، 865/4 لیاقت آبا

د،کراچی)۔

جواب:

عورتوں کا ایام مخصوصہ میں روزے رکھنا اور نماز پڑھنا حرام ہے ان دنوں میں نمازیں معاف ہیں ان کی قضاء بھی نہیں، روزوں کی قضاء اور دنوں میں فرض ہے۔

حدیثِ مبارک میں ہے: عن معاذة قالت :سألت عا ئشةفقلت :ما بال الحائض تقضي الصوم،ولا تقضي الصلاة؟فقالت :أحرورية أنت؟قلت:لست بحرورية، ولكني اسأل ـقالت كا ن يصيبنا ذلك ، فنؤمر بقضاء الصوم،ولا نؤمر بقضاء الصلاة ـ

ترجمہ: ''معاذہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ حائضہ عورت روزہ تو قضاء کرتی ہے نماز قضاء نہیں کرتی، حضرت عائشہ نے پوچھا کیا تو حروریہ (خوارج میں سے) ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں حروریہ نہیں ہوں محض جاننا چاہتی ہوں، آپ نے فرمایا کہ حیض کے ایام میں ہمیں روزوں کی قضاء کا تو حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا، (صحیح مسلم رقم الحدیث :747)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(منها)ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضي هكذا في الكفاية ـ

ترجمہ: ''(حیض ونفاس کے احکام میں ہے) کہ حیض اور نفاس والی عورت سے نماز ساقط ہو جائے گی اور اس پر اس کی قضاء بھی نہیں۔ ''کفایہ'' میں اسی طرح ہے،

۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: (ومنها)ان يحرم عليهما الصوم

فتقضيا نه هكذا فى الكفاية ۔

ترجمہ:''(حیض ونفاس کے احکام میں ہے)حیض ونفاس والی عورت پر (اس حال میں) روزے رکھنا حرام ہے،اور بعد میں وہ اسکی قضاء کرے گی''کفایہ''میں اسی طرح ہے،(فتاوی عالمگیری جلد 1 ص:38 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

حکم متفق علیہ ہے تمام مسلمانوں کا اسی پر اجماع ہے کہ حیض اور نفاس کی حالت میں عورت پر نماز اور روزہ واجب نہیں ہے۔اور اس پر اجماع ہے کہ اس پر روزہ کی قضاء واجب ہے اور نماز کی قضاء واجب نہیں ہے،ان میں فرق یہ ہے کہ نمازیں زیادہ ہیں اور دن میں بار بار پڑھی جاتی ہیں اس کے برعکس روزے صرف سال میں ایک بار واجب ہوتے ہیں ،یہ حکمت ہمیں معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے ایامِ حیض ونفاس میں خواتین کے لئے تخفیف فرمادی اور ان ایام کی فوت شدہ نمازوں کی قضا واجب نہیں فرمائی۔باقی احکامِ شرعیہ ''تعبدی'' ہوتے ہیں یعنی جیسے اور جس طرح شارع سے ثابت ہیں ،انہیں قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے،اگر ان کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری سعادت ہے اور اگر ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل وفہم کی نارسائی ہے۔

آپ نے جو لکھا ہے کہ ''حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہوجاتے ہیں''،ادائیگیٔ حج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے ،فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم ،زکوۃ کی ادائیگی ،حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے،تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔

نمازِ قصر میں وطن کی اصطلاح

سوال: 29

زید کراچی سے حیدر آباد اپنی فیکٹری میں روزانہ آتا جاتا ہے، وہاں تین نمازوں کا وقت آتا ہے، آیا زید ان نمازوں میں قصر کرے گا یا نہیں؟ نیز بعض علماء نے کہا ہے کہ زید فیکٹری کے قیام کے دوران قصر نہیں کرے گا کیونکہ یہ وطن ترزیق ہے ،آیا وطنِ ترزیق کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟، (مولانا شبیر حسین، کراچی)۔

جواب:

کم از کم مسافتِ سفر "جس کا سفر شروع کرنے سے "قصر" واجب ہو جاتی ہے، وہ مقدارِ سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے)اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ مسافت کے پیمانے بھی بدلتے گئے اور پھر مسافت کو پہلے انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہٰذا عہدِ حاضر کے علماء نے مسافتِ قصر کا اندازہ انگریزی میلوں سے قائم کیا۔ فقہاء کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چوّن میل شرعی ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی اِکسٹھ انگریزی میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احدوعشرون،وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر،

والفتویٰ علی الثانی لانہ الاوسط۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے۔(درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)''۔

لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفر شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہونگے۔

وطن کی دو قسمیں ہیں، وطنِ اصلی، وطنِ اقامت، علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) ھو موطن ولادتہ او تاھلہ او توطنہ۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا وطنِ اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کرکے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کرلے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قولہ: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاھلی و وطن الفطرۃ ح عن القھستانی، قولہ: (او تاھلہ) ای تزوجہ۔

ترجمہ: ''وطنِ اصلی'' کو ''وطنِ اہلی'' اور ''وطن الفطرۃ'' بھی کہا جاتا ہے، اور قہستانی سے منقول ہے کہ (درمختار کی عبارت میں) ''او تاھلہ'' سے مراد شادی کرنا ہے ،(ردالمحتار علی الدر المختار، ج:2، ص:535,536، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

عبارۃ عامۃ المشائخ ان الاوطان ثلثۃ وطن اصلی وھو مولدالرجل اوالبلد الذی

تأھل بہ و وطن سفر و تسمی وطن اقامۃ و ھو البلد الذی ینوی المسافر الاقامۃ فیہ خمسۃ عشر یوما او اکثر و وطن سکنی وھو البلد الذی ینوی الاقامۃ فیہ دون خمسۃ عشر یوما، و عبارۃ عامۃ المحققین من مشائخنا ان الوطن وطنان، وطن اصلی و وطن اقامۃ ولم یعتبروا وطن السکنی وطنا وھو الصحیح ھکذا فی الکفایۃ۔

ترجمہ: ''عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطنِ اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور دوسرا وطنِ سفر اور اسے وطنِ اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطنِ سُکنیٰ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی صرف دو ہی قسمیں ہیں، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت، اور وہ ''وطنِ سکنیٰ'' کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج:1 ص:143 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

خلاصہ کلام یہ کہ زید فیکٹری میں رہتے ہوئے جو نمازیں جماعت کے ساتھ مقیم امام کے ساتھ ادا کرے گا انہیں پوری ادا کرے گا، اگر انفرادی طور پر پڑھے گا تو قصر کرے گا یعنی چار رکعتی نماز دو رکعت پڑھے گا، اور اسے چاہئے کہ حتی الامکان جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تا کہ جماعت کے اجر زائد کے ساتھ امام کی متابعت میں پوری نماز پڑھنے کا موقع ملے۔ وطنِ ترزیق، (یعنی جہاں انسان کا روزگار وابستہ ہو) کی الگ کوئی قسم اس معنی میں نہیں ہے کہ اس پر ''وطنِ اقامت'' سے ہٹ کر کسی

خاص حکم کا اطلاق کیا جاتا ہو۔

اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی

سوال: 30

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اے ایمان والو! جب تمہیں نماز جمعہ کے لئے بلایا جائے تو کاروبار دنیا چھوڑ کر اس کے لئے سعی کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو! اس آیت مبارکہ کی رو سے نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہے، ہمارے ہاں جمعہ کے دن دو اذانیں دی جاتی ہیں، اس سے کون سی اذان مراد ہے پہلی یا دوسری، کیا عہد رسالت میں بھی دو اذانیں دی جاتیں تھیں۔ (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے: یایھا الذین امنو اذانودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع۔ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔

ترجمہ: "اے اہل ایمان! جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لئے اذان دی جائے، تو تم اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو، (الجمعہ:9)"۔

قرآن مجید کی ایک مکمل سورت یوم جمعہ کے نام سے منسوب "سورۃ الجمعہ" ہے، یہ دو رکوعات پر مشتمل ہے، اس کے دوسرے رکوع میں "سعیِ جمعہ" کا حکم ہے، "سعی" کی تفسیر میں چار اقوال ہیں: (1) دل سے نیت کرنا (2) نماز جمعہ کی تیاری کرنا یعنی غسل کرنا (3) اذان کی آواز پر لبیک کہنا (4) نماز کی طرف چل پڑنا، مگر بھاگتے ہوئے نہیں وقار کے ساتھ۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

امام فخر الدین محمد بن عمر ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

''سعی'' کے معنی چل پڑنے کے ہیں، دوڑنے کے نہیں ہیں، نیت سے بھی سعی ہوتی ہے (یہ عمل قلب ہے)، اور کسی کام کی طرف متوجہ ہو جانے کا نام بھی ''سعی'' ہے، لیکن یہاں علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ''سعی'' سے مراد عمل ہے، امام مالک اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔

سورۃ اللیل، آیت: 4 میں ہے: ان سعیکم لشتیٰ، ''تمہارا عمل مختلف ہے''۔

اور رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے: ''جب تم نماز کی طرف آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ، بلکہ سکون (ووقار) کے ساتھ آؤ، اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے لئے تشریف لاتے تو نرم روی سے تشریف لاتے، (تفسیر کبیر، ج: 10 ص: 542، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

ذکر اللہ کی تفسیر میں تین اقوال ہیں: (1) خطبہ میں امام کی نصیحت (2) نماز کا وقت (3) نماز۔ رہا یہ سوال کہ وہ کون سی اذان ہے، جس کے سننے کے بعد نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی ہے، اور خرید و فروخت حرام ہو جاتی ہے؟۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ انصاری قرطبی متوفی 1273ھ لکھتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں باقی نمازوں کی طرح جمعہ کے لئے بھی ایک ہی اذان دی جاتی تھی، اور یہ اذان اس وقت دی جاتی تھی جب رسول اللہ ﷺ ممبر پر (خطبہ دینے کے لئے) بیٹھ جاتے تھے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور کوفہ میں حضرت علی کے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، جب مدینہ منورہ میں آبادی زیادہ ہوگئی تو حضرت عثمان نے وقت زوال (یعنی ظہر کے وقت کی ابتدا) سے ایک اذان کا اضافہ فرمادیا، یہ اذان مقام ''زوراء'' پر ان کے مکان پر دی جاتی تھی، جو بازار میں تھا اور منارے کی طرح

بلند تھا، لوگ (یہ پہلی اذان) سن کر چل پڑتے، پھر جب حضرت عثمان منبر پر بیٹھتے تو رسول اللہ ﷺ کے مؤذن (دوسری) اذان دیتے اور آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں علامہ ماوردی نے (حضرت عثمان کی اضافہ کردہ) اس اذانِ اول کو بدعت قرار دیا ہے، لیکن حضرت عثمان نے شہر کے پھیلاؤ اور آبادی کی کثرت کی بنا پر ایسا کیا تاکہ لوگ تیار ہو کر خطبہ کے لئے پہنچ سکیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بازار میں مسجد کی طرف جانے کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد کی جانب چل پڑیں اور جوں ہی لوگ مسجد میں جمع ہوتے (تو خطبے کے وقت) اذان دلاتے تھے، (الجامع لاحکام القرآن، ج: 18، ص: 100، مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

نوٹ: عہدِ رسالت مآب ﷺ میں چونکہ مدینہ منورہ کی آبادی محدود تھی، اس لئے اذانِ خطبہ سنتے ہی لوگوں کا پہنچنا آسان تھا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی متوفی: 1270ھ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''(کہ جب حضرت عثمان نے اذانِ اول کا اضافہ فرمایا) تو کسی نے آپ کو ملامت نہیں کیا، (یعنی اس سے ثابت ہوا کہ اس اذانِ اول کے اضافہ کو تمام صحابہ کرام نے تراویح کی جماعت کی طرح بدعتِ حسنہ تسلیم کرلیا تھا، کیونکہ اس کا مقصد، شریعت کی منشاء کا احسن وکامل طریقے سے حصول تھا)، روح المعانی، ج: 28، ص: 98، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اسی مقام پر آگے چل کر علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک صحیح ترین یہ ہے کہ (جس اذان کو سننے پر) سعی جمعہ واجب ہوتی ہے، اس سے مراد اذانِ اول ہے، کیونکہ اس کا مقصد نمازِ جمعہ'' کی تیاری کا'' اعلان

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہے"۔

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی 1088ھ لکھتے ہیں:

"(ووجب السعی الیھا وترک البیع)۔۔۔۔۔۔۔(بالاذان الاول)فی الاصحّ وان لم یکن فی زمن الرسول ﷺ بل فی زمن عثمان"۔

ترجمہ:"زیادہ صحیح یہ ہے کہ پہلی اذان کے بعد جمعہ کے لئے سعی کرنا واجب ہے،اگرچہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی،حضرت عثمان کے زمانے میں شروع ہوئی"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

"وحاصلہ ان السعی نفسہ فرض والواجب کونہ فی وقت الاذان الاول"۔

ترجمہ:"اس (عبارت کا) حاصل یہ ہے کہ فی نفسہ"سعیِ جمعہ"فرض ہے اور اس کا وجوب اذان اول کے وقت سے شروع ہوتا ہے"،آگے چل کر لکھتے ہیں:قال فی" شرح المنیہ): واختلفوا فی المراد بالاذان الاول:فقیل الاول باعتبار المشروعیة وھو الذی بین یدی المنبرلانہ الذی کان اولافی زمنہ علیہ الصلاۃ والسلام وزمن ابی بکروعمر حتیٰ احدث عثمان الاذان الثانی علی "الزوراء" حیث کثر الناس۔ والاصح انہ الاول باعتبار الوقت ،وھوالذی یکون علی المنارۃ بعد الزوال"۔

"شرح المنیہ"میں کہا:فقہاء کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اذانِ اوّل کونسی ہے،ایک قول یہ ہے کہ اس سے وہ اذان مراد ہے جو مشروعیت کے اعتبار سے اوّل ہے اور یہ وہ ہے جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت

عمر رضی اللہ عنھما کے زمانے میں یہی اذانِ اول تھی، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تو آپ نے مقام ''زوراء'' پر دوسری اذان شروع کرائی اور صحیح ترین قول یہ ہے کہ وقت کے اعتبار سے یہی (مقام زوراء والی اذان) اول ہے، جو زوال کے بعد منارہ پر دی جاتی تھی، (ردالمختار ،ج:3،ص:35،داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عہد رسالت ﷺ اور عہدِ شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنھما) میں جمعہ کے لئے ایک ہی اذان دی جاتی تھی جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت اس کے سامنے دی جاتی تھی، اور اسی وقت سے جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی تھی اور خرید وفروخت حرام ہو جاتی تھی۔ لیکن عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ میں جب جمعے کے لئے ابتدائے وقت میں مقام ''زوراء'' پر پہلی اذان شروع ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا اس پر نکیر یا اختلاف ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ بدعتِ حسنہ قرار پائی۔

(3) اس پر اب تعامل ہے اور اسی سے جمعہ کے لئے سعی کا وجوب اور کاروبار کا ترک واجب ہو جاتا ہے، آبادی کے پھیلاؤ اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے اگر اذانِ ثانی سے سعی کے وجوب اور کاروبار کے ترک کرنے کا قول کیا جائے تو اکثر صورتوں میں جمعہ کے خطبۂ واجب کا استماع (سننا) چھوٹ جاتا ہے اور بعض صورتوں میں نماز کی تکبیر تحریمہ یا ایک رکعت بھی چلی جاتی ہے۔ اور حدیث پاک میں ہے کہ امام جب خطبے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسجد کے دروازے پر فرشتے جن نورانی رجسٹروں میں آنے والے نمازیوں کے اسماء ترتیب کے ساتھ لکھتے ہیں اور اسی ترتیب کے مطابق ان کے اجر کے درجات ہیں، وہ رجسٹر بند ہو جاتے ہیں اور دیر سے آنے والے نمازی نورانی رجسٹروں میں ناموں کے اندراج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا اگرچہ اذان

ثانی کے ساتھ "سعیِ جمعہ" کے وجوب پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن ہمارے بعض فقہائے احناف نے اذانِ اول سے "سعیِ جمعہ" کے وجوب کے قول کو اَصَحّ (صحیح ترین) قرار دیا ہے، لوگوں کی سستی اور غفلت کو دیکھتے ہوئے عمل کے لئے یہی بہتر ہے، اگرچہ دوسرا قول بھی صحیح ہے۔

خطبۂ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت

سوال: 31

خطبۂ جمعہ وعیدین میں پہلے خطبہ کے دوران ہاتھ باندھ کر بیٹھنا اور دوسرے خطبہ میں ہاتھ کھول کر (یعنی بحالتِ تشہّد) بیٹھنا، شرعی اعتبار سے اس کی کیا حقیقت ہے؟، (حافظ غلام مرتضٰی سیالوی، ضلع اٹک)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: واذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبياً او متربصاً او كما تيسّر لانه ليس بصلاةٍ عملاً و حقيقةً كذا فى المضمرات ـ ويستحب ان يقعد فيها كما يقعد فى الصلاة كذا فى المعراج الدراية ـ

ترجمہ: "جب کوئی شخص دورانِ خطبہ (مسجد میں) آئے تو (اسے رخصت ہے) چاہے تو اکڑوں بیٹھے (یعنی اس طرح کہ ایک تہبند میں ہو اور دونوں گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیا ہوا ہو) یا آلتی پالتی مار کر (چار زانوں) بیٹھے یا جس ہیئت میں وہ آسانی محسوس کرے، کیونکہ خطبہ عملاً اور حقیقۃً نماز نہیں ہے، "مضمرات" میں اسی طرح ہے، اور مستحب یہ ہے کہ دورانِ خطبہ اسی طرح بیٹھے جیسے نماز میں (حالتِ تشہّد) میں بیٹھتا ہے، "معراج الدرایہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری،

جلد 1، ص: 148، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔ بعض لوگ خطبۂ اولیٰ کو حالت تشہد میں ہاتھ باندھ کر بیٹھے ہوئے سنتے ہیں، یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ بس دونوں خطبوں کے دوران حالت تشہد میں بیٹھنا مستحب اور کسی بھی دوسری مناسب ہیئت پر بیٹھنا جائز ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ دو خطبوں کے درمیان امام ومقتدی بغیر ہاتھ اٹھائے یا ہاتھ اٹھا کر دعا کریں یا نہ کریں، تو امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

مختصراً بالجملہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دعائے مذکور خطیب کے لئے مطلقاً اور سامعین کے لئے بالاتفاق جائز، اور مذہب امام شافعی وقول امام ابی یوسف پر ان کے لئے زبان سے بھی قطعاً اجازت اور ارشاد امام کی ایک تخریج پر مکروہ، دوسری پر جائز، ائمۂ فتویٰ نے دونوں کی تصحیح کی، تو احد الصحیحین (یعنی دونوں صحیح روایتوں) پر دعائے مذکور امام ومقتدین سب کو دل وزبان ہر طرح سے باتفاق مذہبین حنفی وشافعی مطلقاً جائز ومشروع اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ جب ترجیح مختلف متکافی (برابر درجے کی ہو) ہو تو مکلّف کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے، اصلاً محل اعتراض وانکار نہیں، بحرالرائق ودرمختار میں ہے: متیٰ کان فی المسئلۃ قولان مصححان جاز القضاء والافتاء باحدھما۔ ترجمہ: "جب کسی خاص مسئلے میں دو ایسے قول ہوں جن میں سے ہر ایک کو صحیح قرار دیا گیا ہو، تو ان میں کسی بھی ایک کے جواز پر فیصلہ دینا اور فتویٰ دینا دونوں جائز ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 490، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

عیدین ونمازِ جمعہ میں خطبہ سننا واجب ہے، ہر وہ کام جو نماز میں منع ہے، دورانِ خطبہ بھی جائز نہیں، سماعت کے لئے توجہ اور یکسوئی لازم ہے۔ امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث

نقل فرماتے ہیں:عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ:من توضأ فأحسن الوضوء ثمّ أتی الجمعة فاستمع و أنصت غفر له مابینه وبین الجمعة وزیادة ثلاثة أیام و من مسّ الحصی فقد لغا ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح سے وضو کیا، پھر جمعہ پڑھنے آیا اور خاموشی سے خطبہ سنا، اِس جمعہ سے لے کر گذشتہ جمعہ تک کے اُس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، (اس کے علاوہ) مزید تین دن کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اور فرمایا: جس شخص نے کنکریاں چھوئیں اس نے لغو کام کیا، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس حدیث کی شرح میں علامہ یحیٰ بن شرف النووی لکھتے ہیں: قوله صلی اللّٰہ علیه وسلم (و من مس الحصا فقد لغا)فیه النهی عن مس الحصا و غیره من أنواع العبث فی حالة الخطبة وفیه اشارة الی اقبال القلب والجوارح علی الخطبة ۔

ترجمہ:''حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:اور جس نے کنکریوں کو چھوا، اس نے لغو کام کیا۔اس فرمانِ رسول ﷺ میں اس طرف اشارہ ہے کہ خطبے کے دوران انسان اپنے قلب اور ظاہری حالت سے مکمل خطبے کی طرف متوجہ ہو، (صحیح مسلم بشرح الامام النووی،جلد 2،الجزءالسادس،ص:,146 147 مطبوعہ:مکتبۃ الغزالی، دمشق)''۔

سماعِ خطبہ کے متعلق احادیث میں سخت تاکید وارد ہوئی ہے: عن ابن شهاب قال: أخبرنی سعید بن المسیب : ان ابا هریرة أخبره : انّ رسول الله ﷺ قال: "اذا قلت لصاحبك یوم الجمعة أنصت ۔ والامام یخطب ۔ فقد لغوت "۔

ترجمہ:''ابن شہاب فرماتے ہیں کہ سعید بن مسیّب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: جب جمعہ کے دن خطبۂ جمعہ کے

دوران تُو نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ: چپ رہو تو تُو نے لغو کام کیا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 934)"۔

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قال لصاحبہ یوم الجمعۃ صہ فقد لغا و من لغا فلیس فی جمعتہ تلک شئی۔

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعے کے دن اپنے ساتھی سے کہا "چپ رہو" تو اُس نے لغو کام کیا اور جس نے لغو کام کیا اس کے لئے اس جمعہ میں کچھ اجر نہیں، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث:)"۔

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ: من یتکلم یوم الجمعۃ والامام یخطب فھو کمثل الحمار یحمل اسفاراً و الذی یقول لہ انصت لیس لہ جمعۃ۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن اُس وقت کلام کرے، جب امام خطبہ دے رہا ہو، تو وہ اس گدھے کی مانند ہے، جس پر کتابیں لدی ہوں، اور جو اس سے کہے "چپ ہو جا"، اس کا جمعہ نہیں، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص: 230، مطبوعہ: دارالفکر، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے دورانِ خطبۂ جمعہ بات کرنے یا کوئی عمل کرنے سے متعلق سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا:

"عامۂ کتب مذہب میں صاف تصریح ہے کہ جو فعل نماز میں حرام ہے، خطبہ ہونے کی حالت میں بھی حرام ہے، خلاصہ و عالمگیریہ و متن و شرح تنویر کی عبارات خزانۃ المفتیین بعینہا عبارتِ خلاصہ ہے اور اسی سے بحر و حاشیۃ البحر للعلامۃ الشامی میں بہ نقل نہر

ماثور، وجیز کردری میں ہے: مایحرم فی الصلوٰۃ یحرم فی الخطبۃ کالاکل والشرب حال الخطبۃ۔ ترجمہ: ''جو کچھ نماز میں حرام ہے، خطبہ میں بھی حرام ہے، مثلاً خطبہ کے دوران کھانا اور پینا''۔

شرح منیہ امام محمد ابن امیر الحاج حلبی میں ہے:

کما یکرہ الکلام بانواعہ یکرہ ما یجری مجراہ من کتابۃ ونحوھا مما یشغل من سماعھا حتی ان فی شرح الزاھدی ویکرہ لمستمع الخطبۃ مایکرہ فی الصلوٰۃ کالاکل والشرب والعبث والالتفات۔

ترجمہ: ''جیسے ہر طرح کی گفتگو منع ہے ویسے ہی اس کے قائم مقام مثلاً کتابت وغیرہ جو خطبہ کے سماع میں خلل ڈالے حتی کہ شرح الزاہدی میں ہے کہ خطبہ کے سامع کے لئے ہر وہ شے مکروہ ہے جو نماز میں مکروہ ہے مثلاً کھانا پینا، عبث فعل اور کسی طرف متوجہ ہونا وغیرہ۔ اسی طرح علامہ سید احمد مصری نے حاشیۂ شرح نور الایضاح میں بحوالۂ شرح الکنز للعلامۃ عمر بن نجیم وشرح القدوری لمختار بن محمود سے نقل کیا، شرح نقایہ علامہ محمد قہستانی میں ہے: کما منع الکلام منع الاکل والشرب والعبث والالتفات والتخطی وغیرھا مما منع فی الصلوٰۃ کما فی جلابی۔ ترجمہ: ''جس طرح (دورانِ خطبہ کلام منع ہے) اسی طرح کھانا پینا عبث کام، کسی اور طرف متوجہ ہونا اور گردن پھلانگنا جو کہ نماز میں ممنوع ہیں جیسا کہ جلابی میں ہے۔ متن وشرح علامہ حسن شرنبلالی میں ہے: (کرہ لحاضر الخطبۃ الاکل والشرب) وقال الکمال یحرم (والعبث والالتفات) فیجتنب مایجتنبہ فی الصلوٰۃ۔ ترجمہ: ''(خطبہ میں حاضر شخص کے لئے کھانا پینا مکروہ ہے) کمال نے کہا حرام ہے (بے فائدہ کام اور کسی اور طرف متوجہ ہونا) پس ہر شے سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے

نماز میں اجتناب کیا جاتا ہے۔ غنیۃ شرح منیہ للعلامہ ابراہیم الحلبی میں ہے:

الاستماع والانصات واجب عندنا وعند الجمهور حتی انه یکره قراءة القرآن ونحوها ورد السلام وتشمیت العاطس وکذا الاکل والشرب وکل عمل۔

ترجمہ: ''خطبہ سننا اور اس کی طرف متوجہ ہونا ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک واجب ہے حتیٰ کہ اس کے دوران قراءتِ قرآن وغیرہ، سلام کا جواب، چھینک کا جواب مکروہ ہے اور اسی طرح کھانا پینا اور ہر عمل کا یہی حکم ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 330,331، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

نمازِ جمعہ کے بعد طویل دعا

سوال: 32

جمعہ کی نماز کے فوراً بعد کچھ لوگ سنتیں پڑھنے کھڑے ہوجاتے ہیں اور امام صاحب دعا مانگ رہے ہوتے ہیں اور جو لوگ نمازِ جمعہ کے فوراً بعد نکلنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی رکاوٹ بنتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے کیا حکم ہے؟ نیز امام صاحب جو اتنی لمبی دعا کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟، (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سنتیں ہیں، یعنی ظہر وجمعہ ومغرب وعشاء مختصر دعا کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ 'بعد نمازِ جمعہ انحرافِ قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں''۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: ''امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سنت ہے اور

اس کا ترک یعنی بعد سلام قبلہ رُو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا ومناجات بھی بالاجماع جائز ہے مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر وجمعہ ومغرب وعشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگرچہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔ اقول ویمکن الاستیناس له بقوله عزوجل "واذا کانوا معه علی امر جامع لم یذهبوا حتی یستأذنوه "فان فراغه من الدعاء بعد اذنامنه دلالة بذلك العرف جار۔

ترجمہ: "(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشادگرامی سے استدلال ممکن ہے "اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہئے اگرچہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر وعصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: "حدیث میں ہے حضور پُرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

ان لربکم فی ایام دهرکم نفحات، فتعرضوا له لعله ان یصیبکم نفحة منها فلا تشقون بعدها ابدا۔ رواه الطبرانی فی الکبیر عن محمد بن مسلمة رضی اللّٰه تعالیٰ عنه۔ ترجمہ: "بیشک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ایام زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں، جن میں رحمتِ باری تعالیٰ کے جھونکے آتے ہیں، تو انہیں پانے کی

تدبیر کرو، شاید ان میں سے کوئی مبارک لحہ تمہیں نصیب ہو جائے تو پھر کبھی بدبختی تمہارے پاس نہ آئے ،اسے طبرانی نے کبیر میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

اور خود حدیث نے اُن اوقات میں سے ایک وقت ''اجتماع مسلمین'' کا نشان دیا کہ ایک گروہِ مسلمان جمع ہو کر دعا مانگے ،کچھ عرض کریں ،کچھ آمین کہیں ،کتاب المستدرک علی البخاری ومسلم میں ہے:عن حبیب بن مسلمة الفهری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و کان مستجاب الدعوات قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یجتمع ملأ فیدعوا بعضهم الا اجابهم اللہ۔

ترجمہ:''حبیب بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ مستجاب الدعوات تھے،فرماتے ہیں:میں نے حضور پر نور سید عالم ﷺ کو فرماتے سنا کہ جب بھی کوئی جماعتِ مسلمین جمع ہو اور ان میں سے بعض دعا کریں اور بعض آمین کہیں،تو اللہ عزوجل ان کی دعا قبول فرمائے گا۔

علماء نے مجمعِ مسلمین کو اوقاتِ قبولیتِ دعا میں شمار کیا ہے۔حصن حصین میں ہے: واجتماع المسلمین یعنی مسلمانوں کا اجتماع اوقاتِ اجابت سے ہونا حدیثِ صحاح ستہ سے مستفاد ہے،علامہ علی القاری شرح میں فرماتے ہیں: ثم کل مایکون الاجتماع فیه اکثر کالجمعة والعیدین وعرفة یتوقع فیه رجاء الاجابة اظهر۔یعنی جس قدر مجمع کثیر ہوگا جیسے جمعہ وعیدین وعرفات میں،اسی قدر قبولیت دعا کی امید بہت زیادہ ہوگی ۔(فتاویٰ رضویہ جلد 8،ص:522,523 رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)''۔

لہٰذا جہاں پہلے سے یہ امر معروف ومعتاد ہے کہ جمعہ کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے،

وہاں لوگوں کی اکثریت کا احترام کرنا چاہئے ۔آخر خطبہ جمعہ وعید کے وقت سنتیں یا نوافل پڑھنے کی ممانعت بھی اسی احترام کے سبب مشروع ہے ۔اور اگر دعا کرنے والوں کے درمیان سے کوئی شخص کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر جانا چاہے ،تو اس کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے،البتہ اگر سنتیں وہیں پڑھنی ہیں تو اختتامِ دعا کا انتظار کرلے ۔

کپڑا لٹکا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم

نماز میں "کفِ ثوب ،جرِّ ثوب اور اسبالِ ازار" کا حکم

محترم جناب مفتی صاحب روزنامہ ایکسپریس کی وساطت سے دو اہم مسائل پیش کرتا ہوں،جن کی معاشرے میں اصلاح کرنا فرضِ عین ہے ۔

سوال: 33

دورانِ نماز اور علاوہ نماز شلوار کو نیفے سے دوہرا اور پتلون پہنی ہو تو پائنچوں سے دہرا کرنا شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیونکہ ٹخنوں کو ڈھانپنا دوزخ کی طرف لے جاتا ہے،اگر شلوار یا پتلون لمبی ہو تو کیا کیا جائے حالانکہ اس کی نیت میں تکبر بھی نہیں ہے ازراہِ کرم حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں ،(حاجی عبدالشکور میر ،راولپنڈی)۔

جواب:

نوٹ:اس مسئلے میں بعض حضرات بہت زیادہ شدّت کرتے ہیں اور دوسروں سے نفرت اور تعلّی کرتے ہیں ،یعنی اپنے تقوے اور پارسائی کا زیادہ ہی کچھ اظہار کرتے ہیں،خالص شرعی ودینی مسئلے میں توازن اور راہِ اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں،اس کے نتیجے میں بعض لبرل مزاج کے لوگ اسلام اور اہل دین پر طعن کرتے ہیں کہ ان کا

WWW.NAFSEISLAM.COM

فہم اسلام فقط نماز میں شلوار و پائنچے کی لمبائی چیک کرنے تک ہے، گرد و پیش میں جو اور بڑی برائیاں، ظلم و تعدّی، استحصال، لوٹ کھسوٹ، ناجائز نفع خوری، رشوت خوری حقوق انسانی کی پامالی، قتل و غارت اور دہشت گردی انہیں نظر نہیں آتی، نہ ہی وہ اِن قومی اور معاشرتی جرائم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، خاص طور وہ دعوت و تبلیغ کی جماعتیں جنہوں نے نماز کو اسلام کا ایک اساسی رکن سمجھنے کے بجائے کل دین سمجھ لیا ہے اور دین کے باقی شعبہ جات کی دعوت و تبلیغ تو جیہات اور ترجیحات کا محور نہیں ہیں۔

لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک بار پھر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو مع دلائل (احادیث و فقہ) تفصیل سے بیان کر دیا جائے، کسی شخص کو خود شارع بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، کسی معاملے میں جو صحیح دینی مسئلہ ہے وہ بیان کر دینا چاہئے، اپنی طرف سے کسی مسئلے کی شدت یا حرمت میں اضافہ درست نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک شلوار کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، تمام پر ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

عن ابی هريرة رضى الله عنه عن النبى ﷺ قال: "وما اسفل من الكعبين من الازار ففى النار"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ازار کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو وہ جہنم میں ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5787)''۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

عن ابی ہریرۃ: ان رسول اللہ ﷺ قال: "لا ینظر اللہ یوم القیامۃ الی من جر ازارہ بطرا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف قیامت کے روز نظر بھی نہیں فرمائے گا، جو ازراہ تکبر اپنی ازار (تہبند) کو گھسیٹ کر چلتا ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5788)''۔

عن ابی ہریرۃ قال: بینما رجل یصلی مسبلاً ازارہ اذ قال لہ رسول اللہ ﷺ: "اذھب فتوضا"، فذھب فتوضا فقال لہ رجل: یارسول اللہ، مالک امرتہ ان یتوضا؟ قال: "انہ کان یصلی وھو مسبل ازارہ، وان اللہ جل ذکرہ لا یقبل صلاۃ رجل مسبل ازارہ"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں ایک شخص تہبند لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا، نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: جا کر وضو کرو، اس نے جا کر وضو کیا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اس کو وضو کرنے کا حکم کیوں دیا؟ آپ نے فرمایا: یہ شخص تہبند لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 638)''۔

تکبر کے بغیر یا اتفاقاً ٹخنے کے نیچے ازار لٹکنے کی رخصت کے متعلق احادیث:

عن سالم بن عبداللہ، عن ابیہ رضی اللہ عنہ، عن النبی ﷺ قال: "من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ"۔ قال ابوبکر: یارسول اللہ، ان احد شقی ازاری یسترخی، الا ان اتعاھد ذلک منہ؟ فقال النبی ﷺ: "لست ممن یصنعہ خیلاء"۔

ترجمہ: ''حضرت سالم بن عبداللہ اپنے والد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو تکبر کے باعث کپڑا گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا۔ حضرت ابوبکر عرض گزار ہوئے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میری چادر کا ایک سرا غیر ارادی طور پر لٹک جاتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ ہمہ وقت ادھر متوجہ رہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کے باعث ایسا کرتے ہیں، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5784)"۔

عن ابی بکرة رضی اللّٰه عنه قال: خسفت الشمس ونحن عندالنبی ﷺ، فقال یجر ثوبه مستعجلا، حتی اتی المسجد، وثاب الناس فصلی رکعتین فجلی عنها، ثم اقبل علینا، وقال: "ان الشمس و القمر ایتان من ایات اللّٰه، فاذا رأیتم منها شیئا فصلُّوا، وادعوا اللّٰه حتی یکشفها"۔

ترجمہ: "حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورج کو گرہن لگا اور ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ آپ جلدی سے کپڑا گھسیٹتے ہوئے اُٹھے یہاں تک کہ مسجد میں پہنچ گئے اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جب تم انہیں گہن لگا ہوا دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، یہاں تک کہ وہ پورا نظر آنے لگے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5785)"۔

حدثنا شعبة قال: لقیت محارب بن دثار علی فرس، وهو یاتی مکانه الذی یقضی فیه، فسالته عن هذا الحدیث فحدثنی فقال: سمعت عبد اللّٰه بن عمرَرضی اللّٰه عنهما یقول: قال رسول اللّٰه ﷺ: "من جرّ ثوبهٗ مُخیلة لم ینظرِ اللّٰه الیه یومَ القیامة"۔ فقلت لمحارب: اذکرازاره؟ قال: ماخص ازاراً

ولا قميصا۔ تابعه جبلة بن سحيم، وزيد بن اسلم، وزيد بن عبداللہ، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ۔ وقال الليث ، عن نافع، عن ابن عمر: مثله۔ و تابعه موسیٰ بن عقبة، وعمربن محمد، وقدامة بن موسی، عن سالم، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ: "من جرثوبۂ خیلاء"۔

ترجمہ:''شعبہ کا بیان ہے کہ میں مُحارب بن دثار (قاضی کوفہ) سے ملا جبکہ وہ گھوڑے پرسوار ہو کر عدالت کی طرف جا رہے تھے،تو میں نے ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ازراہ تکبر کپڑا گھسیٹ کر چلے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا، میں نے مُحارب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے ازار کا ذکر کیا؟ فرمایا کہ ازار یا قمیص کی تخصیص نہیں کی۔ جبلہ بن سحیم زید بن اسلم اور زید بن عبداللہ،حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے اسی کی روایت کی ہے۔موسیٰ بن عقبہ،عمر بن محمد،قدامہ بن موسیٰ ، سالم،حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ جو اپنا کپڑا بطور تکبر گھسیٹ کر چلے گا،(صحیح بخاری رقم الحدیث: 5791)''۔

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنهما قال: قال رسول اللہ ﷺ: ''من جرثوبة خيلاء، لم ينظر اللہ اليه يوم القيامة"۔ فقال ابو بكر: ان احدشقی ثوبی يسترخی،الا ان اتعاهد ذلك منه؟ فقال رسول اللہ ﷺ: "انك لست تصنع ذلك خيلاء"۔ قال موسیٰ: فقلت لسالم: اذكرعبد اللہ : من جرازاره؟ قال لم اسمعه ذكر الا ثوبه۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا:۔جو ازراہِ تکبر کپڑا گھسیٹے گا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔حضرت ابو بکر کہنے لگے کہ میرے کپڑے کا ایک کونہ عموماً لٹک جاتا ہے،لہٰذا اب میں احتیاط کیا کروں گا،پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسا ازراہِ تکبر نہیں کرتے۔موسیٰ بن عقبہ نے سالم سے دریافت کیا کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر نے ''من جرّازارہ'' (یعنی جو شخص اپنی تہبند کو گھسیٹے) کہا ہے؟جواب دیا:میں نے یہ الفاظ نہیں سنے، بلکہ میں نے تو یہ سنا کہ انہوں نے ''ثوبہٗ'' (یعنی مطلقاً کپڑا گھسیٹے ہوئے چلنے کی بابت) کہا ہے(صحیح بخاری رقم الحدیث:3665)۔

عن ابن عباس قال: أُمر النبی ﷺ أن یسجد علی سبعة ، ونھی أن یکف شعرہ وثیابه ۔قال ابو الربیع:علیٰ سبعة أعظم ، ونھی أن یکف شعرہ وثیابه ، الکفّین والرکبتین والقدمین والجبھة۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا اور نماز کی حالت میں بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا ہے،ابو الربیعہ کی روایت میں سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت کا ذکر ہے،وہ سات ہڈیاں یہ ہیں ،دو ہتھیلیاں ،دو گھٹنے،دونوں قدم اور پیشانی،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:1076)۔

اس حدیث میں ''کفِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا،پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے اوپر موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں،اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں،اس پر بھی ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث

مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ عینی لکھتے ہیں: من جرازاره من غیر قصد التخیُّل فانه لا باس به من غیر کراهة و کذالك یجوز لدفع ضرر یحصل له کان یکون تحت کعبیه جراح او حکة او نحو ذلك ان لم یغطها تؤذیه الهوام کالذباب ونحوه بالجلوس علیها ولا یجد مایسترها به الاازاره او ردائه اوقمیصه وهذا کما یجوز کشف العورة للتداوی وغیر ذلك۔

ترجمہ: ''جس شخص نے بغیر قصد تکبر کے تہبند ٹخنوں کے نیچے باندھا اس میں کوئی کراہت نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے، اسی طرح کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے بھی ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانا جائز ہے، مثلاً اس کے ٹخنوں کے نیچے کوئی زخم ہو یا خارش ہو یا اگر وہ ٹخنوں کو نہ ڈھانپے تو اس پر مکھیاں اور حشرات الارض کے بیٹھنے کا خطرہ ہو اور لمبی قمیص یا لمبا تہبند اور کوئی چیز ڈھانپنے کے لئے میسر نہ ہو۔

علامہ عینی مزید لکھتے ہیں: انه لا حرج علی من یجر ازاره بغیر قصد کما ذکرنا ه فان قلت روی ابن ابی شیبة عن ابن عمر انه کان یکره جر الازار علی کل حال قلت قال ابن بطال هومن تشدیداته والا فقدروی هو حدیث الباب فلم یخف علیه الحکم۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اپنے تہبند کے ایک جانب پھسل جانے کا ذکر کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، (یعنی تم پر اس وعید کا اطلاق نہیں ہوتا)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا تہبند بلا قصد پھسل جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر حال میں تہبند لٹکانے کو مکروہ کہتے تھے، اس کے جواب

WWW.NAFSEISLAM.COM

میں علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر کی تشدیدات (یعنی احتیاط کی بناپر کسی مسئلے میں شدت کرنا) میں سے ہے ورنہ حضرت ابن عمر تو خود اس حدیث کے راوی ہیں ان سے یہ حکم کیسے مخفی ہوسکتا ہے ، (عمدۃ القاری ،جلد 21 ص: 296 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ،مصر)''۔

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں:لدلالۃ ظواھر الاحادیث علیھا فان کان للخیلاء فھو ممنوع منع تحریم والا فمنع تنزیہ۔

ترجمہ:''بخاری کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکبر کے ساتھ کپڑا لٹکا کر چلنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر تکبر کی نیت سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، (مرقات ،جلد 8 ص: 239 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ،ملتان)''۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:اگر کوئی شخص تکبُّر ،اِسراف اور طغیان (سرکشی) کی نیت سے اپنے تہبند کو لمبا بناتا ہے اور اس کو گھسیٹتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف لطف وعنایت کی نظر نہیں فرمائے گا۔اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر تہبند اس طرح نہ ہو تو حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے،اور اگر کوئی عذر ہو مثلاً سردی ہو یا کوئی بیماری ہو (مثلاً ٹخنے کے نیچے کوئی زخم ہو جس پر مکھیاں بیٹھتی ہوں ان سے زخم کو بچانے کے لئے ٹخنہ ڈھانپے) تو بالکل مکروہ نہیں ہے ،(اشعۃ اللمعات ،جلد 3 ص: 536، 537 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنو)''۔

مزید لکھتے ہیں: حرام وہ صورت ہے جب کوئی شخص عُجب اور تکبُّر سے کپڑا لٹکائے ،۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: طعام اور لباس میں توسیع ،اِسراف اور تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر مباح ہے ،(اشعۃ اللمعات ،جلد 3 ص: 555،555 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنو)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: فی الخلاصة ان یکرہ کذا فی شرح مُنیة المصلّی ویدخل ایضاً فی کف الثوب تشمیر کمه کما فی فتح القدیر وظاهره الاطلاق وفی الخلاصة ومنیة المصلی قید الکراهة بان یکون رافعاً کمیه الی المرفقین وظاهره انه لا یکره اذا کان یرفعها الی مادونها والظاهر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل وذکر فی المجتبیٰ فی کراهیة تشمیة الکمین قولین ۔

ترجمہ: ''خلاصہ میں مذکور ہے کہ نمازی کا کپڑا موڑنا مکروہ ہے، اسی طرح ''شرح منیۃ المصلی'' میں ہے اور کپڑا موڑنے میں آستینوں کا اُڑسنا بھی شامل ہے اسی طرح ''فتح القدیر'' میں ہے اور یہ بظاہر مطلق ہے، لیکن ''خلاصہ'' اور ''منیۃ المصلی'' میں ہے کہ اگر آستینوں کو کہنیوں تک چڑھالیا تو مکروہ ہوگا اور کہنیوں سے کم تک آستین چڑھائی ہیں تو مکروہ نہیں ہوگا، لیکن تحقیق یہ ہے کہ ہر حال میں مکروہ ہوگا کیونکہ کپڑا موڑنے کا اطلاق ہر صورت پر آتا ہے اور ''مجتبیٰ'' میں آستین چڑھانے کی کراہت کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں، (یعنی ایک کراہت کا اور دوسرا عدمِ کراہت کا)، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 24، مطبوعہ طبعہ علمیہ، مصر)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (و) کره (کفه) أی رفعه ولو لتراب کمشمر کم أو ذیل (وعبثه به) أی بثوبه۔

ترجمہ: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔''

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: أی کما لو دخل فی الصلاة وهو مشمّر کمه أو ذیله، وأشار بذلك الی أن الکراهة لا تختص بالکف

وھو فی الصلاۃ ، کما افادہ فی "شرح المنیۃ "لکن قال فی "القنیۃ":و اختلف فیمن صلی وقد شمر کمیہ لعمل کان یعملہ قبل الصلاۃ أو ھیئتہ ذلک ومنہ مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراک الرکعۃ مع الامام ۔واذا دخل فی الصلاۃ کذلک وقلنا بالکراھۃ فھل الافضل إرخاءُ کمیہ فیھا بعمل قلیل أو ترکھما ؟الم أرہٗ: والأظھر الأول بدلیل قولہ الآتی : "ولو سقطت قلنسوتہ فاعادتھا أفضل "تأمل۔

ترجمہ:"یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا،اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے،جیسا کہ "شرح المنیہ" سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔لیکن "القنیہ" میں کہا ہے کہ:"اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے۔" اور انہی میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائے،پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کرے اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہو جائے،تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے،تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے،میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا،لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)،اس کی دلیل علامہ حصکفیؒ کے اس قول سے ملتی ہے کہ: "اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے،غور کیجئے"۔

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:وقید الکراھۃ فی "الخلاصۃ "و "المنیۃ

"بأن يكون رافعاً كميه الى المرفقين ـ وظاهره أنه لا يكره الى مادونهما ـ

قال في "البحر": والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل ـ

ترجمہ: ''خلاصہ'' اور ''منیہ'' میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ ''کفِ ثوب'' تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔ (ردالمحتار جلد: 2ص: 350، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا'' آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟'' جواب دیا: ''ضرور مکروہ اور سخت وشدید مکروہ ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص: 311، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔

مفتی محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی لکھتے ہیں:

قوله من جرّ ازاره بَطَراً اى تكبراً و فرحاً وطغياناً ويفهم ان جرّهٗ بغيرذالك لايكون حراما لكنه مكروه كراهة تنزيه۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: جو شخص تکبر، نشاط اور سرکشی کی نیت سے اپنا کپڑا زمین پر گھسیٹ کر چلا، (حدیث مبارک کے ان الفاظ سے) یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا لباس گھسیٹے ہوئے زمین پر چلتا ہے، لیکن اس کی نیت تکبر و سرکشی کی نہیں ہے، تو اس کا یہ عمل حرام نہیں ہوتا، بلکہ مکروہِ تنزیہی ہوگا، (التعلیق الصبیح، ج: 4، ص: 383)''۔

''کفِ ثوب'' کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہِ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین

شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہتِ تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہتِ تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کردی گئی ہیں۔نماز میں ہیئتِ لباس کے بارے میں اللہ جلّ شانہ کا ارشاد ہے:یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔

ترجمہ: ''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو، (الاعراف: 30)۔''

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہیے اور اوپر ''کفِ ثوب'' کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کرکے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ ''احکم الحاکمین'' کی بارگاہ میں حاضر ہو۔اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے (یعنی قباحت اس میں ہے کہ اپنی ساخت میں قمیص پوری آستین والی ہو اور پھر خلافِ وضع آستین چڑھا کر نماز پڑھے)۔عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی ﷺ اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے اپنی تحقیقی بیان میں

فرماتے ہیں: ہماری تحقیق یہ ہے کہ احادیث میں "جرِ ثوب اور "اِسبال اِزار" کے الفاظ ہیں۔ "جرِ ثوب" کا معنی ہے کپڑا گھسیٹنا اور "اِسبال لِازار" کا معنی ہے تہبند کا ٹخنون سے نیچے ہونا۔ اگر کوئی مرد جرِ ثوب کرے یعنی اس کا تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں سے بہت نیچا ہو حتیٰ کہ اس کے قدموں سے نیچے گھسٹ رہا ہو تو یہ بغیر تکبر کے بھی مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ اس میں بغیر کسی ضرورت اور بغیر کسی فائدہ کے کپڑے کو ضائع کرنا ہے ہو یہ اسراف کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کپڑا قدموں کے نیچے زمین پر گھسٹتا رہے گا تو نجاست کے ساتھ آلودہ ہوگا اور کپڑے کو محلِ نجاست میں ڈالنا بھی مکروہِ تحریمی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، کیونکہ عہد رسالت میں عورتیں کپڑا گھسیٹ کر چلتی تھیں اور مردوں کے لئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی مکروہِ تحریمی ہے اس لئے اگر جرِ ثوب بغیر تکبر کے ہو پھر بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی نے اس کو مذموم فرمایا ہے(تمہید جلد:3،ص:244)۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو مکروہِ تحریمی فرمایا ہے،(فتح الباری،جلد:10،ص:263)۔ اور اگر "جرِ ثوب" میں کپڑا گھسیٹنے کے ساتھ اظہارِ تکبر بھی ہو تو یہ شدید مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اور اگر "اِسبالِ ازار" ہو یعنی تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں کے نیچے ہو لیکن اس کے قد و قامت کے برابر ہو گھسٹ نہ رہا ہو تو اگر اس میں تکبر نہیں ہے صرف زینت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ صرف خلافِ اَولیٰ ہے اور اگر اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اور اکڑ اکڑ کر چلتا ہے اور اِتراتا ہے تو پھر یہ تکبر کی وجہ سے مکروہِ تحریمی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کی علّت صرف تکبّر ہے، اگر ایک مرد نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھتا ہے اور اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پرہیز گار سمجھتا ہے اور ان کو حقیر

سمجھتا ہے تو یہ بھی مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اس لئے حرمت میں اصل تکبر ہے۔

ہماری اس تحقیق کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ کی اس عبارت میں ہے: "اگر کسی شخص کا لباس بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہو تو اس کا حال مختلف ہے اگر وہ کپڑا اس کے ٹخنوں کے نیچے لٹک رہا ہو لیکن وہ کپڑا پہننے والے کے قد اور اس کی قامت کے برابر ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہوگی، خصوصاً جبکہ بلا قصد ایسا ہو (یعنی غیر ارادی طور پر تہبند یا شلوار پیٹ سے پھسل کر ٹخنوں سے نیچے لٹک گئی ہو)، جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے اس طرح واقع ہوا، اور اگر کپڑا پہننے والے کے قد و قامت سے زائد ہو تو اس سے منع کیا جائے گا کیونکہ اس میں اسراف ہے اور اس کو حرام کہا جائے گا، اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے اور یہ پہلی وجہ سے زیادہ قوی وجہ ہے، کیونکہ امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کے لباس کی نوع کا لباس پہنتا ہے، اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس طرح کا لباس پہننے والا اس خدشے سے محفوظ نہیں ہوگا کہ اس کے لباس پر نجاست لگ جائے (کیونکہ اس کا لباس قدموں کے نیچے لٹک رہا ہے) اور اس ممانعت کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے جس کو امام ترمذی نے شمائل (رقم الحدیث: 121) میں اور امام نسائی نے سنن کبریٰ (رقم الحدیث: 9682,9683) میں حضرت عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک تہبند باندھے ہوئے جا رہا تھا اور وہ تہبند زمین پر گھسٹ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے کہا: اپنا کپڑا اوپر اٹھاؤ اس میں زیادہ صفائی اور زیادہ بقا ہے، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے، میں نے کہا: یا رسول اللہ! یہ تو ایک سیاہ اور سفید دھاریوں والا تہبند ہے (یعنی اس معمولی کپڑے میں

تکبر کرنے کا کوئی معنیٰ نہیں ہے)،آپ نے فرمایا: کیا تمہارے لئے میری شخصیت میں نمونہ نہیں ہے؟، میں نے دیکھا تو آپ نے آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھا ہوا تھا (مسند احمد جلد 5 ص: 364) اوراس وجہ سے بھی ممنوع ہے کہ کپڑا گھسیٹنے میں تکبر کی بدگمانی ہوتی ہے۔قامت سے نیچے کپڑا لٹکانا کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہےاور کپڑا گھسیٹنا تکبر کو مستلزم ہے خواہ پہننے والے نے تکبر کا قصد نہ کیا ہواوراس کی تائیداس حدیث سے بھی ہوتی ہے،احمد بن منیع نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم تہبند کو گھسیٹنے سے بچو کیونکہ تہبند کو گھسیٹنا تکبر سے ہے،(فتح الباری جلد 10 ص: 263,264 مطبوعہ دارنشر الکتب الاسلامیہ لاہور)، (تبیان القرآن جلد 4،ص: 322, 323, 330, 331 مطبوعہ:فرید بک اسٹال،لاہور)“۔

تسبیحات فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنن ونوافل کے بعد؟

سوال: 34

کیا فرض نماز کے فوراً بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنا افضل ہے یا پہلے بقیہ نماز مکمل کرنا افضل ہے؟،کیونکہ کچھ نمازی فرض نماز کے بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں اور بقیہ نماز بعد میں ادا کرتے ہیں،اس طرح اگلی صف میں بیٹھے ہوئے نمازی جو پہلے نماز مکمل کرلیتے ہیں انہیں،واپس اپنے کام پر جانے کی جلدی ہوتی ہے، اسطرح جلدی جانہیں پاتے ہیں،(قاری محمد مختار یاقیانی،مدرس دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

نماز کے بعد تسبیحات واذکار کی فضیلت احادیث میں کثرت سے وارد ہوئیں ہیں: عن کعب بن عجرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”معقبات

لا یخیب قائلهن "یُسبح اللہ فی دُبُرِ الصّلاۃ ثلاثاً و ثلاثین، ویُحمّدُہٗ ثلاثاً وثلاثین، ویُکبّرہٗ أربعاً وثلاثین"۔

ترجمہ: "کعب بن عجرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات (نماز کے بعد بلا فاصلہ کہنے کے ہیں) جن کا کہنے والا نامراد نہیں رہتا، (ان کلمات میں) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ "سبحان اللہ" کہنا، تینتیس مرتبہ "الحمد للہ" کہنا، چونتیس مرتبہ "اللہ اکبر" کہنا، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1348)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: یکرہ تاخیر السنة الا بقدر: اللّٰھم أنتَ السّلامُ الخ۔قال الحُلوانی: لابأس بالفصل بالأوراد، واختاره الکمال، قال الحلبی: ان أُرید بالکراھۃ التنزیھیة إرتفعَ الخلاف۔ قلتُ: وفی حفظی حَمْلُهٗ علی القلیلة، ویستحب أن یستغفر ثلاثاً ویقرأُ آیةالکرسِیّ والمُعَوِّذاتِ ویُسَبّحُ وَیُحَمّدُ وَیُکَبّرُ ثلاثاً وثلاثین؛ وَیُھَلّل تمامَ المائةِ ویدعوا وَیختِمُ بسبحان ربك۔

ترجمہ: "سنتوں میں تاخیر "اَللّٰھُمّ اَنْتَ السّلام" (حدیث پاک میں روایت کردہ پورے کلمات یہ ہیں: اَللّٰھُمّ اَنْتَ السّلامُ وَمِنْكَ السّلَام، تبارکتَ یا ذَاالْجَلالِ وَالْاِکْرَام) کی مقدار سے زیادہ مکروہ ہے۔ حلوانی نے فرمایا: اذکار کے ساتھ فرائض وسنن میں فاصلے میں کوئی حرج نہیں، کمال نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حلبی کہتے ہیں: کہ اگر کراہت سے کراہتِ تنزیہی مراد ہے تو اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ (قلت میں کہتا ہوں) اور مجھے یہاں تک یاد ہے کہ یہ (تنزیہی) قلیل فصل پر محمول ہے، اور مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ استغفار پڑھے، آیۃ الکرسی اور مُعوِّذات (سورۃ الفلق وسورۃ الناس) تلاوت کرے اور "سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر" تینتیس، تینتیس مرتبہ پڑھے، اور

سوویں مرتبہ" لا إلٰـہَ إلاَّ اللہ "پڑھے،اس کے بعد دعا کرے اور اختتام "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُللهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "پر کرے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2 ص:218،219،داراحیاءالتراث العربی ،بیروت)"۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:(إلاَّ بقدرِ اَللّٰهُمَّ الخ)لِمَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرمذی عن عائشةَ رضی اللہ تعالیٰ عنها قالت:"کان رسولُ اللہ ﷺ لا يقعد إلاَّ بمقدار ما يقولُ: اَللّٰهُمَّ انتَ السلامُ ومنكَ السَّلامُ ،تبارکت یا ذَاالجلالِ والاکرام" واما ما وَرَدَمِنَ الاحادیثِ فی الَاذکار عقيبَ الصَّلاةِ فَلا دلالَةَ فيه على الْإتيانِ بهاقبلَ السُّنَّةِ، بل يُحمَلُ علَى الإتيانِ بها بعدَها، لأن السُّنَّةَ مِنْ لواحقِ الفَريضةِ وتوابعها ومُكَمِّلاتِها فلم تكُنْ أجنبية عنها، فما يفعل بعدها يُطلق عليهِ أنه عقيبَ الفريضة۔

ترجمہ:"(یعنی مقدار: اللّٰهم الخ)کیونکہ مسلم اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف "اَللّٰهُمَّ انْتَ السَّلامُ وَمِنْكَ السَّلامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَاالْجَلالِ وَالْإِكْرَام " کی مقدار ہی بیٹھتے تھے،اور دیگر روایات میں جو نماز کے بعد اذکار کا ذکر ہے اس میں یہ دلالت نہیں کہ وہ اذکار سنتوں سے پہلے ہوتے تھے بلکہ (ان تسبیحات واوراد کے پڑھنے کو سنتوں کے بعد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے)،کیونکہ سنتیں فرائض کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں اور ان کے تابع ہوتی ہیں،اور ان (میں نادانستہ طور پر کوئی کمی رہ جائے تو اس کی) تکمیل کا سبب ہیں،لہذا یہ فرائض سے بالکل الگ کوئی چیز نہیں ہیں،لہذا جو تسبیحات ان سنتوں کے بعد پڑھی جائیں،ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عمل فرضوں کے بعد ادا ہوا،((ردالمحتار

علی الدر المختار جلد 2 ص: 218، 219، دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سُنّتیں ہیں، (یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء) ان نمازوں کے بعد دعا بھی مختصر کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہٗ العزیز سے سوال ہوا کہ "بعد نمازِ جمعہ انحرافِ قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں"۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: "امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سُنّت ہے اور اس کا ترک یعنی بعدِ سلام قبلہ رُو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگرچہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔ اقول و یمکن الاستیناس له بقوله عزّوّ جلّ "واذا کانوا معهٗ علی امرٍ جامعٍ لَمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ "فَاِنَّ فَرَاغَهٗ مِنَ الدُّعَاءِ یُعَدُّ اِذْنَامِنْهُ دَلَالَةً بِالْمِلْكِ الْعُرْف جارٍ۔

ترجمہ: "(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی سے استدلال ممکن ہے "اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہئے اگرچہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر و عصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

فرض کے بعد اذکار کے بارے میں یہ دو احادیث بھی ملاحظہ ہوں: قال رسول اللہ ﷺ من قرأ آیۃ الکرسی دُبُرَ کل صلوٰۃ مکتوبۃ لم یمنعہ من دخول الجنۃ الا الموت وزاد الطبرانی وقل ھو اللہ احد۔

ترجمہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اس کے لئے جنت میں جانے سے موت کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔ اور طبرانی نے قل ھو اللہ احد پڑھنے کی زیادتی بھی روایت کی ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث:)"۔

عن عقبۃ بن عامر قال امرنی رسول اللہ ﷺ ان اقرأ المعوذات فی دبر کل صلوٰۃ۔

ترجمہ "حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس، (یہ سورتیں) پڑھا کروں، (سنن نسائی، رقم الحدیث: 1335)"۔

ان پر بحث کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

"امام ابن ہمام نے ان اذکار کی یہ تاویل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سنتیں پڑھنے کے بعد یہ اذکار پڑھا کرتے تھے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ فرض کے بعد یہ اذکار پڑھتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم کی (حدیث نمبر 1243) اور ابن حبان، نسائی اور طبرانی کی آیت الکرسی والی حدیث ہے علامہ ابن ہمام نے کہا سنتیں چونکہ فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں اس لیے جو ذکر سنتوں کے بعد ہوگا وہ فرض کے بعد ہی ہوگا۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سنن اور نوافل گھر میں پڑھتے تھے پھر صحابہ کرام کو کیسے پتا چلا کہ رسول اللہ نماز کے بعد یہ ذکر

کرتے تھے۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد بآواز بلند پڑھتے تھے۔ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر لا حول ولا قوۃ الا باللہ لا الہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ لہ النعمۃ ولہ الفضل ولہ الثناء الحسن لا الہ الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون۔۔۔ تو امام ابن ہمام تاویل در تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے حجرہ کے باہر سے ذکر کی آواز سن لیتے تھے۔ اس تاویل سے قطع نظر ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کا ذہن اس اعتراض کی طرف متوجہ نہیں ہوا... کہ صحابہ بھی تو اس وقت اپنے اپنے گھروں میں سنن اور نوافل پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ سنن ابن حبان میں جو روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کے جنت میں جانے کے لئے موت کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس روایت کے الفاظ ابن ہمام کی تاویل کا ساتھ نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ نے جو روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللّٰھُمَّ انت السلام کی مقدار تک بیٹھتے تھے یہ دوام واستمرار پر محمول نہیں ہے بعض اوقات آپ صرف اللّٰھم انتَ السلام و منکَ السلام پڑھنے تک بیٹھتے اور بعض اوقات اس سے زیادہ مقدار تک بیٹھتے اور ذکر کرتے رہتے۔ امت کی سہولت کے لئے آپ نے نہ کسی ایک ذکر کو معین کیا نہ کسی ایک مقدار کو معین فرمایا، یہی توجیہ آپ کی زندگی کے عام معمولات کے موافق ہے۔ بہر حال نمازی فرض نماز پڑھنے کے بعد آیت الکرسی پڑھے، تین مرتبہ استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو۔ پڑھے اور کلمہ شریف کا ذکر کرے، کیونکہ ان کے پڑھنے پر بہت اجر وثواب اور جنت کی بشارت ہے۔ نیز فرض کے بعد سنتیں پڑھنے میں اصل سنت یہ ہے کہ سنتیں گھر

میں پڑھی جائیں۔ دیگر احادیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ فرض اور سنن میں فاصلہ ہونا چاہئے، اس لیے افضل یہی ہے کہ ان اذکار کو فرض کے بعد پڑھا جائے۔ فرض نماز کے بعد اذکار کے سلسلہ میں اس حکایت پر بھی عمل کرنا چاہئے۔

ابن قیم جوزی سند ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں ابو بکر بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میں ابوبکر بن مجاہد کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اچانک وہاں شبلی آگئے تو ابوبکر بن مجاہد نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) بوسہ دیا، میں نے ان سے کہا یا سیّدی آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں، حالانکہ بشمول آپ کے تمام اہل بغداد کے خیال میں یہ دیوانہ ہے۔ ابوبکر بن مجاہد نے کہا میں نے شبلی کی اس طرح تعظیم کی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعظیم کی تھی، کیونکہ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔ آپ کی خدمت میں شبلی حاضر ہوا، آپ نے کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ شبلی کو کیوں سرفراز فرما رہے ہیں؟، آپ نے فرمایا، یہ ہر فرض کے بعد یہ آیت پڑھتا ہے۔ "لقد جاء کم رسول من انفسکم" (یعنی سورۂ توبہ کی آخری دو آیات)، اس کے بعد تین مرتبہ کہتا ہے "صلی اللہ علیك یا محمد"۔ بعد میں میری شبلی سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے پوچھا تم درود کسطرح پڑھتے ہو؟، انہوں نے اسی طرح بتایا، (شرح صحیح مسلم، جلد:2، ص:194، 195)"۔ جیسا کہ معلوم ہوا کہ جماعت فرض کے بعد سنتیں گھر پر پڑھنا افضل ہیں، تاہم مسجد میں بھی پڑھ سکتے ہیں، البتہ جماعت کے بعد مسجد میں دیر تک سُنن و نوافل پڑھنے والے حضرات اس امر کا اہتمام ضرور کریں کہ مسجد سے باہر جانے والوں کے لئے راستہ موجود ہو اور انہیں نمازی کے آگے سے نہ گزرنا پڑے، اگر کہیں دیوار یا پلر ہے تو اسے سُترہ بنا کر کھڑے

ہوجائیں۔یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ فرائض کے بعد بعض نمازی جلدی سے آخری صف میں سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور نماز ختم کر کے باہر نکلنے والے نمازیوں کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ وہ نمازی کی حرمت کو پامال کر کے اس کے آگے سے گزریں، اسی طرح بعض نمازی پچھلی صفوں میں دروازوں کے عین سامنے سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور نمازی کے لئے پیچھے نکل کر جانے کا راستہ ہی نہیں رہتا، پس نمازیوں کو ان تمام امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب المساجد﴾

مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے مدرسے کا حکم

سوال: 35

اگر کوئی شخص مسجد کی چھت پر بالغ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرے، اور اس میں بالغ و نابالغ لڑکیاں تعلیم حاصل کریں۔ سوال یہ ہے کہ آیا مسجد کی چھت کو ایسے مدرسہ کے لئے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟، ازراہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں، (مولانا محمد بہرام خان نعیمی، جامع مسجد قادریہ، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: قوله الى عنان السماء بفتح العين و كذا الىٰ تحت الثرىٰ كما في البيرى عن الاستيجابى ۔ ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے، جیسا کہ ''بیری'' میں ''استیجابی'' کے حوالے سے منقول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 2، ص: 270-271، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وسطح المسجد له حكم المسجد كذافي الجوهرة النيره۔

ترجمہ: ''اور مسجد کی چھت مسجد ہی کے حکم میں ہے، ''جوہرہ نیرہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: اول، ص: 38، مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مسجد کی چھت پر مدرسے کا قیام، وقف میں تبدیلی کرنا ہے اور مسجد مکمل ہونے کے بعد اس کے مصرف میں تغییر کرنا جائز نہیں ہے ،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئتہ۔

ترجمہ:''وقف کی ھیئت کو بدلنا جائز نہیں ،(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490،مطبوعہ مکتبہء رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: اما لو تمت المسجدیۃ ثم اراد البناء منع۔

ترجمہ:''اگر کسی مسجد کی مسجدیت تمام ہو جائے پھر اگر اس میں مزید تعمیر کا ارادہ ہو (جس سے اس وقف کے مصرف میں تبدیلی ہوتی ہو)تو اسے روک دیا جائے گا،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 6 ص:428 داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

چونکہ مسجد کی چھت بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے،اس لئے اس کی مسجدیت کا تبدیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے،البتہ مسجد میں دینی درس وتدریس جائز ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیہ استعمال اللبود والبواری المسبلہ لاجل المسجد کذا فی القنیہ۔

ترجمہ:''اور مسجد میں درس وتدریس جائز ہے اگرچہ اس میں مسجد کی دریاں،نمدے جو مسجد کے لئے وقف ہیں، استعمال ہوں ،''قنیہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:320 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

البتہ مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے،بچوں کا شور نمازیوں کی نماز میں خلل انداز نہ ہو،ورنہ اوقات نماز میں درس وتدریس کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔بالغ طالبات کا مسجد کی چھت پر مدرسہ قائم کرنا بوجوہ درست نہیں ہے،ایک تو یہ کہ ایسی طالبات اور ان کی معلمات کے فطری طور پر ایامِ حیض بھی آتے ہیں،اور ان ایام میں عورت

کا مطلقاً مسجد میں داخل ہونا منع ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولا یحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ۔

ترجمہ: ''اور جنبی، اور حیض ونفاس والی عورت کا مسجد کی چھت پر ٹھیرنا جائز نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 2، ص: 370، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

درمختار محل مذکور: یحرم فیہ السوال ویکرہ الاعطاء وانشاد ضالّۃ وشعرٍ الا مافیہ ذکر ورفع صوت بذکر الالمتفقھۃ ویمنع منہ کل مؤذ ولو بلسانہ۔

ترجمہ: ''مسجد میں سوال کرنا حرام اور سائل کو مسجد میں دینا مکروہ ہے، اور اسی طرح گمشدہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنا۔ اور ایسے اشعار پڑھنا جن میں ذکر نہ ہو، اور فقہ کی تعلیم وتعلم کے علاوہ آواز بلند کرنا مکروہ ہے، اور ہر ایذا دینے والے کو مسجد سے منع کیا جائیگا اگرچہ زبان سے ایذا پہنچاتا ہو۔'' اور اگر ایسے نہ ہوں تو انہیں مسجد میں غیر اوقات نماز میں پڑھانا مضائقہ نہیں رکھتا جب کہ معلم بلاتنخواہ محض لوجہ اللہ پڑھاتا ہو ورنہ ہرگز جائز نہیں اگرچہ جوان اور بوڑھے ہی پڑھیں کہ اب یہ اور پیشوں کی طرح دنیا کمانا ہے اور مسجد میں اس کی اجازت نہیں۔ فتاوٰی عالمگیری جلد: 5، ص: 122، ''لو جلس المعلم فی المسجد والوراق یکتب فان کان المعلم یعلم للحسبۃ والوراق یکتب لنفسہ فلاباس بہ لانہ قربۃ وان کان بالاجرۃ یکرہ الاان یقع لھما الضرورۃ کذافی محیط السرخسی''۔

ترجمہ: ''اگر معلم مسجد میں بیٹھ کر تعلیم دیتا ہے اور کاتب مسجد میں بیٹھ کر لکھتا ہے اگر تو

معلم ثواب کی نیت سے ایسا کرتا ہے اور کاتب اپنے لئے لکھتا ہے نہ کہ اجرت پر تو حرج نہیں کیونکہ یہ قربت وعبادت ہے،اور اگر اجرت کے لئے ہے تو بلاضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے،امام سرخسی کی محیط میں بھی ایسا ہی ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد:5،ص:122)''،(فتاویٰ رضویہ جلد:16،ص:459،مطبوعہ:رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)''۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:''مسجد کے اندر علمِ دین کی تعلیم جائز اور اس کے جواز پر قرآن وحدیث شاہد، قال اللّٰہ تعالیٰ و من اظلم ممن منع مسٰجداللّٰہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعیٰ فی خرابھا ۔حدیث میں ہے: خرج رسول اللّٰہ ﷺ ونحن فی الصفۃ فقال ایکم یحب ان یغدو کل یوم الیٰ بطحان او العقیق فیاتی بناقتین کوماوین فی غیراثم ولا قطع رحم فقلنا یارسول اللّٰہ کلنا نحب ذالک قال افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرأ ایتین من کتاب اللّٰہ خیرلہ من ناقتین وثلث خیرلہ من ثلث واربع خیرلہ من اربع ومن اعدادھن من الابل رواہ مسلم عن عقبۃ بن عامر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ۔

ترجمہ:''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو مساجد میں ذکرِ الٰہی کو روکے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے،حدیث میں ہے:ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ (اپنے حجرۂ اقدس سے) نکلے اور ہم (اس وقت) صفہ میں تھے،تو آپ نے فرمایا:تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ ہر روز صبح بطحان یا عقیق کی طرف نکلے اور کسی گناہ یا قطعِ رحم کے بغیر دو بلند کوہان والی اونٹنیاں لائے،تو ہم نے عرض کیا :یا رسول اللہ ﷺ!(بلاشبہ) ہم میں سے ہر ایک اس بات کو پسند کرے گا،(تو رسول

اللہ ﷺ نے)فرمایا:تو تم میں سے ہر شخص (ہر روز) صبح کے وقت مسجد کی طرف کیوں نہیں نکل پڑتا، تا کہ وہ کتاب اللہ کی دو آیتیں پڑھائے یا پڑھے، یہ (عمل)اس کے لئے دو بلند کوہان والی اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتوں کا پڑھنا پڑھانا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا پڑھانا چار اونٹنیوں سے اور ان سے زیادہ آیتوں کا پڑھنا پڑھانا اتنی ہی تعداد کی اونٹنیوں سے بہتر ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث: 1842 مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز المکۃ المکرمہ،اس حدیث کو امام مسلم نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے)"۔

فی نفسہٖ تعلیم سے مسجد کی کوئی بے حرمتی نہیں ہے،تعلیم کو احترام کے خلاف کہنا غلط ہے ،البتہ اگر پڑھنے یا پڑھانے والے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہوں تو ان کو اس سے منع کیا جائے اور روکا جائے ،واللہ تعالیٰ اعلم،(فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 256 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ،کراچی)"۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: مسجد میں علمِ دین کی تعلیم جائز ہے،حضور اقدس ﷺ کے زمانہ پاک میں مسجد نبوی میں علم دین کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک دونوں حرم محترم میں علم دین کی تعلیم بلا نکیر جاری ہے،حدیثوں سے اس کا جواز ثابت ہے،(فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 269 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ،کراچی)"۔

خلاصہ یہ کہ فی نفسہٖ مسجد میں دینی درس وتدریس جائز ہے،لیکن مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا لازم ہے،اور جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں محیط سرخسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضرورت کی بنا پر اجرت کے عوض بھی مسجد میں تدریس جائز ہے،لیکن بالغ طالبات کے لئے مسجد کی چھت پر درس وتدریس کا انتظام کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں

WWW.NAFSEISLAM.COM

کئی شرعی مفاسد کا احتمال ہے، اور مسجد کے وقف میں تبدیلی کر کے کسی بھی طرح کا مدرسہ قائم کرنا بہر صورت جائز نہیں ہے۔

مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا

سوال: 36

ہمارے ہاں ایک مسجد موسوم (اڈہ لاریاں والی مسجد) کی جدید تعمیر کی گئی۔ مسجد کا ڈیزائن اسطرح بنایا گیا کہ عینِ مسجد کو جائے وضو بنا دیا گیا ہے۔اور مسجد کے کچھ حصے کو دکان بنا دیا گیا ہے۔ازروئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟،(محمد جابر کھوڑ، ضلع اٹک)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جیسا کہ سوال سے واضح ہوتا ہے کہ جس جگہ وضو خانہ بنایا گیا، وہ پہلے مسجد تھی، مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہی ہے اور اس کی مسجدیت کبھی باطل نہیں ہوسکتی۔فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قولہ الی عنان السماء بفتح العین و کذا الیٰ تحت الثریٰ کما فی البیری عن الاستیجابی۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے''بیری'' میں استیجابی سے اسی طرح منقول ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:370-371، مطبوعہ، داراحیاءالتراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئتہ۔

ترجمہ: ''وقف کی ھیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ

مکتبہء رشیدیہ،کوئٹہ)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اوراس کے بھی اس کام میں جس کیلیۓ واقف نے وقف کی ،وقف کواس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں،شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل بہ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)،(فتاویٰ رضویہ جلد 16ص: 546مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب ا امیں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لایجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتاً ومسکنا تسقط حرمتہ وھذالایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمہ حکم المسجد، ترجمہ:"متولی کومسجد کی حد یا مسجد کے فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں، کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنا دیا جائے،تو اس کا احترام ساقط ہوجاتا ہے،جو کہ نا جائز ہے اور فنائے مسجد چونکہ مسجد کے تابع ہے لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے،(فتاویٰ رضویہ جلد 16ص:352مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (کہ مسجد کے اوپر امام کے لئے بالاخانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں:صورتِ مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام،اوروہ بالاخانہ بھی قطعی حرام،ہاں وقت بنائے مسجد قبلِ تمامِ مسجدیّت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالاخانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے،اوراگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگر چہ

مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہر گز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے: لو بنی فوقه بیتا للامام لا یضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع ولو قال عنیتُ ذالك لم یُصَدَّق، تاتارخانیه فاذا کان ھذا فی الواقف فکیف بغیرہ فیجب ھدمه ولو علی جدار المسجد ولا یجوز اخذ الاجرۃ منه ولا ان یجعل شیئا منه مستغلا ولا سکنی بزازیة۔

ترجمہ: "اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنادیا، تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے، لیکن تمامِ مسجدیّت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے، تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے لہٰذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگر چہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 432,433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایک جگہ کی مسجدیّت متحقق ہوچکی تھی، اسے عین مسجد قرار دیا جاچکا تھا اور بطور مسجد ہی وہ زیر استعمال رہی، اس لئے اب اس کی مسجدیّت کو باطل کر کے اس کی جگہ وضو خانہ یا دوکانیں بنانا درست نہیں ہے، البتہ اسے مسجد کا حصہ قائم رکھتے ہوئے اور آداب مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے درس وتدریس کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں

سوال: 37

سرکار دو عالم ﷺ کے منبر کی تین سیڑھیاں تھی لیکن ایک دفعہ سرکار دو عالم ﷺ منبر پر چڑھے تو تین مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے آمین کہا اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ منبر کی سیڑھیاں چار تھیں اور آپ ﷺ چوتھی سیڑھی پر بیٹھے ہوں گے۔ (سید عالم شاہ، جامع مسجد مصطفیٰ اعظم نگر لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ردالمحتار میں ہے: منبرہ ﷺ کان ثلث درج غیر المسماۃ بالمستراح۔

ترجمہ: حضور ﷺ کے مقدس منبر کے تین زینے اس تخت کے علاوہ تھے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ حضور سید عالم ﷺ درجۂ بالا پر خطبہ فرمایا کرتے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے پر پڑھا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تیسرے پر، جب زمانہ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آیا پھر اول پر خطبہ فرمایا سبب پوچھا گیا، فرمایا اگر دوسرے پر پڑھتا لوگ گمان کرتے کہ میں صدیق اکبر کا ہمسر ہوں اور تیسرے پر تو وہم ہوتا کہ فاروق اعظم کے برابر ہوں، لہٰذا وہاں پڑھا جہاں یہ احتمال متصور ہی نہیں اصل سنت اول درجہ پر قیام ہے۔ وما فعلہ الصدیق فکان تأدبا منہ مع رسول اللہ ﷺ وما فعل الفاروق فکان تأدبا مع الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کے ادب کی بنا پر ایسا کیا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ادب کی خاطر۔ بلندیٔ منبر سے اصل مقصود یہ ہے کہ سب حاضرین خطیب کو دیکھیں اور اس کی آواز سنیں جہاں یہ

حاجت بسبب کثرت حضار و دوری صفوف تین زینوں میں پوری نہ ہو تو زینے زیادہ کرنے کا خود ہی اختیار ہے اور بہتر عدد طاق کی مراعات فان اللہ وتر یحب الوتر (اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے) واللہ تعالیٰ اعلم ، (فتاوی رضویہ جلد 8 ص : 343,344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن ، لاہور)"۔

محدث بریلوی امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز کی تحریر سے واضح ہے کہ منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں تین تھیں اور چوتھا تخت یا بیٹھنے کی جگہ تھی ، خلیفہ اول و دوم نے ادب کو ملحوظ رکھا ، حضرت ابوبکر منبر رسول پر اس جگہ بیٹھے ، جہاں حضور ﷺ کے قدم مبارک ہوتے تھے اور پھر حضرت عمر حضرت ابوبکر کے قدموں کی جگہ بیٹھ گئے ، یہ دونوں اکابر ادب واحترام کی وجہ سے اجر پائیں گے ، تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان نے قیامت تک آنے والے خطباء حضرات کے لئے یُسر (آسانی) کو ملحوظ رکھا ، اور وہ بھی اس اخلاص اور نیک نیتی کا اجر پائیں گے ، منبر کی سیڑھیاں تین سے زائد پانچ یا سات بھی بنائی جاسکتی ہیں ، طاق عدد بہتر ہے۔

مسجد کی بالائی منزل پر جماعت

سوال : 38

ہماری مسجد جو کہ پچاس سالہ پرانی بنی ہوئی تھی اس کی جگہ نئی تعمیر تین منزلہ ہوئی ہے لیکن پہلے والے مصلّی پر ابھی نماز ہو رہی ہے ہم لوگ پہلی منزل پر نماز کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں ۔ اس مسئلے میں آپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے آیا اوپر نماز با جماعت نماز ادا کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے ؟ ، (محمد اسلم ، جنرل سیکریٹری جامعہ مسجد غوثیہ لیاقت آباد ، کراچی)۔

جواب:

مسجد کی عمارت بجمیع اجزائہ مسجد کہلاتی ہے اور مسجد کے جمیع اجزاء کا حکم یکساں ہے، جس طرح نیچے مسجد کے اندر نماز صحیح اور مشروع ہے، اسی طرح فرسٹ فلور پر بھی نماز باجماعت جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں فرسٹ فلور پر نماز باجماعت پڑھنے میں ازروئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے فقط امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہِ تنزیہی ہے، لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدی بھی اوپر کھڑے ہوں اور باقی امام سے نیچے ہوں تو ایسی صورت میں بلا کراہت نماز جائز ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویکرہ ان یکون الامام وحدہ علی الدکان وکذا القلب۔۔۔وان کان بعض القوم معہ فالاصح انہ لایکرہ الخ۔" (فتاوی عالمگیری جلد 1 ص:108 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

صورت مسئولہ میں جو لوگ نیچے یا اوپر کی منزل میں امام کی اقتداء میں کھڑے ہوں گے، اگر ان کو امام کے انتقالات یعنی رکوع اور سجدہ میں جانے کا اس طرح تشہد میں بیٹھنے کا اور سلام پھیرنے کا کسی ذریعہ سے خواہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے یا مکبرین کے ذریعے علم ہو جاتا ہے تو نیچے کھڑے ہو کر ان کا اقتداء کرنا درست ہے اور اگر ان کو امام کے انتقالات کا علم نہیں ہوتا تو پھر ان کا امام کی اقتداء کرنا، اس صورت میں صحیح نہیں، نماز جائز نہیں ہوگی۔

فنائے مسجد کا حکم

سوال: 39

عرض یہ ہے کہ ہماری مسجد میں ایک مدرسہ مسجد کمیٹی کے زیر انتظام دینی خدمات انجام دے رہا ہے، جس میں بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ انتظام ہے، مدرسے میں ایک خاتون مُعلمہ بھی ہیں جن کی کارکردگی سے کمیٹی مطمئن ہے اور سمجھتی ہے کہ مذکورہ خاتون سنّیت کی ترقی وترویج کے لئے اچھا کام کررہی ہیں، ان کا کوئی مکان نہیں ہے، اور شوہر بھی بے روزگار ہے۔ انتظامیہ فنائے مسجد کے احاطے میں جہاں مدرسہ ہے، پہلے مسجد کا وضوخانہ بعد میں لائبریری اور پھر خادم کی رہائش رہی ہے، مدرسے کی اوپر والی منزل میں شروع سے بچوں کے مدرسے کی جگہ ہے، لیکن اب وہاں مؤذن صاحب کی رہائش ہے، جہاں اوپر مؤذن صاحب اور نیچے خادم کی رہائش ہو، وہاں پر مُعلّمہ کو بھی رہائش کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ نہیں؟ اسی مدرسے کے ناظم، جن کا کوئی گھر نہیں ہے اور وہ اچھا کام کررہے ہیں، اسی احاطے میں ان کو بھی رہائش کی جگہ دی جاسکتی ہے، (محمد غوث محی الدین، R-1043/15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فنائے مسجد کیا ہے؟ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز "غنیۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فناء المسجد هو المكان المتصل به ليس بينه طريق ترجمہ: "فنائے مسجد وہ مکان ہے جو مسجد کے متصل ہو اور درمیان میں راستہ نہ ہو، (غنیۃ المستملی، فصل فی احکام المسجد ص: 614 سہیل اکیڈمی لاہور)"۔ اور فنائے مسجد کی حرمت مثل مسجد ہے

،فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب ۱۱میں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لایجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتاً و مسکنا تسقط حرمتہ وھذالایجوز والفناء تبع المسجدفیکون حکمہ حکم المسجد، ترجمہ:''متولی کومسجد کی حد یا مسجد کے فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنادیا جائے تو اس کا احترام ساقط ہوجاتا ہے جو کہ ناجائز ہے اور فنائے مسجد چونکہ مسجد کے تابع ہے لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے،(فتاویٰ رضویہ جلد 16ص:352مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے جیسا کہ آپ نے سوال میں تفصیل سے بتایا کہ:'' انتظامیہ فنائے مسجد کے احاطے میں جہاں مدرسہ ہے، پہلے مسجد کا وضوخانہ بعد میں لائبریری اور پھر خادم کی رہائش رہی ہے،مدرسے کی اوپر والی منزل میں شروع سے بچوں کے مدرسے کی جگہ ہے،لیکن اب وہاں مؤذن صاحب کی رہائش ہے،''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مقام پر بار بار تغیر وتبدیل کی گئی جو کہ جائز نہیں،علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:**ولا یجوز تغیر الوقف عن ھیئتہ**.

ترجمہ:''وقف کی ھیت کوبدلنا جائز نہیں،(فتاویٰ عالمگیری جلد 2ص:490،مطبوعہ مکتبہء رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جوزمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اوراس کے بھی اس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی، وقف کواس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں،شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل بہ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص

کی مثل ہے)(فتاوی رضویہ جلد 16ص:546 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (مسجد کے اوپر امام کے لئے بالاخانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں: صورتِ مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالاخانہ بھی قطعی حرام، ہاں وقت بنائے مسجد قبل تمام مسجدیت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالاخانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگرچہ مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے: لو بنی فوقه بیتا للامام لا یضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع و لوقال عنیت ذالك لم یصدق تاتارخانیه فاذا کان هذا فی الواقف فکیف بغیره فیجب هدمه ولو علی جدار المسجد ولا یجوز اخذ الاجرة منه ولا ان یجعل شیئا منه مستغلا ولا سکنی بزازیة۔ ترجمہ: "اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنادیا تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے لیکن تمامِ مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے لہذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگرچہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)، (فتاوی رضویہ جلد 16ص:432,433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

مذکورہ بالا تمام عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ فنائے مسجد، مسجد کے تابع ہے، اور اس کی

حرمت مثل مسجد کے ہے لہٰذا اس کا حکم بھی مسجد کے حکم میں ہوگا، چونکہ پہلے بھی مسجد انتظامیہ نے خلاف شرع عمل کیا اور اسے برقرار رکھا اور اب پھر اسی غلطی کا اعادہ کرنے کا ارادہ ہے، مسجد یا مدرسے کی انتظامیہ اگر معلمہ یا ناظم مدرسہ کو رہائش دینا ہی چاہتے ہیں تو اپنی جیب سے انہیں کرائے پر مکان لے کر دے دیں مال وقف سے نہیں۔

چندہ جس مقصد کے لئے جمع کیا گیا ہے، اسے اس کے بجائے دوسرے مصارف پر صرف کرنا

سوال: 40

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ستائیسویں شب کو ختم قرآن کے سلسلہ میں چندہ جمع کیا گیا اور اس چندہ کو مختلف جگہوں پر خرچ کیا گیا ،مثلاً 8000ہزار روپے کے بجلی، گیس وغیرہ کے بل ادا کئے گئے اور مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے ٹینٹ لگایا گیا، تو اس کا بھی کرایہ ختم قرآن سے نکالا گیا اور جمعدار کو 500سو روپے ختم قرآن سے دیا گیا اور اعتکاف والوں کو پھول کے ہار پہنائے گئے۔براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بتائیے ۔(حبیب اللہ چشتی ،اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

چندہ یا عطیہ جمع کرنے میں ہمیشہ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ جس کام کے لئے جمع کیا گیا ہے صرف اسی کام میں خرچ کیا جائے، کسی دوسرے کام میں خرچ نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس کام میں خرچ کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے، تو جن لوگوں سے چندہ لیا گیا تھا، ان کو واپس لوٹا دیا جائے یا ان لوگوں سے اجازت لیکر اسے دوسرے کام میں خرچ کیا جائے۔

اگر محض ختم قرآن کے نام سے چندہ جمع کیا گیا تھا تو اس رقم سے دوسرے امور کی ادائیگی نہیں کی جاسکتی، ہاں اگر چندہ لیتے وقت، دینے والوں سے یہ اجازت لے لی گئی ہو کہ وہ اس رقم کے خرچ میں یہ اختیار دے دیں کہ جس نیک کام میں مناسب سمجھیں، عطیہ جمع کرنے والے اس رقم کو وہاں خرچ کرنے کے مختار ہوں گے تو اس صورت میں اس رقم کو دیگر مصارف میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے میلاد و ایصال ثواب کے لئے کئے جانے والے چندے میں سے فاضل چندے کے مصرف سے متعلق سوال ہوا، آپ نے جواب میں فرمایا: ''ایسے چندوں سے جو روپیہ فاضل بچے، وہ چندہ دہندان کا ہے انہیں کی طرف رجوع لازم ہے، وہ دیگ وغیرہ جس امر کی اجازت دیں، وہی کیا جائے۔ان میں جو نہ رہے اس کے عاقل بالغ وارثوں کی طرف رجوع کیا جائے، اگر ان میں کوئی مجنون یا نابالغ ہے تو باقیوں کی اجازت صرف اپنے حصص کے قدر میں معتبر ہوگی، صبی و مجنون کا حصہ خواہی نخواہی واپس دینا ہوگا، اور اگر وارث بھی معلوم نہ ہوں تو جس کام کے لئے چندہ دہندوں نے دیا تھا، اسی میں صرف کریں، وہ بھی نہ بن پڑے تو فقراء پر تصدق کردیں، غرض بے اجازت مالکان دیگ لینے کی اجازت نہیں۔ درمختار میں ہے: ان لم یکن بیت المال معموراً او منتظمافعلی المسلمین تکفینه فان لم یقدر واسألو االناس له ثوبا فان فضل شئی رد للمتصدق ان علم والا کفن به مثله والا تصدق به مجتبیٰ۔

ترجمہ: ''اگر بیت المال میں مال نہ ہو یا کوئی منتظم نہ ہو تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو کفن پہنائیں اور اگر کوئی قادر نہ ہو تو لوگوں سے چندہ لیا جائے اور کفن کے چندہ سے کچھ بچ جائے تو یہ چندہ دینے والا معلوم ہو تو اسے لوٹا دیا جائے ورنہ اس سے ایسے ہی

فقیر کو کفن پہنا دیا جائے، یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی فقیر کو صدقہ کر دیا جائے، مجتبیٰ۔

ردالمحتار میں ہے:(قوله والا کفن به مثله)هذا لم يذكره في "المجتبیٰ" بل زاده عليه في البحر عن التجنيس والواقعات قلت وفي مختارات النوازل لصاحب الهداية فقير مات فجمع من الناس الدراهم و كفنوه وفضل شئی ان عرف صاحبه يرد عليه والا يصرف الى كفن فقير اخر او يتصدق به۔

ترجمہ: ماتن کا قول کہ اسی جیسے فقیر کو پہنا دیا جائے، یہ عبارت مجتبےٰ میں مذکور نہیں بلکہ یہ ''البحر الرائق'' میں ''تجنیس'' اور ''واقعات'' کے حوالے سے مذکور ہے میں کہتا ہوں اور صاحب ہدایہ کی کتاب ''مختارات النوازل'' میں ہے کہ فقیر فوت ہوا تو لوگوں نے چندہ جمع کر کے اس کو کفن دیا اور چندہ بچ گیا، اگر اس زائد چندہ والے شخص معلوم ہو تو اسے واپس کیا جائے، ورنہ اس کو کسی دوسرے فقیر کے کفن میں خرچ کیا جائے یا پھر صدقہ کر دیا جائے۔

اسی طرح اور کتب میں ہے:

ترجمہ: ''قلت (میں کہتا ہوں) ردالمحتار میں ''مختارات'' کی عبارت نقل کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ کسی فقیر کو کفن پہنانے یا صدقہ کرنے میں ترتیب مذکور نہیں ہے، جیسا کہ شرح میں ہے، اقول (میں کہتا ہوں) لیکن خانیہ پھر ہندیہ میں ہے کہ اگر زائد چندے والا معلوم ہو، تو اسے واپس کیا جائے اور اگر معلوم نہ ہو تو پھر کسی اور محتاج کو کفن دیا جائے، اور اگر کسی کفن میں صرف کرنا مقدور نہ ہو تو فقراء پر صدقہ کیا جائے تو یہ عبارت ترتیب کے لئے نص ہے، اس میں شک نہیں کہ اس ترتیب کے اپنانے سے یقیناً عہدہ برآں ہو سکتا، پھر یہ اگرچہ وقف نہیں تو اسکے مشابہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ چندہ دینے والے مالک کی غرض کو پورا کرنا زیادہ محکم ہے، اسی لئے ہم نے

اس ترتیب کو قابلِ اعتماد قرار دیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص: 134 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس مصرف کے لئے چندہ لیا گیا ہے، اسی پر خرچ کرنا شرعاً لازم ہے، اور اگر اس مصرف سے رقم بچ جائے تو بقیہ رقم یا تو چندہ دینے والوں کو واپس کر دی جائے ورنہ اگر چندہ دہندگان دستیاب نہ ہوں تو اس رقم کو فقراء پر صدقہ کر دیا جائے۔

مسجد کا استعمال شدہ سامان کسی دوسری مسجد میں دینا

سوال: 41

ہماری مسجد میں لاتعداد قرآن پاک، صفیں اور مدرسہ میں قرآن پاک رکھ کر پڑھنے والی بنچیں ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمیں مشورہ دیں کہ آیا ہم یہ مسجد کا سامان کسی اور مسجد یا مدرسہ میں دے سکتے ہیں جہاں ان چیزوں کی ضرورت ہو؟ ،(انتظامیہ جامع مسجد نورانی ۔لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

مسجد میں پڑھنے کے لئے جو قرآن مجید کے نسخے رکھے جاتے ہیں، اگر کمیٹی کے لوگ چاہیں تو انہیں دوسری مسجد کو بھی دے سکتے ہیں، کہ وہ صرف اسی مسجد میں قرأت کرنے کے لئے موقوف نہیں ہوں گے علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: انہ لو وقف مصحفاً علی المسجد جاز ویقرء فی ذلک المسجد وفی موضع آخر ولا یکون مقصوراً علی ھذ االمسجد فھذا یدل علی عدم تعیین المکان ۔

ترجمہ: "جب کوئی مصحف (قرآن مجید کا نسخہ) کسی مسجد کے لئے تلاوت کی غرض سے وقف کیا تو جائز ہے کہ اس مسجد والے اس قرآن کی اسی مسجد میں تلاوت کریں اور دوسری جگہ بھی تلاوت کر سکتے ہیں، صرف اسی مسجد کے لئے مخصوص نہیں ہوگا، پس یہ

تعیین مکان کی نفی پر دلیل ہے، مزید لکھتے ہیں کہ: وأما الحصير والقناديل فالصحيح من مذهب ابي يوسف أنه لا يعود الى ملك متخذه بل يحول الى مسجد آخر أو يبيعه قيم المسجد للمسجد ۔

ترجمہ: ''چٹائیاں اور قندیلیں اگر مسجد کے لئے بے کار ہو جائیں تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ دینے والے کی ملک کی طرف نہیں لوٹیں گی بلکہ کسی دوسری مسجد کو دے دی جائیں گی یا متولی مسجد انہیں مسجد کے کام میں صرف کر دے، (البحر الرائق ،جلد 5،ص: 381،ص: 421 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لہٰذا جب ضرورت سے زائد قرآنی نسخے موجود ہوں تو ان کو کسی دوسری مسجد یا ایسی جگہوں پر جہاں پڑھنے والے زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے ہوں اور ان کو قرآن کی ضرورت ہے، تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح چٹائیاں اور ڈیسک بھی اگر مسجد کے استعمال کے لئے کارآمد نہ ہوں، تو دوسری مسجد کو دیئے جاسکتے ہیں اور متولی مسجد انہیں فروخت کر کے دیگر مصالح مسجد کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔

خزانچی کے گھر سے مسجد کی رقم کی چوری

سوال: 42

مسجد کمیٹی کے خزانچی یا دوسرا ذمہ دار جس کے پاس مسجد کا فنڈ موجود ہوتا ہے، اسکے گھر پر ڈکیتی پڑی اور ڈاکو مسجد کا فنڈ بھی لے گئے جو کہ تقریباً پچیس ہزار اور گھر کا دیگر سامان، T.V، کمپیوٹر، زیورات، موبائل وغیرہ لے گئے ۔اب کمیٹی کا ذمہ دار یہ فنڈ مسجد کو دے گا یا معاف ہو جائے گا؟، (محمد توفیق، C-11 بلاک N نارتھ ناظم آباد ،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص (خزانچی یا ذمہ دار) کی حیثیت امین کی سی ہے اور مسجد کا مال اس کے پاس بطور امانت تھا لہذا اگر اس نے اس کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تو اس پر کوئی ضمان نہیں اور صورت مسئولہ سے یہی ظاہر ہے کہ اس کی جانب سے کوئی غفلت نہیں پائی گئی۔ ہاں اگر حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی کی تو ضمان ہوگا جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: اگر متولی نے کوئی بے احتیاطی نہ کی تو اس پر تاوان نہیں لانہ کالوصی امین فالقول قولہ بیمینہ۔ (کیونکہ وہ (متولی) وصی کی طرح امین ہے تو قسم کے ساتھ اس کی بات مان لی جائے گی) اور اگر بے احتیاطی کی مثلاً صندوق کھلا چھوڑ دیا غیر محفوظ جگہ رکھا تو اس پر تاوان ہے لان الامین بالتعدی ضمین۔ (کیونکہ حد سے تجاوز (لاپرواہی اور بے احتیاطی) کی وجہ سے امین پر ضمان لازم ہوتا ہے) (فتاوی رضویہ جلد 16 ص: 570 رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

لیکن یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آیا قواعد وضوابط کی رو سے اتنی رقم خزانچی صاحب کو گھر میں رکھنے کا اختیار ہے اور انہیں اس کی اجازت ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس پر کوئی ضمان نہیں ہے، ورنہ یہ بلا اختیار اتنی رقم گھر میں رکھنا اس کی جانب سے تعدی (اختیارات وحدود سے تجاوز) میں شامل ہوگا اور اس پر ضمان آئے گا اور اگر یہ عمل پوری انتظامیہ کی اجازت سے ہے تو وہ سب اس ذمہ داری میں شریک ہوں گے۔

مسجد اور مسلک

سوال: 43

ہمارے علاقے کی جامع مسجد ابو ہریرہ واقع سیکٹر V گلشنِ معمار 1996ء

میں ٹرسٹ ہوئی یہ مسجد مسلک حقہ اہلسنت وجماعت حنفی بریلوی کے نام سے ٹرسٹ ہوئی اس مسجد کا مکمل انتظام مسلک حقہ اہلسنت حنفی بریلوی کے زیرِ انتظام چلایا جاتا ہے چند دن پہلے مسجد انتظامیہ نے سائن بورڈ سے لفظ بریلوی مٹوا دیا ان سے جب پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ ہم نے بریلوی لکھ کر اپنے آپ کو بریلویت تک محدود کر لیا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قول وفعل سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، کیونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس میں سب کو نماز پڑھنے کا حق ہے اس لئے لفظ بریلوی مٹا دیا گیا ہے۔اب چونکہ لفظ بریلوی مٹانے پر تنازعہ شروع ہو چکا ہے، لہٰذا آپ سے التماس ہے کہ دلائل کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ کیا مسجد انتظامیہ کا مذکورہ بالا موقف درست ہے، جبکہ یہ لفظ پہلے سے ٹرسٹ دستاویزات میں بھی تحریر شدہ ہے کیا اس کو دوبارہ لکھوا دیا جائے یا ضروری نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں، (محمد آفتاب قادری، سیکٹر V گلشنِ معمار، کراچی)۔

جواب:

ہمارے نزدیک دینِ اسلام کے صراطِ مستقیم کی صحیح تعبیر کا حامل مسلک اہلسنت وجماعت ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث مبارک سے مستفاد ہے جس میں آپ ﷺ نے فرقۂ ناجیہ (یعنی آخرت میں نجات پانے والے مکتبۂ فکر) کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ: "ما انا علیه و اصحابی" یعنی فرقۂ ناجیہ وہ کہلائے گا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریق (حق) پر قائم وثابت ہو، اس کو ہم "اہل سنت و جماعت" سے تعبیر کرتے ہیں، اب اہل سنت وجماعت میں چار مسلّمہ مکاتب فکر ہیں، جنہیں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کہا جاتا ہے، پاکستان میں چونکہ غالب اکثریت حنفی مکتبۂ فکر کی ہے، اس لئے امتیاز کے لئے "سنی حنفی" بھی لکھا جاتا ہے۔لیکن چونکہ "اہل

سنت و جماعت'' یا ''سُنی حنفی'' میں بھی پاکستان کے تناظر میں ایک ابہام رہ جاتا ہے، کیونکہ برصغیر پاک وہند کے عرف میں سنی حنفی مکتبۂ فکر کے دو گروہ ہیں، ایک کو عرف عام میں بریلوی کہا جاتا ہے، جو امام احمد رضا خان قادری حنفی بریلوی قدس سرہم العزیز کی طرف منسوب ہے کیونکہ اس وقت کے ہندوستان کے تناظر میں بعض کلامی و اعتقادی مسائل پر اختلاف ہوا اور بعض علماء کی عبارات سے توہین الوہیت و رسالت کا ابہام و تاثر پیدا ہوتا تھا، جس کی نشاندہی انہوں نے فرمائی اور متنبہ فرمایا، اس کے مقابل ایک مکتبۂ فکر علماء دیوبند کی طرف منسوب ہو کر دیوبندی کہلایا۔ اب یہ تقسیم عرف جدید ہے اور عوام و خواص میں شائع و ذائع ہے۔ اور بعض مساجد کے ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد یا انجمن اساسی دستاویزات میں بھی لکھ دیا جاتا ہے اور بعض جگہ مساجد کے بورڈ پر بھی لکھا ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ بعد میں فرقہ وارانہ تنازعات کا سدِ باب ہو سکے، جس مسجد کی بنیاد جس نے ڈالی ہے وہ اسی کے پاس رہے اور اسی کا استحقاق تسلیم کیا جائے، لہٰذا مستقبل کے تنازعات کو رفع کرنے، مسجد کو باہمی آویزش سے بچانے کے لئے پاکستان کے عرف عام کے تناظر میں بریلوی لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ درس، تقریر اور خطابات میں ائمہ و خطباء کو مثبت انداز بیان اختیار کرنا چاہئے، اپنے مسلک کی حقانیت کو کتاب و سنت اور فقہ حنفی کے دلائل سے مزین کر کے بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی کراہت اور عذر کی بنا پر جواز کی صورتیں

سوال: 44

ہماری مسجد سے متصل جنازہ گاہ ہے، جس میں میت کو لانے کے لئے باہر سے دروازہ ہے اور نمازی حضرات کے لئے مسجد ہی سے دروازہ ہے، بعض اوقات

جنازہ گاہ بھر جاتی ہے اور بقیہ نمازی مسجد میں صف بنا لیتے ہیں ایک صاحب کا کہنا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے یہ گناہ کا کام ہے براہِ کرم واضح فرمایئے کیا ایسی صورت میں دیگر شرکاء مسجد میں صف بنائیں یا نمازِ جنازہ سے محروم رہیں؟۔(انتظامیہ جامع مسجد غوثیہ، آگرہ تاج کالونی لیاری، کراچی)۔

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من صلیٰ علی جنازۃ فی المسجد فلا شئی لہ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لئے کوئی (اجر) نہیں ہے، (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 3184)''۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ، امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی، علامہ ابن ہمام نے کراہتِ تنزیہی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ افضل اور اولیٰ کا خلاف ہے، یعنی مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا بھی مباح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ خارجِ مسجد پڑھی جائے، (فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد:2، ص:1026)''۔

علامہ خوارزمی لکھتے ہیں:''اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے: من صلیٰ علی جنازۃ فی المسجد فلا شئی لہ ۔ اس حدیث میں ظرف (فی المسجد) کا تعلق اگر صلیٰ کے ساتھ کیا جائے تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہوگا (کیونکہ

ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر میت کی نمازِ جنازہ پڑھی ،خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا مسجد سے باہر، اگر نمازی مسجد کے اندر کھڑا ہے تو یہ نماز جنازہ بہر صورت مکروہ ہے)اور اگر ظرف (فی المسجد) کو جنازہ کی صفت بنایا جائے ،تو پھر صرف اس وقت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہوگا جب جنازہ مسجد میں رکھا ہوا ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کراہت کی علّت یہ ہو کہ مسجد کو صرف فرض پڑھنے کے لئے بنایا گیا ہے،تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے،اور اگر کراہت کی علّت یہ ہو کہ مسجد (میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی صورت میں مسجد) کے نجاست میں آلودہ ہونے کا خدشہ ہے،تو جب جنازہ مسجد سے باہر ہوتو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا ،شمس الائمہ نے مبسوط میں اسی طرف میلان کیا ہے، (کفایہ مع فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم،علامہ غلام رسول سعیدی،جلد:2،ص:291028,)"۔

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی لکھتے ہیں:وعندنا اذا کانت الجنازۃ خارجَ المسجد لم یکرہ ان یصلی الناس علیہا فی المسجد انما الکراھۃفی ادخال الجنازۃ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جَنِّبُوْ امساجدَکم صبیانَکم ومجانیَکم فاذا کانَ الصبیُّ یُنْھٰی عن المسجد فالمیّتُ اولیٰ۔

ترجمہ:"جب جنازہ مسجد سے باہر ہوتو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، کراہت صرف میت کو مسجد کے اندر داخل کرنے میں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :بچوں اور پاگلوں کو اپنی مسجد سے دور رکھو، جب بچوں کو مسجد سے دور رکھنے کا حکم ہے،تو میت کو دور رکھنا اولیٰ ہے،(المبسوط جلد 2ص: 68،مطبوعہ دارالمعرفۃ ،بیروت)"۔

علامہ سید طحطاوی لکھتے ہیں:وکلام شمس الائمہ السرخسی یفیدان ھذا ھو

المذهب حيث قال وعندنا ان كانت الجنازة خارج المسجد لم يكره ان يصلى عليها فی المسجد ۔

ترجمہ:"شمس الائمہ سرخسی کی (اس) عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ احناف کا مذہب (مختار) یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر جنازہ مسجد سے باہر ہو تو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح جلد 2 ص:240 المکتبۃ الغوثیہ، کراچی)"۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وکرهت تحريماً) وقيل (تنزيها فی مسجد جماعةهو) ای الميت (فيه) وحده او مع القوم (واختلف فی الخارجة) عن المسجد وحده او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً۔

ترجمہ:"اور ایسی مسجد میں جہاں جماعت کا اہتمام ہو، (نمازِ جنازہ) مکروہ تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہِ تنزیہی ہے، خواہ صرف میت مسجد میں رکھی یا میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، جب صرف میت مسجد سے باہر رکھی ہو (اور نمازی مسجد کے اندر ہوں) یا میت کے ساتھ کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں (اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں) تو اس صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے، اور مختار قول یہ ہے کہ بہر صورت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، (یعنی میت اور سب نمازی مسجد کے اندر ہوں یا میت اور بعض نمازی مسجد سے باہر ہوں اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں مگر ظاہر ہے کہ کراہت صرف ان نمازیوں کے حق میں ہوگی، جو مسجد کے اندر کھڑے ہیں)۔ درمختار کی اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران اس امر پر بھی کلام کیا ہے کہ حدیث پاک" من

صلیٰ علی جنازة فی المسجد فلا شئی له ۔ ‘‘(یعنی جس نے مسجد میں میت کی نمازِ جنازہ پڑھی ،اس کے لئے کوئی اجر نہیں)اور ایک روایت میں ہے ’’فلیس له اجر ‘‘)۔اس حدیث میں ’’فی المسجد ‘‘میں تین احتمالات ہیں:(1)یہ کہ ظرف ’’صلیٰ ‘‘ سے متعلق ہو(تو معنی یہ ہوں گے کہ: جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر کسی میت کا جنازہ پڑھا،تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں ،(اس کی رو سے دونوں احتمالات یکساں ہیں،خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا خارجِ مسجد)،(2)یہ کہ ظرف ’’فی المسجد ‘‘میت سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی کی نماز جنازہ پڑھی، دراں حالیکہ میت مسجد میں رکھی ہو،تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں ،اس کی رو سے دونوں احتمالات کا یکساں حکم ہوگا،خواہ نماز پڑھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں یا خارجِ مسجد ۔(3)یہ کہ ظرف (فی المسجد) ’’صلیٰ ‘‘اور ’’میت ‘‘دونوں کے ساتھ متعلق ہو ،تو اس صورت میں جب نمازی اور میت دونوں مسجد میں ہوں گے،تو نمازِ جنازہ مکروہ ہوگی ،اور اگر کوئی ایک (نمازی یا میت)خارجِ مسجد ہے تو نماز مکروہ نہیں ہے ،(اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں: اور ان تمام صورتوں میں یہ مفہوم مذہبِ مختار کے خلاف ہے ،(کیونکہ مذہبِ مختار یہ ہے)مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے،(رد المحتار علی الدر المختار،ج:3،ص:118 ،دار احیاء التراث العربی ،بیروت)‘‘۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وصلاةُ الجنازة فی المسجد الذی تقام فیه الجماعة مکروهةٌ سواء کان المیت والقوم فی المسجد أو کان ا لمیتُ خارجَ المسجد والقوم فی المسجد او کان الامام مع بعض القوم خارجَ المسجد والقوم الباقی فی المسجد اوالمیت فی المسجد والامام والقوم خارج المسجد،

WWW.NAFSEISLAM.COM

هو المختار کذا فی الخلاصۃ۔

ترجمہ: ''جس مسجد میں نماز باجماعت (باقاعدگی سے) ہوتی ہو،اس میں نماز جنازہ مکروہ ہے،خواہ (1) میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، (2) یا میت مسجد سے باہر ہو اور نماز پڑھنے والے مسجد میں ہوں، (3) یا امام اور بعض نماز پڑھنے والے مسجد سے باہر ہوں اور باقی لوگ مسجد میں ہوں، یا میت مسجد میں ہو اور امام اور مقتدی مسجد سے باہر ہوں، یہی مذہب مختار ہے اور''خلاصہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد:1،ص:165 ،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

اگر بارش ہو رہی ہو تو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''ولا تکرہ بعذر المطر ونحوہ ھکذا فی الکافی''۔

ترجمہ: ''اور بارش یا اس جیسے دیگر اعذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص 165 ،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نماز جنازہ پڑھی جاسکے،ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کر کے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں،جبکہ شارع عام اور دوسرے کی زمین پر بلا اجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''تکرہ فی الشارع واراض الناس کذا فی المضمرات''۔

ترجمہ: ''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلا اجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص:165 ،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

تو جس طرح ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ بارش اور اس جیسے دیگر اَعذار کی بناء

پر مسجد میں نمازِ جنازہ مکروہ نہیں ہے،تو دیگر اَعذار میں جگہ کی تنگی یا کسی مقام پر کھلی جگہ کا بالکل نہ ہونا بھی اِن اَعذار میں شامل ہے۔لہٰذا ایسی صورت میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے اور بعض مساجد میں محراب کے آگے میت ،امام اور ایک یا چند صفوں کی لوگوں کے لئے جگہ ہوتی ہے،اور بقیہ لوگ مسجد کے اندر متصل صف بندی کرتے ہیں،بر بناءِ عذر یہ بھی جائز ہے اور مکروہ نہیں ہے پھر سڑک پر سب کا حق ہے،اسے لوگوں کی آمدورفت کے لئے بند کر دینا مستحسن نہیں ہے خواہ تقریبات کے لئے ہو،مجھے میرے استاد علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان کے استادِ مکرم محدث اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہم ایک تنگ راستے پر لے جارہے تھے اور ہم آگے سے لوگوں کو ہٹا کر راستہ بنا رہے تھے،آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو،راستے پر سب کا حق ہے۔آپ نے اپنے محلے اور مسجد کی جو صورتِ حال بیان کی ہے کہ جنازہ گاہ موجود ہے اور جنازے کی نمازِ جنازہ گاہ ہی میں ادا کی جاتی ہے لیکن جگہ کی تنگی کے باعث کچھ نمازی متصلاً مسجد میں صفیں بنالیتے ہیں،جگہ کی تنگی کے عذر کی بنا پر یہ جائز ہے،البتہ جہاں مسجد سے باہر جنازہ گاہ یا کھلا میدان موجود ہو اور سب نمازی جنازہ گاہ میں سما جاتے ہوں،وہاں پر مسجد میں مطلقاً نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے اور جو مسجد صرف جنازہ گاہ کے طور پر بنائی گئی ہے،وہاں پر مطلقاً نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

نامکمل وقف

سوال : 45

میری ملکیت ایک پلاٹ تھا جس کا K-D-A کے کاغذات کے مطابق ایک اور دعوے دار موجود تھا مطلب کہ پلاٹ متنازعہ تھا ہمارے علاقے میں مدرسے کی ضرورت تھی میں نے وقتی طور پر فی الحال کی نیت سے مدرسے والوں کو پلاٹ کی فائل

WWW.NAFSEISLAM.COM

دی، گھر والوں کو خبر ہوئی تو زوجہ نے کہا کہ پلاٹ تو آپ نے بچی کے نام کرنے کی نیت سے لیا تھا اب میں فائل واپس مانگتا ہوں تو مدرسے کے منتظمین فتویٰ مانگتے ہیں ،کہتے ہیں کہ وقف کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاسکتی مگر میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے وقف یا ھبہ نہیں کیا تھا صرف وقتی طور پر فائل دی تھی دوسری بات یہ کہ قانونی طور پر متنازعہ پلاٹ مسجد یا مدرسے کو نہیں دیا جاسکتا، برائے کرم رہنمائی فرمائیں میں کافی عرصے سے پریشانی کا شکار ہوں، (سید محفوظ علی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

وقف یا ھبہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ واقف (وقف کرنے والا) وقتِ وقف اس شے کا مالک ہو، جسے وہ وقف کر رہا ہے اگر وقتِ وقف مالک نہ تھا اور پھر مالک ہوگیا، جب بھی یہ وقف درست نہیں ہوگا۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :

ومنها الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه أو صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفاً كذا في البحر الرائق۔

ترجمہ:"(وقف کی شرائط میں سے)ایک شرط یہ بھی ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اس شے کا مالک ہو یہاں تک کہ اگر کوئی (شخص کسی) زمین کو غصب کر کے وقف کردے پھر اس کے مالک سے اس زمین کو خرید لے اور قیمت مالک کو ادا کردے یا کچھ دینے پر مصالحت کرلی تو یہ وقف (درست)نہیں ہوسکتا،"البحر الرائق" میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2ص:353 مکتبہ رُشیدیہ، کوئٹہ)"۔

وقف کے لئے مخصوص الفاظ ہیں جن سے وقف صحیح ہوتا ہے، مثلاً میری یہ

جائیداد وصدقۂ موقوفہ ہے کہ ہمیشہ مساکین پر اس کی آمدنی صرف ہوتی رہے یا اللہ تعالٰی کے لئے میں نے اسے وقف کیا۔ مسجد یا مدرسہ یا فلاں نیک کام پر میں نے وقف کیا یا فقراء پر وقف کیا۔ اس چیز کو میں نے اللہ کی راہ کے لئے کردیا۔ صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو یہ وقف نامکمل ہے محض فائل دینے سے وقف مکمل نہیں ہوتا، مدرسہ والوں کو چاہیۓ کہ آپ کی فائل واپس کردیں،فقط واللہ اعلم بالصواب۔

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الجنائز﴾

غسل میت سے پہلے ایصال ثواب یا قرآن خوانی

سوال: 46

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور لوگ فوری طور پر قرآن خوانی کرنا چاہیں تو کیا اس کی اجازت ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب تک میت کو غسل نہ دیا جائے، قرآن خوانی کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ ازراہِ کرم رہنمائی فرما دیجیے، (سید عابد علی، کراچی)۔

جواب:

فی نفسہٖ زندہ یا مردہ کسی بھی شخص کے لئے کسی بھی وقت میں ایصالِ ثواب یا دعائے مغفرت کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہو تو غسل یا تدفین سے پہلے اس کے لئے دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب جائز ہے، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ فقہاءِ کرام نے اس پر بحث کی ہے کہ میت سامنے رکھی ہو اور ابھی اسے غسل نہ دیا ہو تو اس کے سامنے اسی مقام پر تلاوت قرآن کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ فقہاء نے اس پر گفتگو کی ہے اور اس کی وجوہ پر بحث کی ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: بلکہ جن کے نزدیک موت سے بدن نجس ہو جاتا ہے اور غسل میت اُسے نجاستِ حقیقیہ سے تطہیر کے لئے رکھا گیا ہے، وہ قبل غسل میت کے پاس بیٹھ کر تلاوت کو منع کرتے ہیں جب تک اسے بالکل ڈھانک نہ دیا جائے کہ نجاستِ منکشفہ کا قرب ہوگا، تنویر میں ہے:

کرہ قرأۃ القرآن عندہ الی تمام غسلہ۔

ترجمہ: ''میت کوغسل دینے تک اس کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے''۔ درمختار میں ہے:

علله الشرنبلالي في امدادالفتاح تنزيها للقرآن عن نجاسة الميت لتنجسه بالموت قيل نجاسة خبث وقيل حدث وعليه فينبغي جوازها كقراءة المحدث۔

ترجمہ: امدادالفتاح میں علامہ شرنبلالی نے اس کی یہ علت بیان فرمائی کہ قرآن مجید کو میت کی نجاست اور ناپاکی سے بچایا جائے، کیونکہ وہ (میت) موت کی وجہ سے ناپاک ہوجاتی ہے، پھر اس نجاست میں اختلاف ہے، چنانچہ بعض نے کہا کہ یہ نجاست خبث ہے جبکہ بعض کے نزدیک حدث ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر لازم ہے کہ میت کے پاس تلاوت قرآن مجید جائز ہو، جیسے بے وضو کا یاد سے قرآن پڑھنا۔

ردالمحتار میں ہے: وذكر ان محل الكراهة اذا كان قريبا منه اما اذا بعد عنه فلا كراهة قلت والظاهر ان هذا ايضا اذالم يكن الميت مسجى بثوب ليستر جميع بدنه۔

ترجمہ: ''علامہ طحطاوی نے ذکر کیا کہ اس کراہت کا محل یہ ہے کہ جب (تلاوت کرنے والا) میت کے قریب بیٹھا ہو، لیکن جب وہ اس سے دور بیٹھا ہے، (اور قرآن مجید پڑھ رہا ہے) تو پھر کراہت نہ ہوگی، میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ کراہت بھی تب ہوگی جب میت کسی ایسے کپڑے سے جو اس کے سارے جسم کو چھپائے ڈھانپی ہوئی نہ ہو۔ (فتاویٰ رضویہ جلد: 23، ص: 453 - 454، مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن ، لاہور)''۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس بحث کا مستفاد یہ ہے کہ فی نفسہٖ غسل میت سے پہلے میت سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھ کر میت کے لئے ایصال

ثواب کرنے یا قرآن خوانی کی کوئی ممانعت نہیں ہے، ہاں اگر میت کے قریب بیٹھ کر تلاوت کریں اور میت کو کپڑے یا چادر سے ڈھانپ کر رکھ دیا گیا ہو، تب بھی حرج نہیں ہے، ہاں اگر میت کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا نہیں ہے، کھلی ہے، تو اس میں فقہاء کرام کے دو اقوال ہیں، جو اسے بے وضو (محدث) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک جائز ہے اور جو اسے خبث (نجاستِ حقیقی) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہاں پر تلاوت مکروہ ہے۔

مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین

سوال: 47

کسی شخص کے انتقال کے بعد تدفین کے وقت مصنوعی دانتوں (جو کہ فکس ہیں اور نکالے نہیں جا سکتے)، کے ساتھ دفن کیا جا سکتا ہے، (جمال سیکٹر 7D-3، نارتھ کراچی)۔

جواب:

مسلمان میت کی تجہیز و تکفین، تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے، کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے۔ مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ فتح القدیر، جلد: 2، ص: 102، (مکتبۂ نوریہ رضویہ سکھر) میں فرماتے ہیں: توضیحہ الاتفاق علی انّ حرمة المسلم میتاً کحرمته

WWW.NAFSEISLAM.COM

حیاً۔ ترجمہ:اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت وحرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے۔(ت)۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:کسر عظم المیت واذاہ ککسرہ حیاً۔ رواہ امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ باسناد حسن عن اُمّ المؤمنین عائشہ الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ترجمہ:"مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا"۔یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیہ فی قبرہ مما یؤذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ:"سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں:افادان حرمۃ المؤمن بعد موتہ باقیۃ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ رواہ ابی بکر بن ابی شیبۃ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔علماء فرماتے ہیں:المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی۔ کذا فی ردّالمحتار وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے،مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں،جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔(ت) علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں:ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت متالم میگردد بجمیع انچہ متالم میگردد بدان حی ولازم اینست کہ متلذذ گردد بتمام انچہ متلذذ می شود بدان زندہ، انتہی۔اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (ت)۔

(فتاوی رضویہ، جلد 9، ص: 441-442، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ''کاٹا مردے کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟، اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

ناجائز ہے، فی الدر لا یسرح شعرہ ای یکرہ تحریما ولا یقص ظفرہ الا المکسور ولا شعرہ ولا یختن ، وفی ردالمحتار عن النہر عن القنیۃ التزیین بعد موتہا و الامتشاط وقطع الشعر لا یجوز ۔ و اللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھانہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مگر وہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، ردالمحتار میں 'نہر' سے، اس میں 'قنیہ' سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زینت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا ناجائز ہے، (فتاوی رضویہ، جلد 9، ص: 91-92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نہ صرف میت کی تعظیم وتکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم و ادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لأن یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ حتی تخلص الی جلدۃ خیرلہ من أن یجلس علی قبر"۔

ترجمہ: ''ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس

سے کہ قبر پر بیٹھے،(ابو داؤد، رقم الحدیث : 3220،مطبوعہ موسسۃ الریان بیروت)"۔

عن عقبة بن عامر،قال: قال رسول الله ﷺ:لأن امشي على جمرة أو سيف،أو اخصف نعلي برجلي،أحبّ اليّ من ان امشي على قبر مسلم۔ وما أبالي اوسط القبور قضيت حاجتي،أو وسط السوق"

ترجمہ:"عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا، بہ نسبت اس کے کہ قبرِ مسلم پر چلوں،اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ،رقم الحدیث:1568،مطبوعہ دارالفکر بیروت)"۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ مصنوعی دانت اس طور پر نصب کیے ہوئے ہیں جنہیں نکالا نہیں جاسکتا،اور انہیں نکالنے کی کوشش کرنا میت کو اذیت دینا ہے،اور میت کو اذیت دینا جائز نہیں ہے،لہٰذا مصنوعی دانتوں کے ساتھ میت کی تدفین جائز ہے۔

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت

سوال: 48

کیا شریعت میں پوسٹ مارٹم کی اجازت ہے؟،اگر اجازت ہے تو قرآن پاک یا حدیث میں ہے اس کی کوئی مثال موجود ہے؟۔

سوال: 49

کیا شہید کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟،کیونکہ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ سر(چہرے) سے لے کر پیٹ تک اس کو کاٹتے ہیں،صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ گولی سے مرا ہے یا کسی چاقو سے یا گولی کتنی دور سے لگی ہے یا زخم کتنا گہرا ہے۔اور اس کے

WWW.NAFSEISLAM.COM

بعد قانون میں اتنا ہے کہ یہ میڈیکل رپورٹ صرف موت کا سبب جاننے کے لئے کی جاتی ہے،اور قانون میں صرف اس رپورٹ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا یہ تو صرف گواہوں کی گواہی سے مشابہت کرنے کے لئے ہوتی ہے، کہ واقعی گواہان سچ بول رہے ہیں کورٹ میں۔

سوال: 50

کیا کسی بھی آدمی (مردہ) کو قبر سے نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے،شریعت اجازت دیتی ہے؟ یہ سب اور آپ کو تو معلوم ہے کہ پاکستان میں میڈیکل رپورٹس کیسے دی جاتی ہیں، کیا اس کے باوجود بھی پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟، (منصور علی ایڈوکیٹ،ڈسٹرکٹ لاڑکانہ تحصیل میرو خان ولیج نیو ٹھارو ودھو)۔

جواب:

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پیشتر مسلمان میت کی حرمت سے متعلق ہم چند حوالے نقل کرتے ہیں: مسلمان میت کی تجہیز و تکفین ،تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے ،کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے ۔مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے ،امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے ۔محقق علی الاطلاق رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فتح القدیر ،(جلد:2،ص:102 ،مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر) میں فرماتے ہیں: و توضیحہ الاتفاق علی ان حرمۃ المسلم میتاً کحرمتہ حیاً۔ ترجمہ: اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت و حرمت زندہ

مسلمان کی طرح ہے۔(ت)۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کسر عظم المیت واذاہ ککسرہ حیّاً۔ رواہ امام احمد وابوداؤد و ابن ماجہ باسناد حسن عن اُمّ المؤمنین عائشہ الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

ترجمہ:"مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا"۔یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیہ فی قبرہ ما یؤذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ:"سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں:افادان حرمۃ المؤمن بعد موتہ باقیۃ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ رواہ ابی بکر بن ابی شیبۃ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔علماء فرماتے ہیں:المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی ۔کذا فی ردّالمحتار وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔(ت)علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت متألم میگردد بجمیع انچہ متألم میگردد بدان حی ولازم انست کہ متلذذ گردد بتمام انچہ متلذذ می شود بدان زندہ، انتہی۔اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے

کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 442-441، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا "کا ٹا مردے کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "نا جائز ہے، في الدر لا يسرح شعره اي يكره تحريما ولا يقص ظفره الا المكسور ولا شعره ولا يختن، وفي ردالمحتار عن النهر عن القنية التزيين بعد موتها و الامتشاط وقطع الشعر لا يجوز۔ والله تعالىٰ اعلمْ۔

ترجمہ: "درمختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھا نہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں مگر وہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، ردالمحتار میں "نہر" سے، اس میں "قنیہ" سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زینت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 9، ص: 92-91، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

نہ صرف میت کی تعظیم و تکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم و ادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: "لأن يجلس احدكم على جمرة فتحرق ثيابه حتى تخلص الى جلدة خيرله من أن يجلس على قبر"۔

ترجمہ: "ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابو داؤد، رقم الحدیث: 3220، مطبوعہ موسسۃ الریان بیروت)"۔

میت کے پوسٹ مارٹم کی ضرورت دو جگہ پیش آتی ہے،ایک ہے ضرورتِ تعلیم، اس کے لئے عام طور پر کسی لاوارث میت کو قبضے میں کرنے کے بعد میڈیکل کالج کے طلباء اس کے جسم پر آپریشن کی مشق کرتے ہیں اور اس کے جسم کے مختلف اعضاء پر طبّی نوعیت کے تجربات کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ سرجری کی مشق کے لئے جانوروں اور غیر مسلم اموات کو حاصل کرنا چاہئے اور مسلم اموات پر سرجری کی مشق کرنا جائز نہیں ہے اور غیر مسلم اموات کا حصول اس قدر دشوار نہیں ہوتا جس کی بنا پر مسلمان میت کی چیر پھاڑ کر کے اس کی بے حرمتی کی جائے۔

آج کل انسانی جان کو بچانے کے لئے سرجری اور آپریشن ایک ضروری طریقہ علاج ہے پتہ یا مثانہ میں پتھری کی صورت میں آپریشن کے ذریعے پتھری کو باہر نکالا جاتا ہے ،اگر گردہ خراب ہو جائے تو اس کو آپریشن کر کے باہر نکال دیتے ہیں،بعض دفعہ عورت کے پیٹ میں بچہ آڑا یا ترچھا ہوتا ہے اور اگر آپریشن کے ذریعے ڈلیوری نہ کی جائے تو ماں اور بچہ دونوں مر جاتے ہیں،بعض دفعہ جسم کے کسی عضو میں کوئی ناسور ہو جاتا ہے اور باقی جسم کو اس کے زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے اس عضو کو کاٹنا پڑتا ہے،بعض حادثات میں جسم کی مختلف ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اس موقع پر ہڈی جوڑنے کے لئے آپریشن ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح بم کے ٹکڑوں اور گولیوں کو جسم سے نکالنے کے لئے آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کی دوسری وجہ جو بالعموم پیش آتی ہے وہ ہے مقدمہ کی تحقیق اور کسی بے قصور مسلمان کو قتل کی سزا سے بچانے کا مسئلہ مثلاً ایک شخص کو پولیس نے پستول سمیت پکڑ لیا اور اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنے پستول سے فلاں شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے ،جبکہ ملزم یہ کہتا ہے کہ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی اور تمام شواہد اور قرائن ملزم کے

خلاف ہیں، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مقتول کے جسم میں جو گولی ہے آیا وہ اس نمبر کی گولی ہے جو ملزم کے پستول میں ہے یا کوئی اور گولی ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مقتول کے جسم میں ملزم کے پستول کی گولی ہے تو وہ قاتل ثابت ہو جائے گا اور اگر وہ گولی اس کے پستول کی نہیں ہے، تو وہ بری ہو جائے گا، ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ہے اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

مذکورہ بالا مسئلے کی تحقیق انتہائی مفصل انداز میں شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم (جلد دوم، ص: 830-823) میں کی ہے، جس کا خلاصہ ہم نے بیان کیا ہے۔ میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً زمین مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(لا یخرج منہ) بعد اهالة التراب (الا) لحق آدمی، (کأن تکون الارض مغصوبة أو أخذت بشفعة) و یخیر المالك بین اخراجه و مساواته بالأرض۔

ترجمہ: ”(میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کردے، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)“۔

تمام حوالہ جات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی

نہیں، بلکہ ضروری ہے (کیونکہ جب مسلمان میت کی حرمت اس قدر ہے جیسا کہ ہم نے اس فتویٰ کی ابتداء میں بیان کی ہے تو زندہ کی بدرجہ اولیٰ ہے) اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا

سوال: 51

ایک ایسی جگہ جہاں کسی بزرگ وولی کی قبر نہ ہو اور نہ ہی وہاں کوئی دفن ہو، بس اتنا کہا جاتا ہو کہ یہاں کسی زمانے میں گذرتے ہوئے کسی قافلے کا ایک بچہ غائب ہوگیا تھا (یہ معلوم نہیں کہ یہ بچہ ہندو، سکھ یا عیسائی ہے، جن کا تھا) زندہ پیر کا نام دے کر عرس کرنا منتیں چڑھانا ،صدقات دینا اور مقدس جان کر حاضری دینا، درختوں کا نہ کاٹنا، وہاں کی خاک کو شفایاب سمجھنا وغیرہ وغیرہ، جائز ہے یا ناجائز؟۔اب یہ جگہ محکمۂ اوقاف کے پاس ہے عرس تو نہیں ہوتا، لیکن عورتوں اور مردوں کی حاضری جیسے معاملات جاری ہیں۔اس صورتِ حال کو روکنا جائز ہے یا نہیں؟، (مولانا محمد جہانگیر صدیقی ،علیمیہ مسجد، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

جھوٹی قبر بنا کر اس کی تعظیم کرنا ناجائز ہے،امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ''کسی ولی اللہ کا مزار شریف فرضی بنانا اور اس پر چادر وغیرہ چڑھانا، اوراس پر فاتحہ پڑھنا اوراصل مزار کا سا ادب ولحاظ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ جواب میں لکھتے ہیں: فرضی مزار بنانا اور اس کے ساتھ اصل کا سا معاملہ کرنا ناجائز وبدعت ہے،مزید سوال ہوا کہ''زید نے ایک قبر فرضی اور مصنوعی، جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ تھا، بنوا کر یہ بات مشہور کی کہ اس قبر میں امروہہ کے زین العابدین تشریف

لائے ہیں، مجھ کوخواب میں بشارت ہوئی ہے،ایسی روایات ِکاذبہ سے اس قبر کی عظمت لوگوں کے سامنے بیان کر کے قبر پرستی کی طرف بلانے لگا،حتیٰ کہ اس میں اس کو کامیابی ہونے لگی اور بہت سی مخلوق اس کی طرف متوجہ ہوگئی ۔اس قبر پر چادریں اورمرغ اور بکری اور مٹھائیاں ، روپیہ اور پیسہ چڑھانے لگے،اوراپنی مرادیں اور منتیں اس قبر سے مانگنے لگےاورزیداس آمدنی سے متمتع ہوتا ہے،ایسے شخص کے واسطے شریعت کیا حکم لگاتی ہے''؟۔

آپ نے جواب دیا: ''قبر بلامقبور(یعنی جس میں کوئی دفن نہ ہو) کی طرف بلانا اور اُس کے لئے وہ افعال کرانا گناہ ہے،اور جبکہ وہ اس پر مصر ہےاور باعلان اسے کررہا ہےتو فاسقِ معلن ہےاور فاسق معلن کوامام بنانا گناہ اورپھیرنی واجب ۔اس جلسۂ زیارتِ قبر بے مقبور میں شرکت جائز نہیں ۔زید کے اس معاملے سے جوخوش ہیں خصوصاًوہ جومُمِدّ ومعاون ہیں،سب گناہ گاروفاسق ہیں، **قال اللہ تعالیٰ :ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان،** گناہ اورزیادتی پرایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔بلکہ وہ بھی جوباوصفِ قدرت ساکت ہے،قال اللّٰہ تعالیٰ :کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون ۔ وہ برے کام سےایک دوسرےکوروکتے نہ تھے،کیاہی براکام وہ کرتے تھے۔

ایک اورسوال کے جواب میں لکھتے ہیں: جھوٹا مزار بنانا اوراس کی تعظیم کرنا جائزنہیں، (فتاویٰ رضویہ،جلد9 ص:425،426،427 مطبوعہ رضافاؤنڈیشن،لاہور)''۔

مردہ پیداہونے والے بچے کےکفن دفن،غسل دینےاورنام رکھنےکامسئلہ

سوال: 52

اگرکوئی بچہ مسلمان کےگھر مردہ حالت میں پیداہوتوایسی صورت میں اس کی

تدفین کے بارے میں کیا حکم ہے کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا یا کسی الگ جگہ پر؟ اور اس کو غسل دینے اور نام رکھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ ،(طارق عزیز، دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب :

وہ بچہ جو ماں کے بطن سے مردہ حالت میں پیدا ہوا، یعنی دورانِ تولُّد یا بعد میں اس نے کوئی آواز نہیں نکالی، کوئی حرکت نہیں کی، سانس نہیں لیا، زندگی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تو اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، غسل دینا بہتر ہے، اسے معمول کا مسنون کفن دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس پاک کپڑے میں لپیٹ کر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کردیا جائے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ دیگر قبور کی وجہ سے اس میت کے آثار کی بے حرمتی کی نوبت نہیں آئے گی۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وان لم یستھل ادرج فی خرقة ولم یصل علیه ویغسل فی غیر ظاھر الروایة وھو المختار کذا فی الھدایة ۔

ترجمہ: ''اور اگر بچہ (مردہ پیدا ہوا اور) کوئی آواز نہیں نکالی تو اسے پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے اور اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، (فقہ حنفی کی ظاہر الروایہ میں تو اسے غسل دینا ثابت نہیں ہے لیکن) غیر ظاہر الروایہ کی ایک روایت میں ہے کہ اسے غسل دیا جائے گا، اور یہی (قول) مختار ہے اور ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:159، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والا) یستھل (غُسّل ویُسمّی) عندالثانی وھوالاصح، فیُفتٰی به علیٰ خلاف

ظاهر الرواية اكرماً لبنی ادم کمافی "ملتقی البحار" واذا ستبان بعض خلقه غُسّل وحشر وھو المختار۔

ترجمہ: اور اگر بچہ پیدا ہونے پر آواز نہ نکالے تو دوسری روایت کے مطابق اسے غسل دیا جائے اور نام رکھا جائے، یہی صحیح ترین ہے۔ اور بنی آدم کے اکرام کی خاطر "ظاہر الروایۃ" کے خلاف اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ "ملتقی البحار" میں ہے، ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 3، ص: 122)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "اکثر دیکھا گیا مرا ہوا بچہ کسی کے ہاں پیدا ہوتا ہے، اس کو ہانڈی میں رکھ کر گورستان سے علیحدہ دفن کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ پکا مسان (یعنی اس سے بد فالی مراد لیتے ہیں) ہے، اس سے اہل ہنود کی طرح بچتے ہیں، یہ کیونکر ہے؟۔

آپ نے جواب دیا: "یہ شیطانی خیال ہے اسے مسلمانوں کے گورستان ہی میں دفن کریں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9 ص: 390، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

مسلمان مرد یا عورت کا بچہ زندہ پیدا ہوا یعنی اکثر حصہ باہر ہونے کے وقت زندہ تھا، پھر مر گیا تو اس کو غسل و کفن دیں گے اور اس کی نماز پڑھیں گے ورنہ اسے ویسے ہی نہلا کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیں گے اس کے لئے غسل و کفن بطریقِ مسنون نہیں اور نماز بھی اس کی نہیں پڑھی جائے گی، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 335، 336، مطبوعہ مکتبۂ امجدیہ، کراچی)"۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴾کتاب الزکوٰۃ﴿

زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائی

سوال: 53

ایک شخص جو کہ قرض دار ہے اور بینک سے سود پر رقم قرض لی ہے گھر گروی ہے کچھ اور لوگوں کا پیسہ بھی دینا ہے جو کہ لاکھوں میں ہے، ضروریاتِ زندگی کی اشیاء گھر میں موجود ہیں۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی قریبی رشتے دار زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرض ادا کرنا چاہے تو کتنی رقم زکوٰۃ کی مد میں اسے دے سکتا ہے؟۔

سوال: 54

ایک شخص مختلف لوگوں سے قرض لیتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو جاتا ہے اس کے گھر کے افراد وہ قرض چکانے کی استطاعت نہیں رکھتے کیا کوئی قریبی رشتہ دار یہ قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کر سکتا ہے؟ (سعید غنی آرائیں، بلاک 5-E 62/10 نیو کراچی)۔

جواب:

ایسا قرض دار جس کے پاس ادائے قرض کے وسائل نہ ہوں اور قرض کی رقم اس کی موجودہ املاک سے زیادہ ہو اگر کوئی حسنِ سلوک کے طور پر اس کے قرض کی ادائیگی کرنا چاہے تو وہ اپنی استطاعت و صلاحیت کے مطابق کر سکتا ہے قرض کی رقم خواہ بینک کی ہو یا شخصی، قرض کے سلسلے میں برابر ہیں البتہ شخصی قرض میں سود نہیں ہونا چاہئے جبکہ بینک کے قرض میں سود دینا ہوتا ہے اس لئے یہ شخصی قرض سے بدتر ہوتا

ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی از زکوٰۃ کی رقم ھبہ یا قرض کہہ کر دینا

سوال: 55

کیا زکوٰۃ کی رقم ایسے عزیز کو دی جاسکتی ہے، جو اپنی قلیل تنخواہ کی وجہ سے مقروض ہے اور اس کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی ہے، مگر شادی کا خرچہ نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے، معلوم ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کی رقم لینے پر تیار نہیں ہوگا تو کیا اس کو بغیر بتائے، اس کے قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں، کیا اس طرح زکوٰۃ کی ادائی ہوجائے گی؟، (واجد حسین، A-286/1 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ کی صحیح ادائی کے لئے ضروری ہے کہ جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو، صاحبِ نصاب نہ ہو، سید نہ ہو، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ شخص ہے، جس کے پاس کم ازکم نصاب کے مساوی بنیادی ضروریات سے فاضل مال موجود نہ ہو، نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس ونادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرض بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور اسے یعنی مستحقِ زکوٰۃ شخص کو یہ بتائے بغیر بھی دی جاسکتی ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، جبکہ اندیشہ ہو کہ خودداری کی بنا پر نہیں لے گا، بلکہ ھبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے اور دل میں یہ نیت ہو کہ واپس

نہیں لوں گا،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن أعطى مسكيناً دراهم وسماها هبةً أو قرضاً ونوى الزكاةُ فانها تُجزيه وهو الاصح هكذا في البحرالرائق ناقلاً عن المبتغى و القنية ۔

ترجمہ:''اور جوشخص کسی مسکین (مستحق زکوٰۃ شخص) کوکچھ درھم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کردے کہ یہ ھبہ یا قرضہ ہےاور زکوٰۃ کی ادائی کی نیت کرلےتو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہےاور یہی قول صحیح ترین ہے''بحرالرائق'' میں ''المبتغی'' اور ''قنیہ'' سے اسی طرح منقول ہے،(فتاوی عالمگیری،جلد 1،ص: 171،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال: 56

میں نے زکوٰۃ کے پیسے رکھے تھے،جو ایک صاحب کو جو انتہائی مجبور تھے،ادھار میں دیدیئے،سوال یہ پوچھنا ہے کہ کیا زکوٰۃ میں سے رقم بطور ادھار دی جاسکتی ہے۔کیا سال گزرنے کے بعد جب ادھار دی ہوئی رقم مل جائے ،اس وقت زکوٰۃ دینے پر کوئی حرج تو نہیں؟،(محمد حامد علی،گلشن اقبال)۔

جواب:

اپنے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم نکال کر اسے اپنے پاس الگ رکھنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، بلکہ اسے مستحق تک پہنچانا اور اسے اس کا مالک بنانا ضروری ہے، اوراگراس رقم کو رکھے ہوئے سال گزرجاتا ہے،یا اسے آپ نے ادھار پرکسی کو دے رکھا ہے،تو آپ جب آئندہ سال کی زکوٰۃ ادا کریں گے،تو زکوٰۃ کی نیت سے الگ رکھی ہوئی یا کسی کو قرض دی ہوئی اس رقم پر بھی آپ کو زکوٰۃ ادا کرنی لازمی ہوگی۔اور

اگر آپ نے گذشتہ کئی سالوں سے اس رقم کی زکوۃ ادا نہیں کی تو مقدارِ واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم اگر نصاب کی مقدار کو پہنچتی ہے تو اس پر زکوۃ واجب ہے، مثلاً آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور سال گذرنے پر ساڑھے بارہ ہزار روپے زکوۃ واجب ہوگئی اور اس سال آپ نے زکوۃ ادا نہیں کی تو آئندہ سال کی زکوۃ جب ادا کریں گے تو مقدارِ واجب یعنی ساڑھے بارہ ہزار کو چھوڑ کر بقیہ چار لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو کی زکوۃ آپ پر واجب ہوگی۔ صورتِ مسئولہ میں زکوۃ کی نیت سے اپنے کل رقم میں سے جو پیسے آپ نے علیحدہ کئے اور پھر وہ رقم آپ نے دوسرے کو بطورِ قرض دے دی اب آپ آئندہ سال جب زکوۃ ادا کریں گے تو گذشتہ سال آپ کی رقم پر جتنی زکوۃ واجب تھی اس مقدارِ واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم پر زکوۃ واجب ہوگی، لہذا جو پیسے آپ نے قرض میں دیئے وہ کل رقم میں سے شمار نہیں ہونگے بلکہ قرض کی وصولیابی کے بعد گذشتہ سال کی زکوۃ کی مد میں ان کو خرچ کرنا واجب ہوگا۔

اسپتال کے لئے زکوۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری

سوال: 57

میرا ایک ہسپتال ہے اس میں غرباء، مساکین کا مفت علاج کیا جاتا ہے، آنکھوں کے علاج و آپریشن کا شعبہ بھی ہے۔ غیر مستحق افراد سے مناسب فیس اور خرچہ لیا جاتا ہے اس آمدنی سے بھی غرباء و مساکین کے علاج میں رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اب ہم ہسپتال میں آلات و مشینری وغیرہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں خصوصاً شعبہ امراضِ چشم میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکوۃ کی رقم سے آلات و مشنری برائے ہسپتال خریدی جاسکتی ہیں؟ (اخلاق احمد، پشاور)۔

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ آلات ومشینری زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق زکوٰۃ کی ملک کردی جائے اور وہ اسے آپ کے ہسپتال کو ھبہ کردے، پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا

سوال: 58

میں اپنی سالانہ زکوٰۃ میں سے محلے کے دو مدرسے اس طرح چلاتا ہوں کہ محلے کے بچے پڑھنے کے لئے آتے ہیں، کوئی رہائشی یا مسافر طالب علم نہیں ہے۔ لڑکوں کو معلم قاری صاحب اور لڑکیوں کو معلّمہ قاریہ صاحبہ پڑھاتی ہیں۔ ان دونوں کا ماہانہ وظیفہ، مدرسے کے لئے ڈیسکیں، پنکھا اور دیگر اخراجات زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرتا ہوں، گذشتہ دو سال سے اسی مذکورہ بالا طرز پر یہ دو مدارس میں چلا رہا ہوں، کیا میری ادا کردہ زکوٰۃ درست ہے؟، (حافظ فہیم احمد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۃ التوبۃ: 60 میں متعین فرما دیئے ہیں اور وہ آٹھ مدات ہیں:

(1) فقراء (2) مساکین (3) عاملین زکوٰۃ (4) مؤلفۃ القلوب (5) جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو، جس سے گلو

خلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) جو اپنے آپ کو ہمہ وقتی اللہ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ ودو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو (8) جو مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گئے ہوں کہ قوت لایموت دستیاب نہ ہو اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔ زکوۃ کا مال صرف اس پر صرف کیا جاسکتا ہے جو قرآن مجید میں بیان کردہ ان مدات میں سے کسی ایک کے تحت مستحق زکوۃ قرار پاتا ہو۔ وہ مقامی شہری بچے جو مدارس یا مکاتب تعلیم القرآن میں حفظ وناظرہ کی تعلیم پارہے ہوتے ہیں اور جن کے والدین اور کفیل خود زکوۃ وصدقات ادا کرتے ہیں، ان پر بلاواسطہ یا بالواسطہ زکوۃ کی رقم صرف کرنا درست نہیں ہے، بالواسطہ اس طرح کہ ان کے معلم ومدرس کو اس لئے زکوۃ کی رقم میں سے تنخواہ دی جائے کہ وہ ان بچوں کو پڑھاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر ایسا کوئی مدرس فی نفسہٖ مستحق زکوۃ ہے تو اسے زکوۃ دی جاسکتی ہے، عام ازیں کہ وہ بچوں کو پڑھائے یا نہ پڑھائے، اگر اسے زکوۃ غیر مشروط طور پر استحقاق کی بنا پر دی جارہی ہو اور وہ رضاکارانہ طور پر رضائے الٰہی کے لئے قرآن مجید کی تعلیم دے رہا ہو، اسے اس پر شرط یا لازم نہ قرار دیا گیا ہو تو درست ہے۔ البتہ اگر زیرِ تعلیم بچے بھی ایسے لوگوں کے ہیں، جو نادار اور مستحقِ زکوۃ ہیں تو ادارے کا سربراہ زکوۃ دینے والوں کا وکیل بن کر ان پر زکوۃ کی رقم خرچ کرسکتا ہے۔

ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوۃ واجب نہیں

سوال: 59

ایک شخص کا قضاء الٰہی سے انتقال ہوگیا اور اس کی جائداد اس کے شرعی ورثاء میں 2 سال کے بعد تقسیم کی گئی آیا تقسیم کے بعد گذشتہ دو سالوں کی زکوۃ ان کے ذمے

واجب الادا ہے یانہیں؟۔(منور صدیقی، ملیر کراچی)۔

جواب:

واضح رہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے بعض شرائط ہیں، جب یہ تمام شرائط پائی جائیں تو اس مال پر زکوۃ واجب ہوگی، اور اگر ان میں سے کل یا بعض شرائط نہ پائی جائیں، تو زکوۃ واجب نہ ہوگی۔ وجوبِ زکوۃ کی شرائط میں سے ایک شرط "ملکِ تام" (Complete Ownership) ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: (ومنها الملك التام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجدفيه الملك دون اليد كالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكوة كذافي السراج الوهاج۔

ترجمہ: "(اور وجوبِ زکوۃ کی شرائط میں سے ایک "ملکِ تام" ہے) اور (ملکِ تام) اسے کہتے ہیں کہ جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں پائے جائیں، لیکن جب ملکیت پائی جائے مگر قبضہ نہ پایا جائے، اس کی مثال (دینِ) مہر ہے، جو ابھی (بیوی کے) قبضے میں نہیں آیا، یا قبضہ پایا جائے مگر ملکیت نہ ہو، جیسے (عبد) مکاتب یا مقروض کے قبضے میں مال کا ہونا (کہ اس میں ملکیت نہیں ہے) تو ان دونوں صورتوں میں اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی، "السراج الوهاج میں اسی طرح ہے"، (فتاوٰی عالمگیری جلد اول، ص: 172، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

اور ملکِ تام تب ہی ہوگا، جبکہ اصل یعنی "مالکِ مال" مال پر قبضہ کرلے یا اس کا وکیل مال پر قبضہ کرلے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وقد مران المراد بالملك التام رقبة و يدا۔

ترجمہ: ''اور تحقیق (پیچھے) گذر چکا ہے کہ (ملک) تام سے مراد یہ ہے کہ مملوک پر ملکیت بھی کامل ہو اور قبضہ بھی ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد:3، ص:168، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اور وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال نصاب حقیقۃً یا تقدیراً نامی ہو۔ اور نامی ہونا یہ ہے کہ اس کو مال تجارت سے بڑھا سکے اور تجارت قبضہ سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: (و منها كون النصاب ناميا) حقيقة بالتوالد و التناسل و التجارة أو تقديرا بان يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده او في يد نائبه۔

ترجمہ: ''وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک نصاب کا نامی (بڑھوتری کے قابل) ہونا ہے، حقیقت میں تو نمو (Growth) یہ ہے کہ توالد و تناسل (جیسے جانوروں کی افزائش نسل ہوتی ہے) یا تجارت کے ذریعے ہو، یا تقدیراً نمو ہو، کہ مال کا مالک اپنے مال میں نمو اور اضافے کی قدرت رکھتا ہو اور یہ تب ہو سکتا ہے جب مال اس کے (براہِ راست) یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1: ص: 174، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: و أما سائر الديون المقر بها فهي على ثلاث مراتب عند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لابدلا عن شئ نحو الميراث او بفعله لابدلا عن شئ كالوصية او بفعله بدلا عما ليس بمال كالمهر و بدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية و بدل الكتابة لازكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا و يحول عليه الحول۔

ترجمہ: ''لیکن ایسے تمام قرضے جن کا اقرار کیا جا چکا ہو، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ

کے نزدیک ان کے تین درجے ہیں، (ایک دینِ) ضعیف، یہ وہ دین ہے جس کا وہ اپنے کسی فعل کے بغیر مالک بن گیا ہو، اور وہ مال کسی چیز کے بدلے میں اسے نہ ملا ہو، جیسے مالِ وراثت، یا اس کے فعل سے تو ہو لیکن کسی چیز کے بدلے میں نہ ہو، جیسے وصیت یا اسکے فعل سے تو ہو لیکن کسی مال کے بدلے میں نہ ملا ہو، جیسے مہر، بدلِ خلع، قتلِ عمد پر صلح کے عوض ملنے والا مال، دیت اور بدلِ کتابت، ایسے اموال میں امام اعظم کے نزدیک زکوٰۃ نہیں ہے، تاوقتیکہ کہ وہ قبضے میں آجائے اور نصابِ زکوٰۃ کے برابر ہو اور اس پر سال گزر جائے (بشرطیکہ وہ شخص پہلے سے صاحبِ نصاب نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1:، ص: 174، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: کسی شخص کی وفات کے ساتھ ہی، اس کا مال ترکہ بن جاتا ہے اور حکماً اس مال کی ملکیت ورثاء کو منتقل ہو جاتی ہے، لیکن تقسیمِ وراثت سے پہلے ورثاء کا اس مال پر "ملکِ تام" (یعنی ملکیت مع قبضہ) نہیں ہوتا تاوقتیکہ تقسیمِ وراثت کے بعد وہ اس پر قبضہ کر لیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ترکے کی تقسیم سے پہلے سالوں کی زکوٰۃ اس مال پر واجب نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ کی رقم سے ڈائلیسس مشین کی خریداری

سوال: 60

عرض یہ ہے کہ ہم عزیز طبیہ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام فیڈرل "بی" ایریا میں ایک ڈائلیسس سینٹر چلا رہے ہیں جہاں پر ناکارہ گردے کے مریضوں کا ڈائلیسس کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ تر زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کا ڈائلیسس کیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ آدھے چارج یا پورے چارج دیتے ہیں انکا بھی ڈائلیسس کیا جاتا ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہمیں کچھ صاحب ثروت حضرات زکوٰۃ کی مد سے ڈائلیسس کی مشین دینا چاہتے ہیں ،ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ:

1۔کیا زکوٰۃ فنڈ سے ڈائلیسس مشین لی جائے یا نہیں؟

2۔اگر مشین لی جائے تو اس پر پورے یا آدھے چارج دینے والے مریضوں کا علاج کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟،اگر چارج دینے والوں کا علاج زکوٰۃ فنڈ سے لی ہوئی ڈائلیسس مشین سے نہیں کر سکتے تو برائے مہربانی شریعت اسلامیہ کے مطابق اسکا کوئی حل ہو سکتا ہے تا کہ عوام الناس کے فائدے کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے خریدی ہوئی ڈائلیسس مشین استعمال ہو سکے،(احمد عبدالشکور نقشی)۔

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ ڈائلیسس مشین زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق کی ملک کر دی جائے اور وہ اسے آپ کے ڈائلیسس سنٹر کو ھبہ کر دے،پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں،نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت برسبیل تنزل یہ ہے کہ ائمہ احناف کے ہاں تو زکوٰۃ میں تملیک یعنی مستحق کو مالک بنانا شرط ہے لیکن اہلسنت کے دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تملیک شرط نہیں ہے۔ہمارے مفسرین احناف میں سے علامہ خفاجی ،علامہ شیخ زادہ،علامہ ابو سعود اور علامہ محمود آلوسی نے فقراء، مساکین، عاملین اور مولفۃ القلوب کے لئے تو تملیک کی شرط کو برقرار رکھا ہے لیکن مکاتب غلاموں کی آزادی ،مقروض افراد یا کسی تاوان یا جرمانے میں پھنسے ہوئے افراد، مسافروں اور ان لوگوں کے لئے جو ہمہ وقت اللہ کے دین

کے کسی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں، جیسے مجاہدین فی سبیل اللہ یا دینی طلبہ، لیکن مستحق زکوٰۃ ہیں، ان کے لئے تملیک کو شرط لازم قرار نہیں دیا بلکہ ان کے مصالح پر خرچ کرسکتے ہیں، پس اگر ڈائیلیسس مشینیں زکوٰۃ فنڈ سے خریدی جائیں تو پھر ان مشینوں سے صرف مستحقین ہی استفادہ کرسکیں گے۔

علامہ قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی 1069ھ سورۃ التوبۃ آیت نمبر 60، جس میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کا بیان فرمایا ہے، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پہلے چار مصارف کے ساتھ ''لام'' اور آخری چار مصارف کے ساتھ ''فی'' ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنادیا جائے۔ اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ میں سے ان کے حصے کا مالک نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصے کی زکوٰۃ) اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا، اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے، (عنایت القاضی جلد 4 ص: 558، دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

چونکہ گردے کی بیماری ایک خطرناک مہلک بیماری ہے، جو جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے، مریض کی بقاءِ حیات کے لئے ڈائیلیسس طبی طور پر ناگزیر ہے، اس لئے ہم نے اس میں دوسرے ائمہ کے قول کو اس اصول کی بنیاد پر اختیار کیا ہے کہ: ''ضرورت ممنوعات کو بھی مباح کردیتی ہے''۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ: ''ضرورت کی بناء پر دی جانے والی رخصت یا جواز کو اس کے دائرے میں محدود رکھنا چاہئے''۔ ہم نے اس مسئلے میں بعض حنفی مفسرین کے بیان کردہ یُسر (آسانی)

والے قول کو نقل کیا ہے، لیکن فقہ حنفی کا مسلمہ اور مختار مسلک یہی ہے کہ زکوۃ میں تملیک شرط ہے، لہٰذا ہماری بیان کردہ اس رخصت کو دوسرے مقامات یا مواقع کے لئے استعمال نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مقامی مدارس میں زکوۃ اور نفلی صدقات کا استعمال

سوال: 61

مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور اس مدرسہ میں بچے اور بچیاں فی سبیل اللہ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس مدرسے میں نہ مستقل رہائش کا انتظام ہے نہ قیام کا اور نہ طعام کا، اس مدرسے کے اخراجات جس میں مدرسے کی دیکھ بحال اور استاد کی تنخواہ وغیرہ شامل ہے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے درج ذیل میں سے کونسا پیسا استعمال کرنا درست ہے؟۔ چرم قربانی کے ذریعے جو رقم حاصل ہوتی ہے زکوۃ اور فطرہ سے حاصل ہونے والی رقم صدقات وخیرات اور ہدیہ سے حاصل ہونے والی رقم، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر میری ذہنی تشفی فرمائیں، (عبدالرؤف تاجی ہلیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتب تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس ومکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ وناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس ومکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوۃ، فدیہ، فدیہ صوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لئے زکوۃ

لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔

ایسے مدارس میں چرم قربانی کی مد میں حاصل شدہ رقم، عام خیرات یعنی نفلی صدقات اور عطیات کی رقوم صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح کوئی نفلی طور پر ایصال ثواب کرنا چاہے تو وہ بھی کرسکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

زکوۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط

سوال: 62

اس خط کے ذریعے ایک اہم مسئلے پر آپ کی رائے کا خواستگار ہوں امید ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات نکال کر مجھے اپنی رائے سے مستفیض فرمائیں گے۔میں نے بہت سال پہلے اپنے ہر بچے کے نام پر یا اس کے لئے اپنے نام پر قسطوں میں پلاٹ لئے تھے، نیت خالصتاً یہ تھی کہ یہ پلاٹ بچوں کے بڑے ہونے پر ان کے حوالے کردوں گا کہ اس پر مکان بنائیں یا اسے بیچ کر اس رقم سے کہیں اور مکان بنائیں یا حالات کے مطابق اس کا کوئی مصرف نکالیں، تین سوالات جو غور طلب ہیں وہ عرض کررہا ہوں۔

۱۔جو پلاٹ بچوں کے نام پر ہی خریدے ہوئے ہیں اور ان کے نام پر ہی سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہیں، کیا مجھے یا بچوں کو ان پر زکوۃ دینا پڑے گی؟۔

۲۔جو پلاٹ میں نے اپنے نام پر خریدے تھے، لیکن بچوں کے لئے ہی خریدے تھے اور سرکاری طور پر ان کو ان کے نام رجسٹری کروادی گئی ہے، کیا اس پر مجھے یا بچوں کو ماضی یا مستقبل میں زکوۃ دینا ہے؟۔

۳۔جو پلاٹ ابھی تک میرے نام ہی ہیں لیکن مناسب وقت پر بچوں کے نام کردیئے

جائیں گے،تو کیاان پر ماضی یا مستقبل میں زکوۃ لازم ہے؟۔(پروفیسر مبشر کریم کورا،E-131فیز1ڈیفنس،لاہور)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل جو پلاٹ آپ نے بچوں کے نام کردیئے ہیں اورانہیں کے نام پر رجسٹرڈ ہیں اور نیت یہی ہے کہ وہ اس پر اپنا رہائشی مکان بنائیں ،تو ان پر زکوۃ نہیں ہے، کیونکہ آپ کی ملکیت سے یہ خارج ہو چکے ہیں اوربچوں کی ملکیت ہیں ۔بچوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کی نیت یہی ہے کہ وہ ان پر مکان بنائیں گے ،تو ان پر ان کی زکوہ واجب نہیں ہوگی ،البتہ اگر ان کی نیت تبدیل ہوگئی اورارادہ یہ ہوا کہ اسے بیچ دیں گے یا سرمایہ کاری کے طور پر رکھیں گے ،تو اس کے بعد انہیں ان پلاٹوں کی مروجہ مارکیٹ قیمت کے مطابق زکوہ دینی ہوگی ۔جن مزید پلاٹوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، جو خود آپ کے نام ہیں ،اور جن کے بارے میں خود آپ نے لکھا ہے کہ مستقبل میں ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نیت ان پلاٹوں کے بارے میں فی الحال سرمایہ کاری کی نہیں ہے،لہٰذا اس صورت میں ان پلاٹوں کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی ۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فلایصیر للتجارہ مع التردد الا بالنیة۔

ترجمہ:''کوئی مال نیت قطعیہ کے بغیر تجارت کے لئے نہیں ہوگا،(فتاوی شامی، جلد:2،ص:10،مکتبہ داراحیاءالتراث العربی،بیروت)،واللہ اعلم بالصواب۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

زکوٰۃ کا استحقاق

سوال: 63

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلے کی ذیل میں، کیا خالہ خالو، ماموں ممانی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟، (محمد رمیز، نارتھ کراچی)۔

جواب:

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس ونادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔خالہ، خالو، ماموں، ممانی، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد (اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں) کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔البتہ بہن بھائی بشرطِ استحقاق ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴾کتاب الصوم﴿

دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم

سوال : 64

میری بہو کی بچی کی عمر 3 ماہ ہے، پہلی بچی ہے، روزہ رکھنے سے بچی کی خوراک پوری نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی دوسرا دودھ پیتی ہے ماں کی صحت پہلے ہی کمزور ہے (100/60/80/60) BP رہتا ہے۔ رمضان المبارک کے بعد بھی روزوں کی قضا رکھنا مریضہ کے لئے مشکل ہے ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟، (حاجی سید محمد، مرشد آباد دیریاں شریف آزاد کشمیر)۔

جواب:

عن انس بن مالك ،قال: رخص رسول الله ﷺ للحبلى الّتی تخاف على نفسها ،أن تفطر وللمرضع الّتی تخاف علی ولدها۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے، ایسی حاملہ عورت کو، جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنی جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو اور ایسی دودھ پلانے والی عورت کو کہ جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنے بچے (کی جان) کا خوف ہو، (عذرِ شرعی کی بنا پر رمضان المبارک کا) روزہ چھوڑنے کی رخصت عطا فرمائی ہے، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1668)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(أو حامل أو مرضع) أمًّا کانت أو ظئراً علی الظاهر (خافت بغلبة الظن علی نفسها أو ولدها)

ترجمہ: ''یا حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت ہو، خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا دودھ پلانے والی دائی، اسے اپنی یا بچے کی صحت کو نقصان پہنچنے کا غالب گمان ہو، ظاہر الروایہ کی رو سے، رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 359 مطبوعہ دار احیاء التراث العربي، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(ومنها حبل المرأة وارضاعها) الحامل والمرضع اذا خافتا علی أنفسهما أو ولدهما أفطرتا وقضتا ولا كفارة عليهما كذا في الخلاصة۔

ترجمہ: ''(اوران بعض معذوروں میں سے ایک حمل والی اور دوسری دودھ پلانے والی عورت ہے) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو رمضان کا روزہ عذر کی بنا پر چھوڑنے کی رخصت ہے، جب کہ ان دونوں کو خوف ہو اپنی جان یا بچے کا تو وہ افطار کریں گی یعنی روزہ نہیں رکھیں گی اور (بعد میں) اس کی قضا کریں گی اور ان دونوں پر کفارہ نہیں ہے جیسا کہ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے، (فتاوی عالمگیری، جلد 1، ص: 207 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

پس مرضعہ کو چاہئے کہ اگر اس وقت روزے نہیں رکھ سکتی تو بعد میں اگر صحت درست رہے تو ان کی قضا کرے اور اگر بعد کو بھی نہیں رکھ سکتی تو ان روزوں کا فدیہ ادا کرے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

بغلبة الظن بامارة او تجربة او باخبار طبيب حاذق مسلم مستور۔

ترجمہ: ''غلبہ ظن، علامات، تجربہ یا مسلمان ماہر مستور الحال طبیب کے بتانے سے ثابت ہوگا، (ردالمحتار علی المختار، ج 3، ص: 360-359، مطبوعہ دار احیاء التراث العربي، بیروت)''۔

اگر تندرست شخص کو روزہ رکھنے سے بیمار پڑنے کا خدشہ ہو تو ان کے لئے (رمضان میں) روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اور جب وہ روزہ رکھنے پر قادر ہو تو اس کی لازماً قضا کریں، جو بہت عمر رسیدہ ہو یا جس کو ایسا مرض لاحق ہو جس سے شفا کی امید نہیں ہے (جیسے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر) اور اس وجہ سے اس کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اس کے لئے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور اس پر ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کے طعام کا (تقریباً دو کلو گندم) فدیہ دینا لازم ہے، قرآن مجید میں ہے: وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعامُ مسکین ط

ترجمہ: ''اور جو لوگ روزہ کی بمشکل طاقت رکھتے ہوں، ان پر ایک مسکین کے طعام کا فدیہ لازم ہے، (البقرۃ:184)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قولہ العاجز عن الصوم) ای عجزا مستمرا کما یأتی اما لو لم یقدر علیہ لشدۃ الحر کان لہ ان یفطر و یقضیہ فی الشتاء۔

ترجمہ: ''اور جس شخص کو ایسا مرض لاحق ہو کہ جس سے شفا کی امید نہ ہو، جیسا کہ آگے آئے گا وہ (اس رخصت میں داخل ہے (اور) اگر کوئی شخص گرمی کی شدت کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اسے گرمیوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور سردیوں میں ان کی قضا رکھ لے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج 3، ص: 359، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا

سوال: 65

سانس کے مریضوں کو وینٹولین کے پمپ استعمال کرنا پڑتے ہیں، ایسی

صورت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔(محمد اکبر،لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر مریض اس اسٹیج پر ہے کہ پمپ کے استعمال کے بغیر مریض کا دن گزارنا مشکل ہے تو وہ معذور ہے، یہ آلہ استعمال کرے، روزہ چھوڑ دے، اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے، کیونکہ اس آلے کے ذریعے ایک کیمیکل گیس یا سیال شکل میں انسان کے حلق سے اندر جاتا ہے، جس سے سکڑے ہوئے پھیپھڑے کھل جاتے ہیں اور تنفس یعنی سانس لینا آسان ہو جاتا ہے۔

غسل واجب ہو اور صبح صادق

سوال: 66

ماہِ رمضان میں ایک شخص ایسے وقت بیدار ہوا کہ سحری کا وقت ختم ہونے میں انتہائی قلیل وقت باقی ہے، اور اس پر غسلِ جنابت واجب ہے تو ایسے میں وہ شخص کیا کرے؟ پہلے سحری کرے یا غسل؟ آیا حالتِ جنابت میں روزہ درست ہوگا یا نہیں؟

۔

جواب:

قرآن مجید میں (ماہ رمضان میں) طلوع فجر تک کھانے پینے اور عملِ ازدواج کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فالان باشروھنّ وابتغوا ما کتب اللہ لکم وکلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔

ترجمہ: ''پس اب (چاہو تو) اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہو، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ (ممتاز ہو کر) ظاہر ہو جائے

WWW.NAFSEISLAM.COM

تمہارے لئے صبح کا سفید دھاگہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے (یعنی صبح صادق شروع ہوجائے)، (البقرہ: 187)"۔

جب طلوع فجر تک ازدواجی فعل میں مشغول رہنا جائز ہوا، تو حالتِ جنابت میں روزے کی نیت کرنا بھی جائز ہوگیا۔ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنھما سے روایت ہے: انّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یدرکه الفجر، وھو جنب من أھله، ثم یغتسل ویصوم۔ ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات سے قربت فرماتے اور (کبھی) حالتِ جنابت میں صبح صادق ہوجاتی، پھر آپ غسل فرماتے، اور روزہ رکھتے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث :1926)"۔

عن عائشة زوج النبی ﷺ قالت قد کان رسول اللّٰہ ﷺ یدرکه الفجر فی رمضان وھو جنب من غیر حلم فیغتسل ویصوم ۔

ترجمہ: "ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں کبھی رسول اللہ ﷺ پر احتلام کے بغیر حالتِ جنابت میں صبح صادق آجاتی آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2486)"۔

عن عائشة رضی اللّٰہ عنھا انّ رجلاً جآء الی النبی ﷺ یستفتیه وھی تسمع من ورّآء الباب فقال یا رسول اللّٰہ ﷺ تدرکنی الصلوٰۃ وانا جنب فاصوم فقال رسول اللّٰہ ﷺ وانا تدرکنی الصلوٰۃ وانا جنب فاصوم فقال لست مثلنا یا رسول اللّٰہ قد غفر اللّٰہ لك ماتقدم من ذنبك وماتأخّر فقال واللّٰہ انّی لارجوا ان اکون اخشاکم للّٰہ واعلمکم بما اتّقی۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک

شخص مسئلہ معلوم کرنے آیا دراں حالیکہ وہ بھی دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھیں، اس نے عرض کیا :یارسول اللہ ﷺ!(کبھی) حالتِ جنابت میں نماز فجر کا وقت آجاتا ہے،تو میں(اس وقت غسل کرکے پاک ہوتا ہوں)اور روزہ رکھتا ہوں،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:کبھی حالت، جنابت میں مجھ پر بھی نماز فجر کا وقت آجاتا ہے،میں (غسل کرکے نماز پڑھتا ہوں) اور میں روزہ رکھ لیتا ہوں ،اس نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ!ہم آپ کی مثل کب ہیں!اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے ذنب کی قطعی مغفرت فرمادی ہے!آپ ﷺ نے فرمایا:بخدا مجھے یہ یقین ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خشیت رکھنے والا ہوں اور جن چیزوں سے بچنا چاہئے ان کا میں تم سب سے زیادہ عالم ہوں،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:2489)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن اصبح جنباً أو احتلم فی النهار لم یضره کذا فی محیط السرخسی ۔

ترجمہ:"اور جس نے حالتِ جنابت میں صبح کی،یا دن میں احتلام ہوگیا تو یہ اس کے (روزے)کے لئے نقصان دہ نہیں،محیط سرخسی میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:200،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)"۔مذکورہ صورت میں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح ہاتھ دھوکر،کلی وغیرہ کرکے سحری کرے اور بعد میں غسل کرے،پھر نماز پڑھے اور اس صورت میں اس کا روزہ درست ہوگا،لیکن لازم یہ ہے کہ غسل کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ فرض نماز کا وقت جاتا رہے،اگر نماز قضا ہوگئی تو گنہگار ہوگا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴾کتاب الحج﴿

فلسفہ و روح حج

اسلام کی کامل روح تو یہ ہے کہ بندہ مومن کی زندگی مجسم عبادت بن جائے، اس کی چال ڈھال، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، انفرادی و اجتماعی معاملات، حتی کہ ہر شعبہ زندگی اور ہر لمحہ حیات میں اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت کی جھلک نظر آئے۔ ہم نے جو زندگی کو دین اور دنیا کے نام سے دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے اس دو رنگی اور دوئی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر انسان زندگی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء اور اطاعت کے قالب میں ڈھال لے اور اس کا وجود اللہ کے بندوں کے لئے فیض رساں اور وسیلہ رحمت بن جائے تو اس کی معیشت، تجارت اور سیاست سب کچھ عبادت بن جائے گی۔ اور خوف خدا اور اخلاقی گرفت سے عاری زندگی جو انسانیت کے لئے باعث آزار بن گئی ہے، اس سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس عمومی اور جامع (Comprehensive) اور کامل (Perfect) تصورِ عبادت کے ساتھ اسلام نے رسمی عبادات (Rituals) کا ایک حکیمانہ اور مربوط نظام بھی عطا کیا ہے، جن کا حقیقی اور اعلیٰ مقصد بندہ مومن کے قلب میں اس جامع و کامل تصورِ عبادت کو ابھارنا ہے، یہ عبادات تین قسم پر مشتمل ہیں۔

(1) خالص بدنی عبادات: جیسے نماز اور روزہ، یہ بہر صورت ہر بندے کو خود ادا کرنی ہوتی ہیں اور ان میں نیابت (Assistance) کا کوئی تصور نہیں۔

(2) خالص مالی عبادت: جیسے زکوٰۃ فطرہ وغیرہ، ان میں نیابت چل جاتی ہے یعنی کوئی شخص دوسرے کا وکیل اور نمائندہ بن کر بھی ادا کر سکتا ہے۔

(3)مخلوط عبادت: یعنی جو بدنی بھی ہو اور مالی بھی، اس میں بھی اصل روح تو یہی ہے کہ بندہ خود ادا کرے لیکن اگر بربنائے معذوری ومجبوری خود نہ ادا کرسکتا ہو تو اس کی نیابت میں اس کی خواہش اور مصارف پر دوسرا قابل اعتماد آدمی بھی کرسکتا ہے، اسے "حج بدل" کہتے ہیں۔

حج کا معنی ومفہوم: لغت میں حج کے معنی ہیں، کسی قابل تعظیم چیز کا قصد کرنا، اور اصطلاح شریعت میں عبادت کی غرض سے بیت اللہ کے قصد کو حج کہتے ہیں، بشرطیکہ اس میں مقررہ ارکان، شرائط، فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محرمات ومکروہات سے اجتناب کیا گیا ہو۔

حج کی اہمیت: حج کا سبب بیت اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیت اللہ کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے، جو بھی وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، جامع ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سفر کے خرچ اور سواری پر قادر ہو، جس کے ذریعے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو عملاً اس سے کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے؟۔

امام بیہقی (Imam Baihaqi) نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص حج کے لئے زادراہ اور سواری کی استطاعت رکھتا ہو، کوئی شدید مجبوری، معذوری، بیماری یا کوئی ظالم بادشاہ رکاوٹ نہ بنے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا غرض کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے ۔قرآن وحدیث کی یہ وعید شدید (Strong Threats of Punishment) پرشکوہ اور بے نیازانہ انداز تخاطب یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک حج کی اہمیت کیا ہے اور بلا عذر کسی تارک حج کا

مقام اسلام کیا ہے؟ اور یہ کہ اس کا عمل یہود و نصاریٰ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

اسلام دین فطرت ہے: اسلام دین فطرت ہے اس کی تعلیمات عقل سلیم (Sance) کے عین مطابق ہیں، اسلام کی کوئی بھی تعلیم عقل و دانش سے متصادم نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی، عقل نارسا اور فہم کی کمی کی بناء پر کسی امر الٰہی کی حکمت کو سمجھ نہیں پاتا لہٰذا اسے ہم ماورائے عقل (Beyond the Reach of Rationality) تو کہہ سکتے ہیں کہ خلاف عقل (Contrary to the Rationality) ہرگز نہیں۔

حج ایک کیفیت اور جذب و جنون کا نام ہے: حج میں بھی انسان کو سوچ اور فکر و آگہی کے ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، انسان سوچتا ہے کہ طویل مسافتیں طے کر کے اور مشقتیں برداشت کر کے اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر جمع کرنے میں آخر کیا راز پنہاں ہے؟ سب لوگوں کا اپنا روایتی لباس اتار کر دو چادریں پہنا دینے میں کیا مصلحت ہے؟، آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ لاکھوں انسان دیوانہ وار پتھر کی ایک عمارت کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں، دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہے ہیں، ایک خاص دن اور تاریخ کو ایک خاص مقام پر پورا شہر آباد ہوتا ہے اور شام کو اجڑ جاتا ہے لاکھوں لوگ پتھروں کے علامتی ستون پر کنکریاں برسا رہے ہیں، ایک خاص مقام پر ایک ہی دن لاکھوں لوگ جمع ہو کر لاکھوں جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں، آخر کیوں؟۔

یہ سارے انداز یہ بتاتے ہیں کہ حج معمول کے شب و روز کا نام نہیں بلکہ معمول کی زندگی کو ترک کر کے مجاہدانہ انداز سے (Camp Life) گزارنے کا نام ہے، ایک محدود عرصے کے لئے لباس، رنگ، علاقیت، زبان اور نسب و نسل کے تمام امتیازات کو کلی طور پر ترک کر دینے کا نام ہے، یہ سب کچھ دراصل امام انبیاء، ابو الانبیاء، مرکز

الملل، اولوالعزم رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کے صاحبزادے حضرت اسما عیل علیہ السلام اوران کی اہلیہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنھا کی اداؤں کواپنانے کا نام ہے ،عالمی اسلامی اخوت، وحدت واتحاداور نظریاتی ہم آہنگی کے بھرپور مظاہرے کا نام ہے، اوراس عزم کے عملی اظہار کا نام ہے کہ اگر اللہ تعالٰی کے دین کا تقاضا ہوا تو ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا نے کا عزم رکھتے ہیں اور حج اسی عزم مصمم کے اظہار کا نام ہے، اور اگر یہ ''روح حج ہما رے قلب وقالب میں صحیح معنوں میں اتر گئی تو ہم نے مقصد حیات پالیا، ورنہ محض مشقت سفر کے سوااور حکم الٰہی کی ظاہری تعمیل کے سوا ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا۔۔۔ایک دفعہ ایک حاجی، حج کرکے واپسی پر اللہ کے ایک محبوب ومقرب ولی سے ملنے چلا گیا۔ اللہ کے اس ولی نے اس سے سفر حج کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے ایک ایک کرکے منا سک حج بیان کرنے شروع کئے، اللہ کے ولی نے کہا کہ دوست یہ بتاؤ جب پورے جذبے اور جوش وخروش کے ساتھ تم شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے ،تو کیا تم نے اس شیطان کو بھی سنگسار کیا تھا جو ''نفس امارہ' کی شکل میں تمہارے وجود کے اندر آسن جما ئے بیٹھا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔انہوں نے پوچھا کہ ''جب تم قربانی کے جانور کے گلے پر چھری چلا رہے تھے تو اس مرحلے پر کبھی تم نے یہ بھی سو چا تھا کہ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ،میرے خالق ومالک کو میری جان کا نذرانہ بھی مطلوب ہوا تو میں اپنی جان ومال کی ہر قربانی دین اسلام کے لئے پیش کردو ں گا؟ اس نے کہا: ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا'' ،تو یہ سن کر اللہ کے نیک بندے نے کہا: ''پھر دوبارہ حج کرو تم نے درحقیقت حج کیا ہی نہیں۔تو حج دراصل اس کیفیت عشق اور اللہ کی راہ میں اس وارفتگی اور جذب وجنوں کا نام ہے، جس کی روایت حضرت

ابرہیم واسماعیل علیہما السلام نے ڈالی ہے۔

کعبہ معبود نہیں، جہت عبادت ہے: جب ہم عین بیت اللہ کی چوکھٹ کے سامنے سجدہ کر رہے ہوں تب بھی بیت اللہ ہمارا مسجود و معبود نہیں ہوتا، مسجود و معبود تو صرف اور صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے، بیت اللہ تو صرف ''جہت سجدہ'' ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے غالباً اس میں حکمت یہ مستور رکھی ہے کہ کعبے کو اپنے انوار و تجلیات کا مرکز و مہبط (Focusing Point) بنا کر ہمیں اس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے اور اس کے گرد طواف کرنے کا حکم دیا تا کہ ہم پر کعبہ کی برکات کے طفیل اس کی رحمتوں، برکتوں اور انوار و تجلیات کا نزول ہو، دوسری حکمت یہ ہے کہ ہماری عبادت کے لئے مرکزیت، ایک نقطہ ارتکاز توجہ (Point of concentration) ہو تا کہ ہم مختلف سمتوں کی جانب بھٹکنے سے محفوظ رہیں، اطراف عالم کے مسلمانوں میں ایک مثالی وحدت اور یک رنگی پیدا ہو جائے، چنانچہ رسول ﷺ نے اسی قبلے کو مومن کی شناخت اور پہچان کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی جانب عبادت میں رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ ظاہری علامات کے اعتبار سے مسلم ہے''۔

حج زندگی میں تبدیلی کا فیصلہ کن موڑ اور نقطہ آغاز: اسلام یہ چاہتا ہے کہ حج مومن کی زندگی میں تبدیلی لائے بلکہ چاہئے کہ یہ ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) بن جائے، گناہوں کو ترک کر کے پاکیزہ زندگی گزارنے کا نقطہ آغاز ہو، بندہ اپنے رب سے شعوری طور پر ایک عہد و پیمان اور تجدید وفا کا عزم کر کے، صرف سلا ہوا لباس ہی نہ اتارے بلکہ وہ لباس معصیت جس میں سر تا پا جکڑا ہوا ہے اسے بھی اتار پھینکے، صرف دو سفید چادروں پر مشتمل اجلا لباس ہی نہ پہنے بلکہ ایمان و ایقان اور کر

دار کو بھی اتنا ہی مُصفّیٰ، مزکی اور مُنوّر بنا دے، جس طرح اس نے وہ لباس پہنا ہے جو فطرت سے قریب تر، زیب وزینت اور بناؤ سنگھار کے تکلفات سے آزاد ہے، خود اپنے آپ، اپنی روح اور جسم کو بھی اسی فطرت سلیم کے سانچے میں ڈھال لے، جس پر خالق نے اسے پہلے روز تخلیق فرمایا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی (Adgerent of Mazdaism) بنا دیتے ہیں''۔یعنی حج کا لباس بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہوں کی ان آلودگیوں سے دور کر کے جو معاشرے نے اس پر تھونپ دی ہیں اور فطرت سے قریب تر بلکہ عین مطابق ہو جائے اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا: ''جس نے خالص اللہ کی رضا کے لئے حج کیا اور اس کے دوران نہ تو شہوت رانی (Abscentity) کی اور نہ ہی گناہ کیا تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر لوٹے گا جیسے اپنی پیدائش کے دن گناہوں سے پاک تھا''۔ایسے ہی کامل ومکمل حج کو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور (Accept into the Grace of Allah) قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''حج مبرور کی جزا جنت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی''۔اور اگر ہم نے حج سے یہ مقصد حاصل نہ کیا تو گویا ہم نے حج کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں، ایسی بے رخ عبادات صرف صورتاً عبادات ہوتی ہیں، حقیقتاً نہیں جیسا کہ فرمان رسول ﷺ ہے: ''بہت سے روزے دار ایسے ہیں، جنہیں ان کے رزوں سے بھوک کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے قائم اللیل (راتوں کو اٹھ کر عبادت کرنے والے) ایسے ہیں، جنہیں اپنی عبادتوں سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔

حج بنیادی طور پر مشقت کی عبادت ہے: حج بنیادی طور پر مشقت وکلفت

(Hardship) کی عبادت ہے، حج کی یہ کیفیت آج سے ہزار سال پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، ماضی میں سفر کی صعوبتیں، زادراہ کی دشواریاں، موسم کی ناگواریاں، سنگریزوں، نوکیلے پتھروں اور کانٹوں پر چلنا، پانی کی عدم دستیابی، وسائل کی کمی وغیرہ، آج مادی لحاظ سے تصورات وتوقعات سے زیادہ راحتیں، آسائشیں بلکہ تعیّشات موجود ہیں لیکن مشقت کی روح آج بھی موجود ہے اس مشقت کا سب سے بڑا سبب انسانوں کا ہجوم، انسان کا آسائشوں اور تعیّشات کا دلدادہ ہونا، محنت ومشقت کا عادی نہ ہونا، جذبہ ایثار وقربانی کا فقدان، صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کا اسیر ہونا وغیرہ، چنانچہ آج طواف، سعی اور رمی جمرات اور منیٰ میں حادثات پہلے سے بدرجہا زائد ہوتے ہیں ۔حاجی جب حج سے واپس آتا ہے تو اس کے تجربات میں طرح طرح کے شکوہ، شکایات، معلمین کے ناروا سلوک کی حکایات اور اپنی اور سعودی حکومت کے عمال کی بد سلوکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا یہ طرز فکروعمل اس لئے ہے کہ ہم ذہنی طور پر اس عمل کے لئے تیار ہوکر نہیں جاتے کہ ہم ایک سپاہی کی طرح "کیمپ لائف" میں جارہے ہیں ہمیں ایک بڑی مشقت کے عمل سے گزرنا ہے۔ راحت وآرام اور تعیش ہمارا مقصود ومطلوب نہیں ہے اگر ہم ایسی سوچ لیکر جائیں تو پھر ہر بڑی تکلیف ہمیں چھوٹی نظر آئے، اور ہمیں یہ احساس ہو کہ اتنا بڑا اجر اسی تکلیف ومشقت کا صلہ وانعام ہے۔ پھر ہم معلم وغیرہ کی شکایات پر وقت صرف کرنے کے بجائے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکروفکر میں گزاریں گے، اور کلفت کو اجر کا وسیلہ سمجھ کر اسے دل سے قبول کریں گے۔

قرعہ اندازی اسکیم پر حج

سوال: 67

عرض یہ ہے کہ سوئی سدرن گیس کمپنی کے افسران اپنی مرضی سے ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے نام پر اپنی تنخواہ سے کٹواتے ہیں۔ ہر سال حج کی قرعہ اندازی ہوتی ہے، اور جس خوش نصیب کا نام قرعہ میں نکل آئے، اسے حج فنڈ سے حج پر بھیجا جاتا ہے۔ اس مرتبہ ایک ایسے افسر کا نام نکل آیا ہے، جو قادیانی ہے اور ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے لئے اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے (اور اس بارے میں ہمیں پہلے علم نہ تھا)۔ اس بارے میں شریعت اور قانون کیا کہتا ہے؟ کیا اس شخص کو حج کے لئے بھیج سکتے ہیں؟۔

کیا سعودی یا پاکستانی حکومت کی طرف سے ان کے حج کرنے پر کوئی قانونی پابندی ہے؟۔

کیا اس شخص کی رقم حج فنڈ میں شامل کی جاسکتی ہے۔ برائے مہربانی مسئلے کے حل کے جانب رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، (اشفاق احمد، سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ، گلشن اقبال روڈ، کراچی)۔

جواب:

اگر یہ کنٹری بیوشن سب شرکاء کی طرف سے رضاکارانہ ہے، کسی افسر کے دباؤ یا کسی اور سبب سے نہیں ہے۔ اور سب شرکاء کی اجازت ہے کہ ان کی جمع شدہ رقم سے جس ترتیب سے قرعہ اندازی میں لوگوں کا نام نکلتا ہے، انہیں حج پر بھیج دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ایسے امور، جن میں تمام شرکاء کا استحقاق برابر ہو، کا فیصلہ از روئے قرآن وحدیث قرعہ اندازی سے ہوسکتا

ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وما کنت لدیھم اذ یلقون اقلامھم ایھم یکفل مریم۔

ترجمہ: ''اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لئے) اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ مریم کی کفالت ان میں سے کون کرے، (آلِ عمران: 44)''۔

البتہ قادیانی کو اس اسکیم میں شامل کرنا درست نہیں ہے، اگر ایسا کوئی شخص ہے تو اسے اسکیم سے الگ کر دیا جائے اور اس کی رقم اسے واپس کر دی جائے، کیونکہ قادیانی پاکستان میں آئینی طور پر اور شرعاً باجماعِ امت مرتد ہیں۔ وہ اگر سچ بول کر اپنے آپ کو غیر مسلم اور قادیانی لکھیں تو انہیں حج یا عمرے کا ویزا ہی نہیں مل سکتا، کیونکہ یہ سب مسلمانوں کے لئے ہے، اور اگر وہ کتمانِ حق کر کے، دھوکہ دہی اور فریب سے پاسپورٹ اور حج کی درخواست فارم میں اپنے آپ کو مسلم لکھیں تو یہ کذبِ صریح اور دھوکہ دہی ہے۔ حج فارم، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ فارم سمیت تمام دستاویزات میں مسلمان کیلئے ختمِ نبوت کا اقرار اور قادیانی ولاہوری گروپ سے براءت کا حلفیہ اقرارنامہ لازمی ہے اور قادیانی اگر اپنے غیر مسلم ہونے کا اقرار کر کے پاسپورٹ بنائے، حج فارم بھرے، شناختی کارڈ فارم بھرے تو وہ شرعاً وقانوناً کسی بھی طریقے سے حج پر نہیں جا سکتا ہے اور اگر جھوٹا مسلم ہونے کا حلف نامہ بھرتا ہے تو صریح دغاباز ہے۔

اسقاطِ فرض کے لئے حجِ بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ

سوال: 68

ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہو، کیا وہ صرف حجِ افراد کا احرام باندھے گا یا کہ حجِ تمتع اور قران بھی کر سکتا ہے؟، حج اور عمرہ کے موضوع پر ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے: ''بیان مناسکِ حج وعمرہ''، اس کے صفحہ نمبر 39 پر لکھا ہوا ہے: ''جو

حضرات حج بدل کے لئے جا رہے ہیں، وہ صرف حج افراد کا احرام باندھیں، دوسرا احرام نہ باندھیں، (یاسر رحمان، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

حج بدل کی منجملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ حج کرنے والا، جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اگر اس نے صرف حج افراد کرنے کا کہا ہے، تو اس پر ضروری ہے کہ وہ حج قران یا تمتع کا احرام نہ باندھے، اگر باندھے گا تو بھیجنے والے کا حج ادا نہ ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

الرابع عشر: عدم المخالفة فلو أمره بالافراد فقرن أو تمتع ولو للميت لم يقع عنه ويضمن النفقة۔

ترجمہ: ”حج بدل کی چودھویں شرط یہ ہے کہ جو شخص حج بدل پر مامور ہے، وہ اپنے آمر یعنی بھیجنے والے کے حکم کی مخالفت نہ کرے، اگر اس نے اسے حج اِفراد کا حکم دیا ہے اور حج بدل پر مامور شخص نے ”حج قران“ کیا یا ”حج تمتع“ کیا، خواہ وہ میت کی جانب سے ہو، تو وہ حج بھیجنے والے کی طرف سے واقع نہیں ہوگا، اور وہ حج بدل کرنے والا اس حج کے اخراجات کا خود ضامن ہوگا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 4، ص: 18، دار احیاء التراث العربی، بیروت)“۔

البتہ اگر ایک شخص نے کسی کو اپنی طرف سے عمرہ کرنے کے لئے بھیجا یا حج کے لئے بھیجا اور اس نے بھیجنے والے کی طرف سے پہلے عمرہ کر کے پھر اپنی طرف سے حج کیا یا بھیجنے والے کی طرف سے حج کرنے کے بعد پھر اپنی طرف سے عمرہ کیا، تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، جیسا کہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

ولو أمره بالعمرة فاعتمرثم حج عن نفسه اوبالحج فحج ثم اعتمر عن نفسه جاز الخ۔۔۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 4، ص: 18، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

لہٰذا اگر بھیجنے والا خود اجازت دے کہ میری طرف سے "حجِ تمتُّع" کرو یا "حجِ قران" کرو تو پھر وہ مامور شخص اس کے حکم کی تعمیل میں حجِ تمتُّع یا حجِ قران کرسکتا ہے، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

حجِ قران میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا یا دو دو

سوال: 69

کیا قارن یعنی جو شخص اپنے میقات سے بیک وقت حج اور عمرے کا احرام باندھتا ہے اور پھر وہ احرام کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے دم لازم آتا ہے تو کیا اس پر دو احرام کی وجہ سے دو دم لازم آئیں گے یا ایک ہی دم کافی ہوگا؟ اسی طرح ان امور میں جہاں بُدنہ یا صدقہ لازم آتا ہے، ایک ہی بُدنہ یا صدقہ کافی ہوگا یا دو دو لازم آئیں گے؟، (پروفیسر رضی الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجب دمان علی قارن حلق قبل ذبحہ) دم للقران ودم للتا خیرعلی "المذھب" کما حررہ المصنّف قال: وبہ اندفع ما توھّمہ بعضھم من جعل الثّمین للجنایۃ۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

ترجمہ: ''حج قران کا احرام باندھنے والے نے اگر قربانی سے پہلے حلق کرلیا (یعنی بال منڈھا دیئے) تو اس پر مذہب صحیح کے مطابق دو دَم لازم آئیں گے، ایک دمِ قران اور ایک ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے کے باعث دم لازم آئے گا، جیسا کہ مصنف (علامہ تمرتاشی) نے لکھا ہے، انہوں نے فرمایا: اور اس سے بعض لوگوں کا یہ وہم دور ہوگیا، جنہوں نے دونوں دَم جنایت کے باعث لازم قرار دیئے ہیں''۔

اس کی تشریح میں کلام کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وعن الثانی بأن التضاعف علی القارن انما یکون فیما اذا ادخل نقصا فی احرام عمرتہ، والا فلا یجب الا دم واحد، ولھذا اذا افاض القارن قبل الامام او طاف للزیارۃ جنبا او محدثا لایلزمہ الا دم واحد لانہ لاتعلق للعمرۃ بالوقوف وطواف الزیارۃ۔

''قارن پر دو دم تب لازم آتے ہیں، جب اس کے عمرے کے احرام میں نقص لازم آیا ہو، ورنہ (عمرے کے بعد قارن پر بھی) صرف ایک ہی دم لازم آئے گا، لہٰذا جب قارن نے امام سے پہلے طوافِ افاضہ کیا یا بے وضو یا حالتِ جنابت میں طوافِ زیارت کیا، تو اس پر صرف ایک دم لازم آئے گا، کیونکہ عمرہ کا وقوفِ عرفہ اور طوافِ زیارت سے کوئی تعلق نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 521، باب الجنایات، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

مسئلہ: ''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے قارن پر دو ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 762، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں، (عامۂ کتب)، (بہارِ شریعت، جلد

ششم،ص:499مکتبۂ رضویہ)"۔

علامہ شامی نے البحر الرائق کے حوالے سے جو تفصیلی بحث کی ہے، اس کی روشنی میں قارن نے اگر عمرے کی ادائیگی کے دوران یا اس سے پہلے کسی جنایت کا ارتکاب کیا ہو تو اس پر صورت مسئلہ کی نوعیت کے مطابق دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، اور اگر عمرے کی ادائیگی کے بعد اس نے جنایت کا ارتکاب کیا ہو تو صرف ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا، جہاں تک دمِ قران کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ ہے، اعلیٰحضرت اور صدرالشریعہ رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارات سے اگر چہ بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ قارن پر علی الاطلاق دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، خواہ جنایت کا ارتکاب عمرے سے پہلے کیا ہو یا بعد میں، لیکن علامہ شامی کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ان دونوں اکابر کے اقوال کو مطلق نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر محمول کیا جائے کہ اگر جنایت کا ارتکاب عمرے کی ادائیگی سے پہلے یا عمرے کی ادائیگی کے دوران کیا ہو تو دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، اور عمرے کی ادائیگی کے بعد ایک ہی دم یا ایک ہی صدقہ کافی ہوگا۔

دم کی ادائیگی حدودِ حرم میں

سوال: 70

ہم لوگ ابھی عمرہ کر کے آئے ہیں، وہاں میرے شوہر نے عمرہ مکمل کرنے سے پہلے احرام اتار دیا تھا۔ وہ فالج کے مریض ہیں، کچھ رہائش کا مسئلہ ہوگیا تھا، اس لئے ہم انہیں فوراً سعی نہیں کروا سکے، انہوں نے گرمی کی وجہ سے احرام اتار دیا تھا، دوسرے دن دوبارہ مسجد عائشہ سے احرام باندھ کر دوبارہ عمرہ مکمل کروایا، اب ہمیں اس کا کتنا دم دینا ہوگا، اور یہ دم حدودِ حرم ہی میں دینا ہوگا یا یہاں بھی ادا ہوسکتا ہے،(ہدایت اللہ، النور سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

عمرے کی ادائیگی میں سعی کرنا واجب ہے اور واجب کے ترک پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے اور دم میں ایک بکری یا بھیڑ دی جائے گی۔

جنایت کا دم زمین حرم پر دینا ضروری ہے، دوسری جگہ ادا نہیں ہوگا۔اور اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، جب چاہے دے سکتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ نے الدرالمختار میں لکھا:

ویتعین یوم النحر ای وقته وهو الایام الثلاثة لذبح المتعة والقران فقط فلم یجز قبله بل بعده وعلیه دم ویتعین الحرم لا منیٰ للکل۔

یعنی (قربانی کے لئے) متعین ہے یوم نحر اور اس کے لئے وقت صرف تین دن ہیں، واسطے تمتع اور قرآن والے کی قربانی کے۔پس اس سے پہلے اور بعد جائز نہیں اور اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو اس پر ''دم'' ہے۔اور دم زمین حرم میں کسی جگہ بھی دیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ''منیٰ'' مخصوص نہیں۔

درمختار کی درج بالا عبارت کے لفظ ''فقط'' پر علامہ شامی نے لکھا: لا یتعین غیرهما فیها۔

ترجمہ: ''ان دونوں (متمتع وقارن) کے علاوہ ان اوقات میں ذبح کرنا ضروری نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:36-35 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ،بیروت)''۔

احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم

سوال: 71

احرام کی حالت میں دانت سے اور بواسیر کے مسّے سے خون آنے پر کیا دم

دیناپڑتا ہے یانہیں؟۔

2۔حج کی ادائیگی کے بعد خاندان اور برادری کے افراد کومدعو کر کے انہیں کھانا کھلایا جاتا ہے کیاحج کا یہ کھانا کھلانا ضروری ہے؟۔

3۔حج کے دن والد اوروالدہ نے کمزرو ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے فرد کورقم دیکر یہ فریضہ ادا کیایہ صحیح یااس پر دم دیناپڑے گا؟۔

4۔والدہ صاحبہ نے حج کے دن قربانی کی ادائیگی کے بعد اپنے بالوں کی ایک پور کاٹی تھی اور احرام کھول دیا ان پر کم بال کاٹنے پر دم ہو گایا نہیں ؟۔(سید محمد علی D/3تا رتھ،کراچی)۔

جواب:

احرام کی حالت میں خون نکلنے سے دم واجب نہیں ہوتا،منہ یا دانتوں سے خون نکلا اگرتھوک پر غالب ہے تو وضوٹوٹ جائے گاورنہ نہیں ،غلبے کی شناخت یہ ہے کہ اگرتھوک کارنگ سرخ ہوجائے تو خون غالب سمجھا جائے اوراگر زرد ہوتو مغلوب ۔خون ،پیپ یا زرد پانی جسم کے کسی بھی حصے سے نکل کر بہا اور بہنے میں ایسی جگہ پہنچنے کی صلاحیت تھی جس کا وضو یا غسل میں دھونا فرض ہے تو وضو جاتا رہا،مگرصرف چمکایا ابھرا اور بہنے کی صلاحیت اس میں نہیں تو وضونہیں ٹوٹے گا،اسی طرح مسواک یاانگلی سے دانت صاف کرتے ہوئے یا دانتوں سے کوئی چیز کاٹی اوراس پر خون کااثر پایا گیا یاناک میں انگلی ڈالی اوراس پرخون کی سرخی آگئی مگروہ بہنے کے قابل نہیں تو وضونہیں ٹوٹا، ان تمام صورتوں کے باوجود محرم پراحرام کی حالت میں خون آنے پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

2۔حاجی صاحبان کا خاندان اور برادری کے افراد کومدعو کر کے کھانا کھلانا شرعاً ضروری

نہیں ہے، اگر کوئی شخص حج کے بعد شکرِ نعمت کے طور پر احباب کی دعوت کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے بلکہ عنداللہ اجر پائے گا، اگر محض نمود و نمائش مقصود ہے تو اجر آخرت سے محروم رہے گا، بہتر یہ ہے کہ دعوتوں میں امراء کے ساتھ نادار لوگوں کو بھی شریک کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ولیمہ کے بارے میں فرمان ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ انہ کان یقول :شر الطعام طعام الولیمۃ ،یدعی لھا الا غنیاء ویترك الفقراء ،ومن ترك الدعوۃ فقد عصی اللہ تعالیٰ ورسولہ ﷺ.

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ بُرا کھانا ولیمہ کا کھانا ہے جس میں مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں اور فقراء چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور جس نے دعوت کو ترک (یعنی بلا سبب انکار کر دیا) اس نے اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5177)''۔

3۔رمی میں نائب مقرر نہیں کر سکتے ضعف اور کمزوری اس کے لئے مانع نہیں، لہٰذا بوڑھے اور عورتیں آخری وقت میں جائیں رات میں رمی کرنا اگر چہ مکروہ ہے مگر عذر کی وجہ سے یہ کراہت باقی نہیں رہتی، رمی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو دم دینا واجب ہے مگر ایک دن کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور صرف ایک جمرہ کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور تینوں دنوں کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم لازم آئے گا، لہٰذا جب اگر ایسا عذر ہو جس کی وجہ سے رمی نہیں کر سکتا تو تیسرے دن دم دے گا اور یہ دم حدودِ حرم میں دینا ضروری ہے۔

4۔عورتیں اپنے بالوں میں سے ایک پور کے برابر بال لے کر کاٹ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والتقصیر ان یاخذ الرجل والمرأۃ من رؤس الشعر ربع الر

اَس مقدار الانملہ کذا فی التبیین۔

ترجمہ: ''اور تقصیر یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنے سر کے بال چوتھائی سر سے ایک پور کے برابر لے لیں ''تبیین'' میں اسی طرح سے ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 231 مکتبہ رُشیدیہ کوئٹہ)''۔

دورانِ حج ناپاکی

سوال: 72

اگر کسی عورت کو دورانِ حج حیض آجائے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟،(عادل،پشاور)۔

جواب:

اگر خاتون نے حج کا احرام باندھ لیا ہے تو وہ مُحرِمہ ہے،یعنی احرام میں داخل ہو چکی ہے۔اب اگر دوران حج اسے حیض آجائے تو وہ تمام مناسکِ حج معمول کے مطابق جاری رکھے گی،یعنی وقوفِ منیٰ،وقوفِ عرفات،وقوف مزدلفہ،رمیِ جمار(یعنی شیطانوں کو کنکریاں مارنا)،قربانی اور احرام سے باہر آنے کا عمل دیگر حجاج کرام کے ساتھ جاری رکھے گی۔اس دوران وہ دعائیں کرسکتی ہے،مگر تلاوت نہیں کرسکتی اور نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔اسی طرح حیض سے فراغت تک طوافِ زیارت کو مؤخر کرے گی،حرم میں بھی نہیں جائے گی۔اور چونکہ ''طوافِ زیارت'' میں تاخیر اس کی اپنی کسی بشری کوتاہی کی وجہ سے نہیں ہوئی،بلکہ یہ مانع یا ''عذر تاخیر'' اسے اللہ کی جانب سے پیش آیا ہے،اس لئے اس تاخیر کی بنا پر اس پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا،لہٰذا جب وہ حیض سے پاک ہوجائے تو غسل کرکے پاک ہوجائے اور ''طوافِ زیارت'' کرلے۔

حج وعمرہ کے مسائل

حج وعمرہ اورزیارتِ روضہء رسول ﷺ کے متعلق چند اشکالات کے جواب قرآن وسنت وفقہ حنفی کی روشنی میں عطا فرما کرعنداللہ ماجورہوں۔جزاک اللہ۔(سید محمد طاہر الحسن،مکان نمبر R-48 11-C-3 نارتھ کراچی)۔

سوال: 73

حرم کے رہنے والے عمرے کے لئے احرام کہاں سے باندھیں؟۔

جواب:

حدثنا همام وقال : اعتمر أربع عمر في ذي القعدة ،الّا الّتي اعتمر مع حجّته: عمرته من الحديبية ،ومن العام المقبل ،و من الجعرانة حيث قسم غنائم حنين،و عمرة مع حجته۔

ترجمہ:’’ہمام سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے چار عمرے کئے،سارے ذی القعدہ میں سوائے اس ایک کے جو اپنے حج کے ساتھ کیا۔ایک عمرہ حدیبیہ والا،ایک اگلے سال تیسرا جعرانہ سے جبکہ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کیا اور چوتھا عمرہ اپنے حج کے ساتھ،(صحیح بخاری رقم الحدیث: 1780)‘‘۔

أنّ عبدالرحمن بن ابی بکر رضی الله عنهما أخبره: أنّ النبی ﷺ أمره أن یردف عائشة ویعمرها من التنعیم۔

ترجمہ:’’عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ عائشہ کو سواری کے پیچھے بٹھا کر تنعیم سے عمرہ کروالاؤ،(صحیح بخاری رقم الحدیث:1784)‘‘۔

ردالمحتار میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ لکھتے ہیں:(و التنعیم افضله)

ھو موضع قریب من مکة عند مسجد عائشه، وھو اقرب موضع من الحل

ای الاحرام منه للعمرة افضل من الاحرام لها من الجعرانة وغیرھا من الحل

عندنا، وان کان ﷺ احرم منها، لأمره علیه الصلاة والسلام عبدالرحمن

بان یذھب باخته عائشة الی التنعیم لتحرم منه۔

ترجمہ:"(تنعیم سے احرام باندھنا افضل ہے) یہ وہ جگہ ہے، جو مکہ سے انتہائی قریب مسجد عائشہ کے نزدیک ہے اور حل سے قریب ترین جگہ ہے۔یعنی عمرہ کے لئے تنعیم سے احرام باندھنا جعرانہ اور حل کے دیگر مقامات سے ہمارے نزدیک افضل ہے ،اگر چہ رسول اللہ ﷺ نے جعرانہ سے بھی احرام باندھا ہے اور ہمارے اس موقف پر حجت نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بہن (ام المؤمنین) ائشہ کو

تنعیم لے جائیں تا کہ وہ وہاں احرام باندھیں۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3 ص:429 مطبوعہ: داراحیاءالتراث العربی، بیروت)"۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگر چہ مسجدِ عائشہ (تنعیم) اورجعرانہ دونوں جگہ سے عمرے کا احرام باندھا جاسکتا ہے، لیکن مقامِ تنعیم (مسجد عائشہ) سے باندھنا افضل ہے۔

سوال: 74

کیا احرام کے لئے دورکعت نفل ادا کرنا حدیث مبارک سے ثابت نہیں؟۔

جواب:

احرام کے لئے دورکعت نفل پڑھنا سنت ہے اورحدیثِ مبارک سے ثابت ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

حدثني خصيف بن عبدالرحمن الجزري، عن سعيد بن جبير، قال:قلت لعبدالله بن عباس :يا أبا العباس ،عجبت لاختلاف أصحاب رسول الله ﷺ في اهلال رسول الله ﷺ حين أوجب؟! فقال اني لأعلم الناس بذالك،انها انما كانت من رسول الله ﷺ حجة واحدة،فمن هناك اختلفوا۔خرج رسول الله ﷺ حاجاً،فلماصلى في مسجده بذي الحليفة ركعتين أوجب في مجلسه،فأهلّ بالحج حين فرغ من ركعتين،فسمع ذالك منه اقوام فحفظته عنه،ثم ركب فلما استقلّت به ناقته أهلّ،وأدرك ذالك منه أقوام، وذالك أن الناس انما كانوا يأتون أرسالاً،فسمعوه حين استقلّت به ناقته يهلّ،فقالوا:انما أهلّ[رسول الله]حين استقلّت به ناقته،ثم مضى رسول الله ﷺفلماعلا على شرف البيداء أهلّ،وادرك ذالك منه أقوام فقالوا:انماأهلّ حين علا شرف البيداء۔[قال سعيد:] وايم الله لقد أوجب في مصلاه،وأهلّ حين استقلّت به ناقته،وأهلّ حين علا شرف البيداء۔[قال سعيد:]فمن أخذ بقول عبدالله بن عباس أهلّ في مصلاّه اذا فرغ من ركعتين۔

ترجمہ: ”خصیف بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ: ابوالعباس مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس جگہ سے احرام باندھا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اس مسئلے کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی حج کیا ہے اور اسی وجہ سے اختلاف ہوا۔جب رسول اللہ ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے تو آپ نے مسجد

WWW.NAFSEISLAM.COM

ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی مجلس میں آپ نے تلبیہ کہہ کر احرام باندھ لیا اور کچھ لوگوں نے آپ سے یہ تلبیہ سنا اور اس کو یاد رکھا، پھر آپ اونٹنی پر سوار ہوئے، جب آپ اونٹنی پر صحیح طریقے سے بیٹھ گئے تو آپ نے تلبیہ کہا اور کچھ لوگوں نے اس موقع پر آپ سے سنا، اور اس (اختلاف یا غلط فہمی) کا سبب یہ ہے کہ لوگ گروہ در گروہ آرہے تھے، اور (کچھ لوگوں نے) اس وقت آپ سے تلبیہ سنا، جب آپ اونٹنی پر بیٹھ گئے تو انہوں نے (اپنے مشاہدے کے بنا پر) یہ کہا: رسول اللہ ﷺ جب اونٹنی پر بیٹھ گئے، تو آپ نے اس وقت تلبیہ پڑھی (یعنی احرام باندھا)، پھر جب آپ شرف البیداء پر پہنچے تو آپ نے تلبیہ پڑھی، اور کچھ لوگوں نے (پہلی بار) آپ سے اسی موقع پر تلبیہ سنی تو انہوں نے یہ کہا کہ آپ نے شرف البیداء پر احرام کی نیت کی ہے اور (سعید نے کہا:) اللہ کی قسم آپ نے احرام کی نیت اس جگہ کی تھی جہاں آپ نے (دو رکعت) نماز پڑھی تھی اور پھر آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر بھی تلبیہ پڑھی اور شرف البیداء پر پہنچ کر بھی تلبیہ پڑھی۔ (سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ) جو شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر عمل کرتا ہے وہ مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھے (اور تلبیہ پڑھے)، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 1768)'' علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وصلّى ندباً) بعد ذالك (شفعاً) يعني ركعتين في غير وقت مكروه وتجزيه المكتوبة۔

ترجمہ: اور لباسِ احرام پہننے کے بعد نماز پڑھنا مستحب ہے یعنی دو رکعت وقتِ غیر مکروہ میں، اور (اگر وہ فرض کا وقت ہے تو) فرض بھی اس مقصد کے لئے کافی ہے۔

علامہ شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

(ندبا)وفي الغاية انها سنة ـ"نهر"ـوبه جزم في "البحر"و"السراج"ـقوله:(بعد ذالك)اى بعد اللبس والتطيب ـ"بحر"قوله:(يعني ركعتين)يشير الى ان الاولى التعبير بهما كمافعل في "الكنز"ـلان الشفع يشمل الاربع ـقوله:"وتجزيه المكتوبه" كذا في "الزيلعي"و"الفتح"و"النهر"و"اللباب"وغيرها وشبهوهابتحية المسجد ـوفي "شرح اللباب"انه قياس مع الفارق لان صلاة الاحرام سنة مستقلة كصلاة الاستخارة وغيرهامما لا تنوب الفريضة منابها،بخلاف تحية المسجد وشكر الوضوء ،فانه ليس لهما صلاة على حدة كما حققه في "فتاوى الحجة"ـفتتأدى في ضمن غيرها ايضاً اه ـ

ترجمہ:"(بطورنفل پڑھے)اور"الغایۃ" میں ہے کہ (بوقت احرام)دورکعت پڑھنا سنت ہے،اور"البحرالرائق"اور"السراج" میں اسی قول کوقطعی قرار دیا ہے،علامہ حصکفی کےقول:(اس کےبعد) کا مطلب یہ ہے کہ لباسِ احرام پہننے اورخوشبو لگانے کے بعد،"البحرالرائق" میں ہے کہ علامہ حصکفی کےقول (یعنی دورکعت پڑھے) سے مراد یہ ہے کہ نمازِاحرام کوکم ازکم دورکعت سے تعبیر کرنا اولیٰ (بہتر) ہے،جیسا کہ "کنزالدقائق"میں کیا ہے،کیونکہ دورکعت چارکوبھی شامل ہے(یعنی اگراس وقت چار رکعات پڑھ لیں) تو ان کے ضمن میں دورکعات بطریقِ اولیٰ آجائیں گی(اورچاریا زیادہ سے ممانعت مقصودنہیں ہے)،اورعلامہ حصکفی کا یہ کہنا کہ "اورفرض نماز کے ضمن میں بھی یہ دوگانہ احرام اداہوجائیں گی،جیسا کہ الزیلعی،فتح القدیر،النھر ،اللباب میں ہےاورانہوں نے اس (دوگانۂ احرام) کو(دوگانۂ)تحیۃ المسجد سے تشبیہ دی ہے(جوتنگیٔ وقت یاقیامِ جماعت کی صورت میں فرض کے ضمن میں

بھی ادا ہوجاتی ہے)، اور ''شرح اللباب'' میں ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ نمازِ استخارہ وغیرہ کی طرح نمازِ احرام مستقل سنت ہے، تو فرض نماز اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ، بخلاف تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء کہ ان کے لئے مستقل بالذات نمازِ مسنون نہیں ہے، جیسا کہ ''فتاوی الحجۃ'' میں اس کی (خوب) تحقیق کی ہے کہ یہ نمازیں (تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء) دوسری نمازوں (فرض وغیرہ) کے ضمن میں بھی ادا ہوجاتی ہیں، (رد المحتار علی در المختار جلد 3 ص 432: دار احیاء التراث العربی بیروت)''۔

سوال: 75

کیا حجرِ اسود کو بوسہ دینے یا چھونے کے وقت حصولِ برکت کی نیت کرنا بدعت ہے؟۔

جواب:

استلامِ حجرِ اسود یعنی حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت حصولِ خیر و برکت اور ثواب کی نیت کرنا بدعت نہیں بلکہ عین عبادت ہے کیونکہ حج و عمرہ کے ایک اہم رکن طوافِ بیت اللہ کے موقع پر حجرِ اسود کو بوسہ دینا سنت ہے۔ علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

من الاستلام فهو سنة بين كل شوطين كما في "غاية البيان" وذكر في "المحيط" و "الولوالجية" أنه في الابتداء والانتهاء سنة، وفيما بين ذلك أدب۔ "بحر"۔ ووفق في "شرح اللباب" بانه في الطرفين اكد مما بينهما۔

ترجمہ: ''استلامِ حجر ہر دو چکروں کے درمیان سنت ہے، جیسا کہ ''غایۃ البیان'' میں ہے اور ''المحیط'' اور ''والوالجیۃ'' میں ہے کہ طوافِ بیت اللہ کی ابتدا اور انتہا کے موقع پر سنت اور درمیان کے چکروں میں آداب میں سے یعنی مستحب ہے، ''البحر الرائق'' (میں بھی اسی طرح ہے)، اور ''شرح اللباب'' میں بھی اسی کے موافق کہا کہ طواف کی

ابتدا وانتہا میں حجراسود کا استلام زیادہ مؤکد ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 3،ص:453 مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی، بیروت)"۔

توجب حجرِ اسودکوبوسہ دینا عبادتِ حج وعمرہ کےایک اہم رکن طوافِ بیت اللہ کے دوران ہر چکر کے موقع پرسنت یا کم ازکم مستحب ہے،عبادت تو ثواب اورخیر برکت کے لئے ہوتی ہے،عبادت مشروع اوربدعت دومتضاد چیزیں ہیں،بعض لوگوں کوشاید اس حدیثِ مبارک سےغلط فہمی ہوئی ہے:

عن عبداللہ بن سرجس قال: رأیت الأصلع (یعنی عمر بن الخطاب) یقبل الحجر ویقول: واللہ انی لأقبلك، وانی اعلم انك حجر، وانك لا تضر ولا تنفع۔ ولو لا انی رأیت رسول اللہ ﷺ قبلك ما قبلتك۔

ترجمہ:"عبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسودکوبوسہ دے رہے تھے اورکہہ رہے تھے بخدا میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں،حالانکہ میں خوب جانتاہوں کہ تو ایک پتھر ہے،تو نفع دیتا ہے نہ نقصان،اوراگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا،(صحیح مسلم رقم الحدیث:3016)"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجرِ اسودکومخاطب کرکے یہ کہنا کہ:میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے،تو نفع دیتا ہے نہ نقصان،اوراگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا،اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حجرِ اسودیا کوئی بھی مخلوق اپنی ذات سے نفع یاضرررساں نہیں ہے،جس مخلوق میں جوبھی کمال ہے اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور یہ بات انہوں نے اس تناظر میں فرمائی کہ عہدِ جاہلیت میں لوگ پتھر کے بتوں کی عبادت کرتے تھےاورانہیں بالذات نفع دینے

والا اور نقصان پہنچانے والا سمجھتے تھے، مزید یہ کہ وہ عقیدۂ توحید کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنا چاہتے تھے اور اعمال خیر وعبادات میں اتباعِ رسول کو اصلِ مقصود سمجھنے کے تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے اور یہ بات عیاں ہے کہ جب حجرِ اسود کو بوسہ دینا، اتباعِ رسول ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ثواب بھی ہے، خیر و برکت بھی ہے اور اتباعِ سنت اسی نیت سے کرنی چاہئے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات سنے تو انہوں نے فرمایا: نہیں! یہ نفع بھی دیتا ہے اور نقصان بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے پوچھا! اس کا ثبوت کس سے ہے، حضرت علی نے کہا! قرآن مجید سے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذا اخذ ربك من بني ادم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلىٰ۔

ترجمہ: ''اور جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا، کیوں نہیں!''۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے اقرار کرایا ،اللہ ان کا رب ہے اور وہ اس کے بندے ہیں، اور ان سے اس کا عہد وپیمان لیا اور اس کو ایک کاغذ میں لکھ دیا اور پتھر کی دو آنکھیں اور ایک زبان تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: منہ کھول، اس نے منہ کھولا، اللہ تعالیٰ نے وہ کاغذ اس کے منہ میں ڈال دیا اور فرمایا: جو تجھ سے وفا کرے قیامت کے دن اس کی گواہی دینا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا: قیامت کے دن حجرِ اسود کو لایا جائے گا اور جو شخص اس کی تعظیم کرے گا یہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے

گا، پس اے امیر المؤمنین یہ ضرر بھی دیتا ہے اور نفع بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اس قوم میں رہوں، جس میں اے ابوالحسن تم نہ ہو، (شرح المؤطا جلد 2 ص: 287 مطبوعہ مطبع خیریہ مصر بحوالہ شرح صحیح مسلم جلد 3 ص: 499-498 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)"۔

سوال: 76

رمی جمرات کیلئے حجاج کرام مزدلفہ سے کنکریاں اپنے ہمراہ چن کر منیٰ لے جاتے ہیں کیا یہ مشروع ہے؟ یا حدودِ حرمِ پاک میں کہیں سے بھی چنی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے تینوں دن جمرات پر مارنے کے لئے کنکریاں یہیں سے لے لی جائیں یا کسی اور جگہ سے لی جائیں مگر نہ نجس جگہ کی ہوں اور نہ مسجد کی نہ جمرہ کے پاس کی ۔جمرہ کے پاس کی کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے کہ وہاں وہی کنکریاں رہتی ہیں جو مقبول نہیں ہوتیں اور مردود ہوجاتی ہیں، اور جو مقبول ہوجاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکرہ) أخذھا (من عند الجمرۃ) لأنّھا مردود لحدیث" من قبلت حجتہ رفعت جمرتہ (و) یکرہ (أن یلتقط حجراً واحداًفیکسرہ سبعین حجراً صغیراً)۔

ترجمہ: اور جمرے کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے، اس لئے کہ وہ مردود ہوتی ہیں حدیث شریف میں ہے کہ "جس کا حج قبول ہوجاتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں"، اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

وما هي الّا كراهة تنزيه۔ "فتح"۔ أشار الیٰ أنه يجوز أخذه من أی موضع سواه۔ وفي "اللباب": يستحب أن يرفع من مزدلفة سبع حصيات ويرمي بها جمرة العقبة وان رفع من المزدلفة سبعين أو من الطريق فهو جائز، وقيل مستحب اه۔

ترجمہ: "جمرہ کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ تنزیہی ہے "فتح القدیر" میں اسی طرح ہے۔ اور اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے مقام سے اٹھانا جائز ہے۔ اور "اللباب" میں ہے: مستحب ہے کہ جمرہ سے سات کنکریاں اٹھائی جائیں اور جمرۂ عقبہ پر رمی کی جائے، اور اگر مزدلفہ ہی سے یا کسی اور راستے سے 70 کنکریاں اٹھالی جائیں تو یہ جائز ہے اور بعض علماء نے مستحب فرمایا ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 473، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

سوال: 77

کیا تیسری رات بھی منیٰ میں گزارنا افضل ہے یا تیسرے دن (۱۲ ذی الحجہ) کو غروبِ آفتاب سے قبل منیٰ سے روانہ ہونا افضل ہے؟۔

جواب:

بارہویں کی رمی کرکے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے اختیار ہے کہ مکہ روانہ ہوجائے یعنی اس کی رخصت ہے، یہ افضل نہیں ہے، مگر غروب کے بعد جانا معیوب ہے اب ایک دن اور ٹھہرے اور تیرہویں کو دوپہر ڈھلے رمی کرکے روانہ ہو یہی افضل ہے۔ تیرہویں کی صبح ہوگئی تو بغیر رمی کئے جانا جائز نہیں اگر جائے گا تو دم واجب ہوگا۔

سوال: 78

اگر کوئی محرم بھول کر یا عدم علم کے سبب حالتِ احرام میں سلا ہوا کپڑا چند

لمحوں کے لئے پہن لے یا سر کو ڈھانک لے یا خوشبو استعمال کرلے یا بال وناخن تراش لےتو کیا دم واجب ہوگا؟۔

جواب:

جی ہاں! دم واجب ہوگا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(الـواجب دم علی محرم بالغ ولو ناسیاً) او جاھلاً او مکرھاً فیجب علی نائم غطی راسه(إن طیب عضواً)ـــــــــــــــــــــ(أو لبس مخیطاً)۔

اوسترراسه بمعتاد، اما بحمل اجانة اوعدل فلا شیٔ علیه یوما کاملا اولیلة کاملة ، وفی الاقل صدقة ۔

ترجمہ:''ہرمحرم بالغ پر(اگراس نے ترکِ واجب کیا ہوتو)دم واجب ہوتا ہے،خواہ اس نے وہ عمل بھول کرکیا ہو یا لاعلمی میں کیا ہو،یا حالتِ مجبوری میں کیا ہو،تو اگر نیند کی حالت میں محرم نے سر ڈھانپ لیا،(یا کسی پورے عضو پر خوشبو لگائی)۔۔۔آگے چل کرلکھتے ہیں:یا ایسا سلا ہوا کپڑا پہنا،جیسے عادتاً پہنا جاتا ہے،لیکن اگراسے چادر کے طور پر اوڑھ لیا یا اپنے کندھے پر رکھا تو کوئی حرج نہیں،پورا دن یا پوری رات سر ڈھانپ لیا،جیسے عام طور پر ڈھانپا جاتا ہے،(تمام سر یا چوتھائی حصہ)تو دم لازم ہوگا،لیکن اگر پورے دن یا پوری رات سے کم وقت ڈھانپا،تو صدقہ دینا ہوگا،(رد المحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 511,508 507 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

سوال: 79

کیا طوافِ افاضہ،طوافِ زیارت دونوں ایک ہیں؟

جواب:

جی ہاں! دونوں ایک ہیں،علامہ شامی لکھتے ہیں:

(ثم طاف للزیارۃ) أی لفعل طواف الزیارۃ الذی ھو ثانی رکنی الحج۔

قال فی "السراج" ویسمی الافاضۃ وطواف یوم النحر وطواف المفروض۔

ترجمہ:"(پھر طواف زیارت کرنا) یعنی طوافِ زیارت کرنا حج کا دوسرا اہم رکن ہے اور"السراج" میں فرمایا:اس کا نام طوافِ افاضہ،طوافِ یوم النحر اور طوافِ فرض بھی ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار:جلد 3ص: 476مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ، بیروت)"۔

سوال: 80

دس ذی الحجہ کے اعمال (رمی جمرۂ عقبہ،قربانی،حلق،طوافِ زیارت) میں ترتیب قائم نہ رہ سکے تو کیا کفارہ لازم آئے گا یا شریعت کی طرف سے تقدیم وتاخیر جائز ہے؟نیز حج بیت اللہ ناقص تو نہ ہوگا؟۔

جواب:

دس ذی الحجہ کے اعمالِ حج میں ترتیب لازم ہے،خلافِ ترتیب کرنے سے (یعنی تقدیم وتاخیر سے) دم لازم آتا ہے،اور اللہ تعالٰی کے کرم سے امید ہے کہ دم ادا کرنے سے حج ناقص نہیں رہے گا،علامہ ابوالحسن مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

"افعالِ حج کو ایک دوسرے پر مقدم کرنے کے حکم میں اختلاف ہے،جیسے سر منڈانے کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا قربانی کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا سر منڈانے کو قربانی سے پہلے کیا جائے ،امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک یہ جائز ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جو چیز فوت ہوگئی ہے اس کی تلافی قضا سے ہوجاتی ہے اور قضا کیساتھ کوئی اور

چیز لازم نہیں ہوتی، امام ابو حنیفہ کے نزدیک ترتیب کے خلاف کرنے سے دم لازم آتا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "من قدم نسكا على نسك فعليه دم" جس شخص نے حج کے ایک فعل کو دوسرے پر مقدم کر دیا اس پر دم لازم ہے"۔

علامہ ابن ھمام لکھتے ہیں کہ:

"امام ابو یوسف اور امام محمد کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ حجۃ الوداع میں کھڑے ہوئے تھے، ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ میں نے لاعلمی میں سر منڈا لیا، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب ذبح کر لو، ایک اور شخص نے کہا: میں نے لاعلمی میں کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر دی، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب کنکریاں مار لو اور اس دن جس چیز کے بھی مقدم یا مؤخر کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہی فرمایا کہ اب کر لو کوئی حرج نہیں ہے، اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ حرج نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس سے گناہ نہیں ہوگا اور حج فاسد نہیں ہوگا، یہ معنی نہیں ہے کہ اس پر کوئی جزا یا فدیہ نہیں ہے، کیونکہ کہنے والے نے یہ کہا کہ میں نے لاعلمی میں یہ کام کیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ کام کرنے کے بعد اس پر منکشف ہوا کہ یہ تقدیم یا تاخیر ممنوع تھی، اسی وجہ سے اس نے سوال کرنے سے پہلے اپنا عذر بیان کیا کہ میں نے لاعلمی کی بنا پر اس کو مقدم یا مؤخر کیا ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سائل نے جب یہ دیکھا کہ اس کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی ترتیب کے مخالف ہے اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ ترتیب معین ہے تو اس نے عذر پیش کر کے یہ سوال کیا اور نبی ﷺ نے جواب میں حرج کی نفی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہ ترتیب کرنا اس پر معین نہیں ہے بلکہ یہ ترتیب مسنون ہے نہ کہ واجب،

حق یہ ہے کہ جس طرح یہ احتمال ہے اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ترتیب واجب ہو اور نبی ﷺ نے اس کو جہل کی وجہ سے معذور قرار دیا ہو۔ آپ نے صحابہ کو افعال حج سیکھنے کا حکم دیا اور جہل کی وجہ سے ان کو معذور قرار دیا، کیونکہ یہ فرضیت حج کا ابتدائی دور تھا، اور جب اس معاملے میں یہ دونوں احتمال موجود ہیں تو احتیاطاً ترتیب کے وجوب کے قول پر عمل کرنا چاہئے اور اس سے امام ابوحنیفہ کی دلیل مضبوط ہوتی ہے اور ان کی تائید حضرت ابن مسعود کے اس قول سے ہوتی ہے: من قدم نسكا على نسك فعليه دم۔ (جس نے حج کی ایک عبادت کو دوسری پر مقدم کر دیا اس پر دم ہے) بلکہ یہ ایک مستقل دلیل ہے، ہدایہ کے بعض نسخوں میں حضرت ابن مسعود کی جگہ حضرت ابن عباس کا ذکر ہے اور یہ زیادہ معروف ہے۔ امام ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ذکر کی ہے، ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: من قدم شيئا من حجه او اخره فليهرق دماً۔ ترجمہ: ''جو شخص اپنے حج میں کسی عبادت کو مقدم یا مؤخر کر دے وہ ایک قربانی دے ''۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جس کو ضعیف کہا گیا ہے۔ امام طحاوی نے یہ روایت ایک اور سند سے بیان کی ہے جس میں یہ ضعیف راوی نہیں ہے وہ سند یہ ہے: حدثنا ابن مرزوق حدثنا الخصيب حدثنا وهيب عن ايوب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس مثله۔ امام طحاوی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان راویوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ''کوئی حرج نہیں اب کرلو'' اور یہ حدیث ان کے نزدیک اجازت اور اباحت پر محمول نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اس پر محمول ہے کہ انھوں نے جہل اور لاعلمی کی وجہ سے بعض عبادات کو مقدم یا مؤخر کر دیا تھا، آپ نے ان کو معذور قرار دیا اور حج کی عبادات سیکھنے کا حکم دیا، علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ کے نظریہ پر اس آیت سے بھی

استدلال ہے: فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ ۔ ’’تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ فدیہ دے‘‘۔اس آیت میں اللہ تعالٰی نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص بیماری کے عذر کی بناء پر اپنے وقت سے پہلے سر منڈا دے تو وہ فدیہ دے تو جب عذر کے باوجود وقت سے پہلے سر منڈانے پر فدیہ لازم آتا ہے،تو وقت سے پہلے بلا عذر سر منڈانے پر تو بطریقِ اولٰی فدیہ لازم آئے گا،(فتح القدیر جلد 3 ص: 55 مطبوعہ مرکزِ اہلِ سنت برکاتِ رضا ، گجرات،انڈیا)‘‘۔الغرض امام اعظم کے نزدیک رمی،قربانی (متمتع اور قارن کے لئے)اور حلق میں ترتیب واجب ہے،حجِ اِفراد والے پر چونکہ قربانی واجب نہیں ہے لہٰذا اس پر صرف دو امور (رمی اور حلق)میں ترتیب واجب ہے،البتہ طوافِ زیارت میں ترتیب واجب نہیں ہے،یہ خلافِ ترتیب (یعنی رمی،قربانی اور حلق سے پہلے)بھی کیا جاسکتا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

فیجب فی یوم النحر اربعۃ اشیاء :الرّمی ،ثمّ الذبح لغیر المفرد ،ثمّ الحلق ،ثمّ الطّواف ،لکن لا شئی علی من طاف قبل الرّمی و الحلق ،نعم یکرہ ۔

ترجمہ:’’پس نحر (قربانی) کے دن (یعنی دس ذی الحجہ کو) چار امور واجب ہیں:(1) رمی (یعنی بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا)،(2) غیرِ مُفرِد (یعنی حجِ قران اور حجِ تمتّع کرنے والے کے لئے)ذبح یعنی قربانی کرنا ،(3)اور حلق کرنا (یعنی سَر منڈانا یا بال کاٹنا)، (4)طوافِ زیارت کرنا (اسے طوافِ اِفاضہ بھی کہتے ہیں)،لیکن کسی نے رمی اور حلق سے پہلے طواف کرلیا،تو اس پر کوئی چیز (یعنی دَم یا صدقہ)واجب نہیں ہے،ہاں !اس طرح کرنا مکروہ ہے۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

والحاصل أن الطواف لا يجب ترتيبه علی شئی من الثلاثة ،وانما يجب ترتيب الثلاثة : الرّمی ثمّ الذبح ثمّ الحلق ،لكن المفرد لا ذبح عليه فيجب عليه الترتيب بين الرمی والحلق فقط ۔

ترجمہ:''اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ طوافِ زیارت کی ترتیب ان تینوں چیزوں میں سے کسی چیز پر بھی واجب نہیں ہے،ترتیب فقط ان تین چیزوں کے درمیان واجب ہے ،یعنی پہلے

''رمی'' کرے،پھر ''قربانی'' کرے اور پھر ''حلق یا قصر'' کرے،لیکن مُفرِد (یعنی جس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو)پر چونکہ قربانی نہیں ہے،لہٰذا اس کے لئے صرف دو چیزوں یعنی رمی اور حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد3،ص:520، 521،دارا حیاءالتراث العربی،بیروت)''۔

سوال: 81

بعض احباب حج وعمرہ کی نیت سے وطن سے حجازِ مقدس روانہ ہوتے ہیں، مگراحرام کےبغیر میقات سے گزرتے ہیں، پہلے چند دن جدہ یا ریاض یا وہاں کے دیگرشہروں میں اپنے عزیزواقارب کےگھرقیام کرکےپھران کےہمراہ احرام باندھ کرعمرہ یا حج کی ادائیگی کے لئے جاتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل مناسک حج وعمرہ میں نقائص کا سبب تو نہیں بنتا،اس تناظر میں کیاان پر دم واجب ہوگا؟۔

جواب:

مکہ معظّمہ جانے کا ارادہ نہ ہو بلکہ میقات کے اندر(یعنی حِل میں، جوحدودِحرم کےاختتام اورمیقات کےدرمیان کاعلاقہ ہے)کسی اور جگہ مثلاً جدہ جانا چاہتا ہےتو اسے احرام کی ضرورت نہیں پھروہاں سے اگرمکہ معظّمہ جانا چاہےتوبغیر

احرام جاسکتا ہے لہٰذا جو شخص حرم میں بغیر احرام جانا چاہتا ہے وہ یہ حیلہ کرسکتا ہے بشر طیکہ واقعی اس کا ارادہ پہلے مثلاً جدہ یا کسی اور مقام حل میں جانے کا ہو، نیز مکہ معظّمہ حج اور عمرہ کے ارادے سے نہ جانا ہو مثلاً تجارت کے لئے جدہ جاتا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر مکہ معظّمہ جانے کا ارادہ ہے اور اگر پہلے ہی سے مکہ معظّمہ کا ارادہ ہے تو پھر بغیر احرام نہیں جانا چاہئے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(قصد دخول مكة) يعني الحرم (ولو لحاجة) غير الحج، أما لو قصد موضعاً من الحل كخليص وجدة حل له مجاوزته بلا احرام، فاذا حل به التحق بأهله فله دخول مكة بلا احرام۔

ترجمہ: ''حج کے علاوہ اپنی کسی ضرورت کے لئے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا پھر ارادہ کیا، یا اگر حدودِ حل میں کسی مقام پر جانے کا ارادہ کیا، جیسے خلیص یا جدّہ تو پھر اس کے لئے میقات سے احرام کے بغیر گذرنا جائز ہے، جب وہاں اتر کر اپنے گھر والوں سے مل جائے تو اب وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہوسکتا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 427 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

بہت سے آفاقی لوگ، جیسے اہل پاکستان، جن کے عزیز واقارب سعودی عرب میں جدّہ یا کسی اور مقامِ حِل میں رہتے ہیں، جب حج یا عمرہ کیلئے جانا چاہتے ہیں تو سہولت پسندی کی وجہ سے یہاں سے احرام باندھ کر نہیں جاتے ہیں، بلکہ پہلے جدّہ یا کسی دوسرے مقام پر جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے عزیز واقارب کے ساتھ احرام باندھ کر جا کر عمرہ کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کے لئے جائز ہے، افضل ہرگز نہیں ہے اور یقیناً اجر وثواب میں کمی کا بھی باعث ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ یہاں سے عمرے کی نیت سے سفر کر رہے ہیں تو بغیر احرام کے ان کا میقات سے گذرنا درست نہیں ہے۔

اوراگر وہ یہاں سے دوستوں عزیزوں کی ملاقات کی نیت سے جدّہ یاکسی اور مقامِ حِل کا سفر کرتے ہیں،تو یہاں سے ان کا یہ سفر عبادات میں شمار نہیں ہوگا،تاہم اس سے ان پر دم واجب نہیں ہوگا،البتہ یہ اجر میں کمی کا باعث ہوگا۔اس لئے ہمارے نزدیک افضل یہ ہے کہ وہ یہاں سے احرام باندھ کر روانہ ہوں تو ان کا یہ پورا سفر اور کل مصارف سفر عبادت میں شمار ہوں گے،اور خدانخواستہ کسی حادثۂ ناگہانی کا شکار ہوگئے تو روزِ حشر حالتِ احرام میں اٹھیں گے،جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: بینما رجل واقف مع رسول اللہ ﷺ بعرفة،اذ وقع عن راحلته فوقصته،أو قال فأقعصته،فقال رسول اللہ ﷺ: "اغسلوہ بماءٍ وسدر، وکفّنوہ فی ثوبین،ولا تحنّطوہ،ولا تخمّروا رأسه،فانّ اللہ یبعثه یوم القیامة ملبیا"۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:ایک آدمی عرفات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھڑا تھا کہ سواری سے گر پڑا جس نے اس کی گردن کچل دی یا وہ کچلا گیا ،نبی کریم ﷺ نے فرمایا:اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور دو کپڑوں کا کفن دو،اسے خوشبو نہ لگانا اور نہ اس کا سر چھپانا۔اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے اس حال میں اٹھائے گا کہ تلبیہ کہہ رہا ہوگا،(صحیح بخاری رقم الحدیث:1449)''۔

مزید یہ کہ اگر یہاں سے احرام باندھ کر عمرے یا حج کی نیت سے روانہ ہوئے ہیں اور درمیان میں ایک یا دو دن انہیں جدّہ میں ٹھہرنا پڑے تو یہ سارا وقت بھی عبادت میں شمار ہوگا،احرام میں کوئی وزن تو نہیں اٹھانا،بس صرف احرام کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔

سوال: 82

بعض حج گروپ اپنے گروپ کے افراد کو ۷، ذی الحجہ کو منیٰ اور ۸، ذی الحجہ کی شب کو عرفات میں قیام کراتے ہیں، بعض احباب کے استفسار پر یہ جواز پیش کرتے ہیں، اس عجلت سے ہم ٹریفک کے اژدھام اور سفر کے دیگر مصائب ومشکلات سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور ہر دو مقام پر جگہ بھی مناسب مل جاتی ہے، کیا از روئے شرع ان کا یہ عمل حج کے اعمال میں نقائص کا سبب تو نہ بنے گا؟۔

جواب:

۷، ذی الحجہ کو بعد نمازِ ظہر امام خطبہ پڑھتا ہے اس خطبے کو سنے، یوم الترویہ (۸، ذی الحجہ) کو آفتاب نکل آئے تو منیٰ کو روانہ ہو آفتاب نکلنے سے پہلے گیا تو بھی جائز مگر بعد میں جانا بہتر ہے زوال کے وقت بھی جا سکتا ہے مگر ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھے، رات منیٰ میں ٹھہرے فجر پڑھ کر عرفات روانہ ہو۔

(و خطب الامام اولیٰ خطب الحج الثلاث سابع ذی الحجة بعد الزّوال و)بعد(صلاة الظهر)وکره قبله (وعلم فیها المناسك فاذا صلّی بمکّة الفجر) یو م التروية (ثامن الشهر الی منی ومکث بها الی فجر عرفة ثمّ)بعد طلوع الشمس (راح الیٰ عرفات)علیٰ طریق ضب(و) عرفات (کلها موقف الّا بطن عرنة) (فبعد الزوال قبل) صلاة (الظهر خطب الامام)۔

ترجمہ: (اور امام خطبہ پڑھے گا ۷، ذی الحجہ کو بعد زوال اور بعد نمازِ ظہر) اس سے پہلے مکروہ ہے (اور مناسک حج سیکھے پھر نمازِ فجر مکہ میں پڑھے، ۸ ذی الحجہ کو منیٰ روانہ ہو اور فجر تک عرفہ میں ٹھہرے پھر بعد طلوع آفتاب عرفات کو چلے پورا عرفات موقف ہے سوائے بطن عرنہ کے پھر بعد زوال نمازِ ظہر سے پہلے امام خطبہ پڑھے گا، (رد المحتار علی

WWW.NAFSEISLAM.COM

الدرالمختار جلد 3 ص: 458 459 , مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"،علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

" آج کل بعض مطوفوں نے یہ نکالی ہے کہ آٹھویں کو منیٰ میں نہیں ٹھہرتے سیدھے عرفات پہنچتے ہیں ان کی نہ مانے اوراس سنت عظیمہ کو ہرگز نہ چھوڑے ،(بہارِ شریعت جلد اول،ص:478 مکتبۂ رضویہ آرام باغ ،کراچی)"۔ایک تو یہ ہے کہ کاہلی،سہل پسندی اور سنت کواہمیت نہ دیتے ہوئے قیامِ منیٰ کوترک کردیا جائے ،یہ سوچ اورطرزِ عمل بلا شبہ اجروثواب میں کمی کا باعث بنے گا اورعبادت حج کے کامل واکمل ہونے میں مانع اور حارج ہوگا،اگرچہ ادائے فرض ہوجائے گا،لیکن عبادت کا اجرِ کامل اور مرتبۂ کمال کسی عبادت کے اندر فرض وواجب کے ساتھ سنن ومستحبات اورآداب کی کامل رعایت اورمحرمات اورممنوعات اورمکروہات سے اجتناب سے نصیب ہوتا ہے، تاہم اگر بندہ اپنی طرف سے پوری جدوجہد کرے مگرٹریفک میں پھنس جانے یامنیٰ میں جگہ نہ ملنے کے باعث قیام منیٰ نہ کرسکا ہوتو اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال جاننے والا ہے، لیکن چونکہ یہ سبب ترک سنت اللہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ بندوں کی اپنی طرف سے ہے اسی لئے احتیاط پسند اورتقویٰ شعار علماء یہ کہتے ہیں کہ بندے کوحج کے اختتام پر حسب توفیق دم یاصدقہ دے دینا چاہئے تاکہ دانستہ یانادانستہ یامجبوری ومشکلات کے باعث عبادت میں کچھ کمی رہ گئی ہوتو اس کی تلافی ہوجائے"۔

سوال: 83

ایک کلمہ گوحضورﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں شفیع المذنبین کاعقیدہ رکھتے ہوئے ،حضورﷺ کی بارگاہ میں درخواست شفاعت پیش کرتا ہے،زید یہ کہتا ہے کہ اگر درخواست شفاعت پیش کی اوراس پر بھروسہ کیا توباجماع امت کافرہوگیا،نیز

حضورﷺ سے کس طرح کا سوال کرنا شرک ہے؟

جواب:

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ماذونین کی شفاعت کا قرآن مجید میں خود ذکر فرمایا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام ورُسل عظام علیہم الصلاۃ والتسلیم ،اولیاء کرام، مقرّبین ومکرّمین ومحبوبین رضی اللہ عنہم اجمعین حتیٰ کہ ازروئے حدیث حافظ وعاملِ قرآن اور نا تمام پیدا شدہ بچے کی شفاعت بھی ازروئے حدیث ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

من ذالذی یشفع عندہٗ الا باذنہ۔

ترجمہ: ’’کس کی مجال ہے کہ اس کی بارگاہ میں شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذنِ شفاعت دے دے، (البقرہ:255)‘‘۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ ماذون الشفاعت ہیں اور احادیثِ مشہورہ سے آپ کی شفاعتِ کبریٰ ثابت ہے، اسی طرح سے بچے کی نمازِ جنازہ میں اسی ترتیب کے بعد جو بھی دعا پڑھی جاتی ہے، اس میں ہم سب پڑھتے ہیں:

اللھم اجعلہ لنا شافعا و مشفعا۔

ترجمہ: ’’اے اللہ اس بچے کو ہمارے لئے شفاعت کرنے والا اور مقبولِ شفاعت بنا دے‘‘۔

عن جابر؛ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: ” ان شفاعتی یوم القیامۃ لاھل الکبائر من امتی۔

ترجمہ: ’’حضرت جابر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری شفاعت قیامت

کے دن میری امت کے گناہِ کبیرہ والوں کے لئے ہے،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:4310)''۔

اسی طرح حدیث پاک میں ناتمام بچوں کے بارے میں آیا ہے کہ جب ان کے ماں باپ کو جہنمی قرار دیا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے عطا کردہ اذن سے بطورِ خاص احتجاج کرے گا،تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: أیّھا السقط المراغم ربّہ! أدخل أبویك الجنّة۔

ترجمہ:''اے اپنے رب سے جھگڑنے والے ناتمام بچے ،جا اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جا،(سنن ابنِ ماجہ رقم الحدیث:1608 مطبوعہ دارالفکر بیروت)''۔

حافظِ قرآن کے بارے میں حدیث ہے:

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قرأ القرآن واستظھرہ فاحلّ حلالہ وحرّم حرامہ ادخلہ اللہ بہ الجنّة وشفّعہ فی عشرة من اھل بیتہ کلھم قد وجبت لہ النار۔

ترجمہ:حضرت علی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:جس نے قرآن پڑھا اس کو یاد(حفظ) کیا،پس حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا،تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کی شفاعت سے اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد جن پر جہنم لازم ہوگئی ہو جنت میں داخل فرمائے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث:2905)''۔

عن عثمان ابن عفان قال: قال رسول اللہ ﷺ:''یشفع یوم القیامة ثلاثة: الانبیاء ثم العلماء ثم الشھداء''۔

ترجمہ:''حضرت عثمان ابن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا:قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی، انبیاء پھر علماء پھر شہید لوگ ،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:4313"۔

سوال: 84

زید یہ کہتا ہے کہ زیارت روضۃ النبی ﷺ مشروع نہیں ،جن احادیث سے دلائل پیش کیے جاتے ہیں، وہ ضعیف یا موضوع ہیں ونیز زائرین کے لئے مسجد نبوی ﷺ کی زیارت مسنون ہے،خواہ قبل از حج ہو یا بعد از حج ؟۔

جواب:

زیارتِ روضۃ النبی ﷺ کے ثبوت میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ پیشِ خدمت ہیں:

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من حج فزار قبری بعد وفاتی کانما زارنی فی حیاتی ۔

ترجمہ:"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہے ،(سنن دار قطنی جلد 2 ص:378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)"۔

اس حدیث کو امام بیہقی نے (السنن الکبریٰ جلد 2 ص: 246 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)،حافظ الہیثمی نے (مجمع الزوائد جلد 4 ص:2 دار الکتب العربیہ بیروت)،علامہ علی متقی ہندی نے (کنزالعمال جلد 5 ص: 135 موسسۃ الرسالۃ بیروت)،اور حافظ دیلمی (فردوس الاخبار جلد 4 ص:72 دار الکتب العربیہ بیروت) نے بھی ذکر کیا ہے۔

عـن حاطب قال: قال رسول اللہ ﷺ :من زار نی بعد موتی،فکانما زار نی فی حیاتی و من مات باحد الحرمین بعث من الامنین یوم القیامۃ۔

ترجمہ:''حاطب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میرے وصال کے بعد میری زیارت کی اس نے گویا کہ میری زندگی میں میری زیارت کی اور جو شخص حرمین میں سے کسی جگہ فوت ہوا،وہ قیامت کے دن امن والوں میں سے اٹھے گا،(سنن دار قطنی جلد 2 ص:378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)''۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص:136 مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ من زار قبری و جبت لہ شفاعتی۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی،(سنن دار قطنی جلد 2 ص:378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)''۔

حافظ الہیثمی نے (کشف الاستار عن زوائد البزار ج 2 ص:57،مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ ،بیروت)اس کو امام بزار کے حوالے سے ذکر کیا ہے:

عـن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم من حج البیت و لم یزرنی فقد جفانی۔

ترجمہ:''حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت کے لئے نہیں آیا،اس نے مجھ سے بے وفائی کی،(فردوس الاخبار ج: 4 ص: 1 7 مطبوعہ دار الکتاب العربی،بیروت)''۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنزالعمال جلد 5 ص:136 مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے۔

نوٹ: مندرجہ بالا حوالہ جات شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 3 صفحات 766 سے نقل کیے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ان روایات کے ضعف کا قول تو کیا گیا ہے، لیکن شیخ ابن تیمیہ اوران کے متبعین کے سوا کسی نے انہیں موضوع قرار نہیں دیا، حج وعمرے کے موقع پر زیارت روضۂ رسول اکرم ﷺ کو کسی نے واجب نہیں قرار دیا، بلکہ یہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مسنون ومستحب امر ہے، اورچونکہ بعض روایات میں ترکِ زیارت پر وعید بھی آئی ہے اوررسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے ساتھ جفا قرار دیا ہے تواس کا سنت ہونا زیادہ مؤکد قریب بہ واجب ہوجاتا ہے۔

کسی حدیث کو اگر ماہرینِ اسماء الرجال نے ضعیف قرار دیا ہو تو یہ ایک علمی اورفنی بحث ہے، اسے حدیث پر ترکِ عمل کا سہارا نہیں بنانا چاہئے، اورویسے بھی علماء کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ "فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں"، اورکسی ایک موضوع پر متعدد ضعیف احادیث ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتی ہیں، اس کی ایک عملی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص آپ کو آکر ایک خبر سناتا ہے، آپ اسے زیادہ ثقہ اورمعتمد نہیں سمجھتے، لیکن پھر مختلف جہات سے اس جیسے کئی افراد اپنے مشاہدے کی بناء پر وہی خبر سناتے ہیں تو آپ یقین کرلیں گے کہ یہ واقعہ ضرور ہوا ہوگا۔اورویسے بھی یہ بڑی جفا، شقاوت اوراحسان فراموشی کی بات ہوگی کہ جس ذاتِ والا صفات، خاتم النبیّن رحمۃ للعلمین ﷺ کے وسیلے سے بیت اللہ کا عرفان ملا، عبادات حج وعمرہ نصیب

ہوئیں، دولتِ ایمان ملی، نعمتِ قرآن ملی، ان کے قریب جا کر، سلام عرض کیے اور زیارت و حاضری کا شرف حاصل کیے بغیر بندہ واپس آجائے۔

ہم لوگ تو ویسے ہی گنہگار رہیں، عصیاں شعار ہیں، اپنی بداعمالیوں کے سبب خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور عبادت حج کا ایک مقصدِ جلیل تعمیلِ حکمِ باری تعالیٰ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہمارے گناہوں کی عفو و مغفرت کی کوئی صورت نکل آئے اور اس کی صورت اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمائی ہے:

ولو انھم اذظلموآ انفسھم جآءُ وك فاستغفروا اللّٰه واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللّٰه توابا رحیماo

ترجمہ: اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے، تو یہ آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرتے، تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم فرمانے والا پاتے، (سورۃالنسآء: 64)"۔

بیشتر مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیہ مبارکہ کی رو سے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ ظاہری میں گنہگارانِ امت کے لئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعاء مغفرت کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لئے استغفار کرنا وسیلۂ مغفرت تھا، اسی طرح آپ کے وصال فرمانے کے بعد آپ کے روضۂ اقدس پر حاضری بھی وسیلۂ مغفرت ہے، چنانچہ حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی 774ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہو جائے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آکر استغفار کریں، پھر رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ

WWW.NAFSEISLAM.COM

ان کی توبہ قبول فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان پائیں گے۔مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے ان میں الشیخ ابومنصور الصباغ بھی ہیں،انہوں نے اپنی کتاب الشامل میں عتبی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں (رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد) نبی ﷺ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آکر کہا السلام علیک یا رسول اللہ، میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے: ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاؤك الآیہ اور میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں، پھر اس نے عربی کے دو شعر پڑھے،جن کا ترجمہ یہ ہے:

اے وہ جو زمین کے مدفونین میں سب سے بہتر ہیں

جن کی خوشبو سے زمین اور ٹیلے خوشبودار ہو گئے

میری جان اس قبر پر فدا ہو جس میں آپ ساکن ہیں اس میں عفو ہے اس میں سخاوت ہے اور لطف و کرم ہے

پھر وہ اعرابی چلا گیا،عتبی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آگئی، میں نے خواب میں نبی ﷺ کی زیارت کی اور آپ نے فرمایا اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جا کر اس کو خوشخبری دو کہ اللہ نے اس کی مغفرت کردی ہے،(تفسیر ابن کثیر ج 2 ص: 329-328،الجامع لاحکام القرآن ج 5 ص: 265، البحر المحیط ج 3 ص: 694،مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج 1 ص:399)۔

مفتی محمد شفیع متوفی 1396ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے،لیکن اس کے الفاظ

سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعاءِ مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیاوی حیات کے زمانہ میں ہوسکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے، اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی عتبی کی مذکورالصدر حکایت بیان کی ہے، (معارف القرآن ج2ص:460-459، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی)۔

معروف دیوبندی عالم شیخ محمد سرفراز گکھڑوی لکھتے ہیں:

عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے، اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیماً وحدیثاً اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ مواہب میں بہ سند امام ابو منصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمھم اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل، اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے: ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جآءُ وك فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیماً o اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے۔ اور اس محمد بن حرب کی وفات 228ھ میں ہوئی ہے، غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں، پس حجت ہو گیا (نشر الطیب ص 254) اور حضرت مولانا نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں: ”کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں، آپ

کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں، اور تخصیص ہوتو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لئے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں (آب حیات ص:40) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں: پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے، (اعلاء السنن ج10 ص:330)۔

ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت و مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے (شفاء السقام ص:128) اور خیر القرون میں یہ کاروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے، (تسکین الصدور ص:365-366، ملخصاً، مطبوعہ ادارہ نصرت العلوم گوجرانوالہ)۔

نوٹ: یہ تمام حوالہ جات تفسیر تبیان القرآن مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 2 صفحات 714 تا 716 سے نقل کئے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ باری تعالیٰ سے طلبِ مغفرت کے لئے اور رسول اللہ ﷺ سے طلبِ شفاعت کے لئے روضۂ رسول اور ختم المرسلین کی بارگاہِ اقدس میں حاضری از سلف تا خلف متفق علیہ امر ہے اور رسول اللہ ﷺ اپنی حیاتِ ظاہری کی طرح اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی ہمارے احوال واعمال کا مشاہدہ فرماتے ہیں، اذنِ باری تعالیٰ سے ہماری نصرت اور دستگیری فرماتے ہیں اور بارگاہِ رب العلی میں ہمارے لئے عفو ومغفرت اور شفاعت کا وسیلۂ کاملہ قطعیہ ہیں۔

عمرے کی ادائیگی کے لئے محرم

سوال: 85

کوئی شخص اپنی ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ساتھ حج یا عمرے کی ادیگی کے لئے جاسکتا ہے؟۔(حافظ سلیم محمود،R-772 سیکٹر 7-D/3 نارتھ کراچی)۔

جواب:

خواتین کیلئے حج وعمرے کی وہی شرائط ہیں،جو مردوں کیلئے،ہاں!ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفرِ حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔محرم سے مراد نسب،رضاعت(دودھ شریک کا رشتہ)یا مصاہرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں،جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو،جیسے باپ،چچا ،ماموں،بیٹا،بھتیجا،بھانجا،داماد،خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی،باپ وغیرہ۔

امام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

واما الذی یخص النساء فشرطان:احدھما:ان یکون معھا زوجھااو محرم لھا فان لم یوجد احدھمالا یجب علیھا الحج۔

ترجمہ:اورعورتوں کے لئے دو شرطیں خاص ہیں،ان میں سےایک شرط یہ ہے کہ اس کا شوہر یا اس کا محرم اسکے ساتھ ہو،پس اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو نہ پائے تو اس پر حج واجب نہیں،دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ثم صفة المحرم أن یکون ممن لا یجوز له نکاحھا علی التابید اما بالقرابة أو الرضاع أو المصھریة لأن المحرمة المؤبدة تزیل التھمة فی الخلوة،ولھذا قالوا:ان المحرم اذا لم یکن مأموناً علیه لم یجز أن تسافر معه۔

ترجمہ: ''محرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو، خواہ حرمتِ نکاح رشتۂ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتہء رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتہء سسرالی کی وجہ سے (مثلاً داماد)، کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے کہا ہے کہ اگر محرم بھی قابلِ اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ بھی عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 188،87 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات ھند)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(القسم الثانی المحرمات بالصہریۃ) وھی اربع فرق (الاولیٰ) امھات الزوجات وجداتھن من قبل الاب والام وان علون ۔

ترجمہ: ''(دوسری قسم سسرالی رشتے سے محرمات کے بیان میں) اور وہ چار قسموں پر ہیں (ان میں سے ایک) بیوی یا بیویوں کی مائیں اور دادیاں، نانیاں، (خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے) اگرچہ اوپر تک ہوں، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص 274 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

لہٰذا داماد ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ہمراہ حج یا عمرے کے سفر پر جا سکتا ہے، کیونکہ وہ سسرالی رشتے کی بناء پر اس کا محرم ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حج سے تمام گناہوں کا معاف ہو جانا

سوال : 86

آپ سے ایک مسئلہ یہ میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے

لے کر آج تک اللہ تعالٰی کے فضل وکرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کر لیتی ہوں، (عذرا جہاں، کورنگی)۔

جواب:

آپ نے جو لکھا ہے کہ ''حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں''، ادائیگی حج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے، فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم، زکوٰۃ کی ادائیگی، حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے، تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔ حدیث مبارک میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور فحش کلام نہ کیا اور فسق نہ کیا تو گناہوں سے ایسا پاک ہو کر لوٹا جیسے اس دن پاک تھا جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، (صحیح بخاری و مسلم)۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمرہ سے عمرہ تک ان گناہوں کا کفارہ ہے جو درمیان میں ہوئے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہی ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بندے سے جو صغیرہ گناہ نادانستہ طور پر سرزد ہو جاتے ہیں اعمال صالحہ کی برکت سے اللہ تعالٰی انہیں معاف فرما دیتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں (ایک نماز سے دوسری نماز تک) اور جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کفارہ ہے ان گناہوں کے لئے جو اس درمیان ہوئے جب کہ وہ گناہِ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو، (صحیح مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بتاؤ تو کسی

دروازے پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ بار غسل کرے، کیا اس کے بعد بدن پر میل رہ جائے گا عرض کی نہیں اس کے بدن پر کوئی میل باقی نہیں رہے گا فرمایا: یہی مثال پانچو ں نمازوں کی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سبب خطاؤں کو محو (مٹا) فرمادیتا ہے، (صحیح بخاری ومسلم)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ایک صاحب آئے عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھ پر حد قائم فرمایئے آپ نے اس سے کوئی سوال نہ فرمایا اور نماز کا وقت آ گیا پھر اس شخص نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ شخص پھر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ میں نے ایسا فعل کیا ہے کہ جس کے باعث مجھ پر حد واجب ہوگئی ہے تو مجھ پر حد قائم فرمایئے جو کتاب اللہ میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی اس عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تیرے گناہ کو جو تیرے نزدیک موجب حد تھا معاف فرمادیا، (بخاری ومسلم)۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صاحب سے ایک گناہ صادر ہوا حا ضر ہو کر عرض کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ترجمہ: ''نماز قائم کرو دن کے دونوں کنا روں اور رات کے کچھ حصے میں بیشک نیکیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، (سورۃ ہود: 114)''۔

انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ خاص میرے لئے ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری تمام امت کے لئے، ایک روایت میں یہ بھی آیا آپ نے فرمایا: کہ میر ی امت سے جو بھی نیک عمل کرے، (صحیح بخاری ومسلم)۔

ان احادیث مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبادات کی برکت سے صغیرہ اور غیر

ارادی گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے کسی عذر شرعی کی بناء پر فرض ترک ہوگیا ہے تو وہ معذور ہے عذر اٹھ جانے کے بعد اسے ادا کرے۔ اگر بلاعذر شرعی محض کوتاہی یا سرکشی کی بناء پر مثلاً فرض نماز وقت پر نہیں پڑھی، یا رمضان میں روزہ بلاعذر شرعی ترک کر دیا تو یہ عمل بجائے خود فسق اور کبیرہ گناہ ہے، ان قضاء شدہ نمازوں اور روزوں کی قضاء کرے اور بلا عذر قضاء کا جو گناہ کیا ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے اور توبہ کرے، واللہ اعلم بالصواب۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب النکاح﴾

حرمتِ رضاعت

سوال: 87

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین علماءِ کرام قرآن وسنت کی روشنی میں ازراہِ کرم جواب سے جلد از جلد مرحمت فرمائیں، کہ میرے ایک دوست کے بھائی محمد صالح شاہ اور اس کی کزن چچا کی بیٹی فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی ان کے والدین طے کرنا چاہتے ہیں، مگر دونوں کے والدین یہ جانتے ہیں کہ محمد صالح شاہ نے اپنی چچی فاطمہ کی والدہ کا شیر خوارگی کی عمر میں دودھ پیا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہے کہ ان دونوں کا نکاح نہیں ہوسکتا جو کہ میں نے اپنے دوست کو بتایا تھا مگر اس نے کہا کہ کوئی شرعی فتوٰی ثبوت کے طور پر ہو، جو وہ والدین اور اپنے چچا کو دکھائے تا کہ کسی بھی غلطی اور گناہ سے بچا جا سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا محمد صالح شاہ کے کسی بھی بھائی سے نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔ (محمد عباس ہاشمی اختر القادری رضوی، ڈاکخانہ ٹنڈو مٹھا خان تحصیل وضلع سانگھڑ)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالٰی کا فرمان ہے: وامھتکم التی ارضعنکم واخوٰتکم من الرضاعۃ۔

ترجمہ: ’’اور تمہاری مائیں، جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کی گئیں)۔ (النساء، آیت 23)‘‘۔

ا۔عن عائشۃ قالت: قال لی رسول اللہ ﷺ: ’’یحرم من الرضاعۃ ما یحرم

من الولادة"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3505، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکۃ المکرمۃ)''۔

۲۔عن ابن عباس قال : قیل للنبی ﷺ: الا تتزوّج ابنة حمزة؟، قال : "انها ابنة اخی من الرضاعة۔"

ترجمہ: ''ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے ؟، ارشاد فرمایا: ''وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5100، مکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فتاوی عالمگیری میں لکھتے ہیں:

"یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصو لهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعاً حتیٰ ان المرضعة لو ولدت من هذاالرجل او غیرہ قبل هذاالارضاع اوبعدہ اوارضعت رضیعاًاو ولد لهذاالرجل من غیرهذہ المرأة قبل هذاالارضاع اوبعدہ او ارضعت امراۃ من لبنه رضیعا فالکل اخوۃ الرضیع واخواته واولادهم اولاداخوته واخواته واخوالرجل عمه واخته عمته واخو المرضعة خاله واختها خالته و کذا فی الجد والجدة

ترجمہ: ''دودھ پینے والے پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہوجاتے ہیں، خواہ وہ نسبا اصول وفروع ہوں یا رضاعا حتی کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اس کے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو، خواہ دودھ پلانے سے پہلے ہوں یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے

یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو، خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد ہو تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں، دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے، اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں"۔(فتاویٰ عالمگیری ،جلد اول،ص:343 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دوطرفہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ جانبِ واحد سے متعدی ہوتا ہے،یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے،اس پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد حرام ہے،جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے،اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہے(بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو)۔لہٰذا فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی محمد صالح شاہ کے دوسرے بھائیوں سے ہو سکتی ہے، رضاعت کا رشتہ صرف محمد صالح کے ساتھ قائم ہوا ہے،دوسرے بھائیوں کے ساتھ نہیں۔

ثبوتِ رضاعت

سوال: 88

میری بیٹی آمنہ کا رشتہ میرے چچا زاد بھائی کے بیٹے عامر شہزاد سے ہو رہا تھا، عامر شہزاد نے اپنی خالہ مریداں کا دودھ پیا ہے، جب میری بیٹی آمنہ چھ ماہ کی تھی تو میں اسے گاؤں لے گئی، وہاں ایک روز میں گھر میں کام کاج میں مصروف تھی کہ آمنہ رونے لگی مریداں نے اسے دودھ دینے کی غرض سے گود میں ڈال لیا اور کپڑا اٹھا ہی رہی تھی کہ میں وہاں آ گئی اور اس پر غصہ کرنے لگی کہ میرے شوہر کی اجازت نہیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہے،اس نے آمنہ کو میری گود میں دے دیا، جب میں نے اسے گود میں لیا تو خدا گواہ ہے کہ اس کا منہ سوکھا ہوا تھا، اس وقت آمنہ کی عمر ایک سال تھی اور مریداں کی بیٹی کی ساڑھے تین سال تھی، پھر تین سال قبل جب میں نے مریداں سے پوچھا کہ کیا تم نے میری بیٹی آمنہ کو دودھ پلایا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے۔اب جب رشتے کی بات چلی تو وہ کہتی ہے کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے اور اس بات پر کوئی گواہ بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ کیا عامر شہزاد اور آمنہ اقبال کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟۔(غلام سکینہ، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

رضاعت کا ثبوت دودھ پلانے والی کے اقرار سے ہوگا یا گواہانِ شرعیہ سے ہوگا۔عالمگیری میں ہے:

الرضاع یظھر باحد أمرین أحدھما الاقرار والثانی البینۃ کذا فی البدائع۔ ولا یقبل فی الرضاع الا شھادۃ رجلین اورجل وامراتین عدول کذا فی المحیط۔

ترجمہ:" رضاعت دو طریقوں سے ثابت ہوگی، ایک یہ ہے کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ اس پر شرعی گواہ ہوں، اور شہادت قبول نہیں کی جائے گی مگر یہ کہ دو عادل مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عادل عورتیں ہوں "محیط" میں اس طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 347، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

صورت مسئولہ میں شہادت شرعیہ موجود نہیں ہے، مدعیہ کے بیان میں اضطراب پایا جاتا ہے، جس سے صورت حال مشکوک ہوگئی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا تثبت الحرمة بالشك۔ ترجمہ: ''شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، (فتاویٰ عالمگیری،جلد 1 صفحہ 344 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں عامر شہزاد اور آمنہ کا آپس میں نکاح جائز ہے،فقط واللہ اعلم الصواب۔

خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے

سوال: 89

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ فاطمہ کی خالہ زید کے نکاح میں ہے۔کیا فاطمہ بھی زید کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے؟اگر کرسکتی ہےتو کیسے اورنہیں کرسکتی تو کیسے ،مہربانی فرماکر قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلاً وضاحت فرمائیں،(محمد جان نعیمی ہزاروی،ضلع وتحصیل مانسہرہ)۔

جواب:

محرماتِ نکاح کی نو اقسام میں سے تیسری قسم ''جمع بین المحارم'' ہے،یعنی وہ عورتیں کہ ان میں اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری اس کے لئے حرام ہو،مثلاً ''دوبہنیں'' کہ ایک کو مرد فرض کریں،تو بھائی بہن کا رشتہ ہوا یا ''پھوپھی بھتیجی'' کہ پھوپھی کو مرد فرض کریں ،تو ''چچا اور بھتیجی'' کا رشتہ ہوا اور بھتیجی کو مرد فرض کریں،تو ''پھوپھی اور بھتیجے'' کا رشتہ یا ''خالہ بھانجی'' کہ خالہ کو مرد فرض کریں،تو ''ماموں اور بھانجی'' کا رشتہ ہوا اور بھانجی کو مرد فرض کریں،تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہوا،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والاصل ان كل امرأتين لو صورنا احداهما من أى جانب ذكرا لم يجز النكاح بينهما برضاع أو نسب لم يجز الجمع بينهما هكذا فى المحيط ۔

ترجمہ:’’اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، نسب کے رشتے سے ہی خاص نہیں بلکہ رضاعی رشتے میں بھی دونوں کا جمع کرنا حرام ہے ،’’محیط‘‘میں بھی اسی طرح ہے ،(فتاویٰ عالمگیری، جلد:1،ص:277، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)‘‘۔

اللہ جل شانہٗ نے محرمات نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا: وان تجمعوا بین الاختین۔ (ترجمہ)’’اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کا جمع کرنا بھی حرام ہے، (النساء)‘‘۔آیت میں اگرچہ صراحت کے ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن مفسرین کرام اور فقہاءِ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ایسی ہر دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان دونوں میں حرمت کا رشتہ قائم ہو جائے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ: أنّ رسول اللہ ﷺ قال: "لا یُجمع بین المرأۃ وعمّتھا ، ولا بین المرأۃ وخالتھا"۔

ترجمہ:’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:’’بھتیجی اور اس کی پھوپھی‘‘کو اور’’بھانجی اور اس کی خالہ‘‘ کو نکاح میں ایک ساتھ جمع نہ کیا جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5109)‘‘۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ: أنّ رسول اللہ ﷺ نھیٰ عن اربع نسوۃ ان یجمع بینھن" المرأۃ وعمّتھا" "والمرأۃ وخالتھا"۔

ترجمہ:’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے،’’بھتیجی اور اس کی پھوپھی‘‘اور’’ بھانجی اور اس کی خالہ‘‘، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3333)‘‘۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

عن الزهری قال : حدثنی قبیصة بن ذؤیب :أنّه سمع أبا هریرة یقول : نھیٰ النبی ﷺ أن تنکح المرأة علی عمّتها ، والمرأة علی خالتها ۔ فنری خالة أبیها بتلك المنزلة ۔

ترجمہ:''زہری فرماتے ہیں کہ قبیصہ بن ذویب نے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے ابوہریرہ سے سنا،وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ''عورت اور اس کی پھوپھی'' کو ایک نکاح میں (جمع) کرنے سے منع فرمایا،اور اسی طرح'' عورت پر اس کی خالہ'' کو(جمع کرنے سے منع فرمایا)۔(زہری کہتے ہیں) ہمارا خیال یہ ہے بیوی کے باپ کی خالہ کا بھی یہی حکم ہے،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5110)''۔

عن ابی ھریرة ، عن رسول اللہ ﷺ :''أنہ نھیٰ أن تنکح المرأةعلی عمّتھا،أ وخالتھا ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ پھوپھی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی سے نکاح کیا جائے یا بھتیجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی پھوپھی کے ساتھ یا خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھانجی کے ساتھ یا بھانجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح کیا جائے ،(سنن نسائی،رقم الحدیث:3290)''۔

علامہ نظام الدین مزید لکھتے ہیں:فان تزوج الاختین فی عقدة واحدة یفرق بینھما وبینه فان کان قبل الدخول فلا شئی لھما وان کان بعد الدخول یجب لکل واحدة منھما الاقل من مھر مثلھاو من المُسمّٰی کذا فی المضمرات ۔وان تزوجھما فی عقدتین فنکاح الاخیرة فاسد ویجب علیه أن یفارقھا ولو علم القاضی بذلك یفرق بینھما فان فارقھا قبل الدخول

لا يثبت شئی من الاحکام وان فارقها بعد الدخول فلها المهر و یجب الاقل من المسمی ومن مهر المثل وعلیها العِدّۃُ ویثبت النسب ویعتزل عن امرأته حتٰی تنقضی عدۃ أختها کذا فی محیط السرخسی ۔

ترجمہ: ''اگر دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہوا ،فوراً دونوں کے درمیان علیحدگی کردی جائے گی ،اگر ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے ہی علیحدگی کی گئی تو کوئی مہر واجب نہ ہوا اور اگر اس کے بعد علیحدگی ہوئی ،تو ان میں سے ہر ایک کو (اگر دونوں سے دخول ہوا ہو تو) ''مہرِ مثل'' اور ''مقرر مہر'' میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے ۔اور اگر دونوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہو ،تو جس سے بعد میں نکاح کیا، وہ فاسد ہوگا اور شوہر پر واجب ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کرلے، (اگر قاضی کو علم ہوجائے)تو وہ تفریق کردے پس اگر مباشرت سے پہلے تفریق کی تو اس کے لئے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، اور اگر مباشرت کے بعد تفریق ہوئی ،تو اس کے لئے مہرِ مثل یا مقرر مہر میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، اور اس پر عدت لازم ہوگی، (بچہ پیدا ہو تو) ثابت النسب ہوگا، اور اپنی بیوی سے دور رہے گا جب تک اس کی بہن کی عدّت پوری نہ ہوجائے ،''محیط سرخسی ''میں اسی طرح ہے ، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 277، 278، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مذکورہ میں فاطمہ اور اس کی خالہ زید کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں ،اور یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کردہ حدیں ہیں جن کی پابندی ازحد ضروری ہے ۔

حرمتِ مصاہرت

سوال: 90

محترم مفتی صاحب ! یہ سوال میری چھوٹی ہمشیرہ کا ہے، جو میں ان کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ اپنی علمی قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے شریعت محمدی کی روشنی میں اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے۔ میری شادی میرے تایا زاد کزن سے فروری 2002 میں آج سے تقریباً چار سال پہلے ہوئی، سن 1994 میں ہماری منگنی ہوئی شادی سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے تایا کے گھر میں رہ رہے تھے (پڑھائی کے سلسلے میں کیونکہ والدین سعودیہ میں رہتے تھے) میرے تایا مجھ سے اور میرے بڑے بھائی سے کافی پیار کرتے تھے، اکثر مجھ سے اپنی ٹانگیں دبواتے تھے، ایک دن وہ اخبار پڑھ رہے تھے، اور انہوں نے کہا کہ میری ٹانگیں دباؤ، جب میں ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی، تو انہوں نے پوچھا تمہارا پیٹ خراب ہے تو اپنی زبان دکھاؤ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا کہ اپنی زبان باہر نکالو اور ہاتھ لگا کر کہا کہ تمہاری زبان تو کافی نرم ہے، اور پھر انہوں نے زبان چوس لی، یہ عمل انہوں نے دوبارہ کیا، اللہ گواہ ہے کہ اس میں لکھا سب سچ ہے، اس بات سے میں بہت روئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد گھر میں کافی جھگڑا ہوا، تایا اس بات سے سرے سے ہی منکر ہو گئے، خاندان کے لوگ میری بات کو مانتے بھی تھے، لیکن تایا کے سامنے کہنے کی جرات نہ کر سکے، نہ ہی کسی نے اس بابت شریعت سے رجوع کرنے کی بات کی یا کوشش کی، تایا کیونکہ خاندان میں سب سے بڑے ہیں، اور ان کا خاندان میں کافی رعب و دبدبہ ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان سے بحث نہیں کرتا، میرے بار بار منع کرنے کے

WWW.NAFSEISLAM.COM

باوجود خاندان کے بڑوں نے میری شادی تایا کے بیٹے کے ساتھ کردی، منگنی کے تقریباً 8 سال گزرنے کے بعد میرے دل میں تایازاد کے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی تھے۔ہماری شادی ہوئی ،اس واقعہ کے بعد جو کہ بڑی مشکل سے ہوئی، شادی کے بعد اس گھر میں، مجھ پر ہر وقت ایک خوف طاری رہتا تھا، شادی سے پہلے کا واقعہ میرے دماغ پر ہر وقت سوار رہتا ہے اور مجھے انتہائی خوف محسوس ہوتا ہے، مختلف جھگڑے ہوئے۔

تایا کا بیان ہے کہ: ''بلکہ وہ لڑکی آئس کریم کھارہی تھی، میں نے اس سے مانگی تو اس نے کہا کہ ختم ہوگئی ہے اور صرف میرے منہ میں باقی ہے، جو کہ میں نے (یعنی تایا نے)اپنے زبان کے ساتھ اٹھالی، اس وقت اس کی زبان بھی میرے منہ میں آگئی تھی، اور کہ اس میں کسی قسم کی شہوت نہ تھی اور میں اس پر قرآن اٹھانے کو تیار ہوں''۔

اب اصل صورتحال (جو کہ میں نے سوال میں بیان کی ہے) کی روشنی میں، میں حلفاً کہتی ہوں کہ تایا کا یہ بیان مکمل طور پر جھوٹ ہے۔

میں اور میرے گھر والے اس مسئلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، اور ہم نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تحریری فتوی نہیں لیا، اس لئے جناب سے گذارش ہے کہ شریعت کی روشنی میں تفصیل سے بتائیں کہ میری ہمشیرہ کے لئے کیا حکم ہے؟ تحریر فرمائیں، (حماد آصف، رجسٹرار آفس، نیشنل الیکٹرک پاور ریگولیٹری اتھارٹی، سیکٹر G-5/2، اسلام آباد)۔

جواب:

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا

WWW.NAFSEISLAM.COM

ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں،تو عورت کے اصول وفروع مرد پرحرام ہوجائیں گے۔اور مرد کے اصول وفروع عورت پرحرام ہوجائیں گے۔اس کو حرمتِ مصاہرۃ کہتے ہیں۔

اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:و کما تثبت ھذہ الحرمۃ بالوطء تثبت بالمس والتقبیل والنظرالی الفرج بشھوۃ کذافی الذخیرہ۔۔۔

ترجمہ:''حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں:

و کذا لوعضھا بشھوۃ ھکذا فی الخلاصہ۔

ترجمہ:''اور اسی طرح اگر شہوت کے ساتھ دانت سے کاٹا ہو تو اس سے بھی حرمت ثابت ہوجائے گی، ''خلاصہ'' میں بھی اسی طرح ہے۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275,274-،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قال فی "الذخیرۃ": واذا قبلھا اولمسھا اونظرالی فرجھا ثم قال: لم ی کن عن شھوۃ، ذکر الصدر الشھید انہ فی القبلۃ یفتی بالحرمۃ، مالم یتبین انہ بلا شھوۃ ، وفی المس والنظر لا، الا ان تبین انہ بشھوۃ لان الاصل فی التقبیل الشھوۃ ، بخلاف المس والنظر،.......................ومنھم من فصل فی القبلۃ فقال: ان کانت علی الفم یفتی بالحرمۃ ، ولا یصدق انہ بلاشھوۃ، وان کانت علی الرأس اوالذقن اوالخد فلا الا اذا تبین انہ بشھوۃ و کان الامام ظھیر الدین یفتی بالحرمۃ فی القبلۃ مطلقا، ویقول: لایصدق فی انہ لم یکن بشھوۃ۔

ترجمہ:''''ذخیرہ'' میں فرمایا: جب (کسی عورت کو)بوسہ دیا یا چھوا یا اس کی شرمگاہ (فرج) کی طرف نظر کی، پھر کہتا ہے کہ یہ عمل شہوت سے نہیں تھا،صدرالشہید ذکر کرتے ہیں کہ بوسہ لینے میں حرمت کافتویٰ دیا جائے گا،جب تک کہ یہ بالکل واضح نہ ہو کہ یہ بوسہ لینا شہوت کے بغیر تھا اور چھونے اور(شرمگاہ کی طرف)نظر کرنے پر حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا،سوائے اس صورت کے کہ(ان دونوں امور کا) شہوت کے ساتھ ہونا بالکل واضح ہو،کیونکہ بوسہ لینے میں اصل شہوت ہےاور دیکھنے میں ایسا نہیں ہے(یعنی اصل شہوت نہیں ہے)،بعض فقہاء نے بوسہ لینے میں بھی تفصیل بیان کی ہےاور فرمایا ہے کہ:اگر بوسہ منہ پر لیا ہوتو فتویٰ حرمتِ مصاہرت پر ہے اور اس کا شہوت کیبغیر ہونا سچا نہیں جانا جائے گا،اور اگر بوسہ پیشانی پر لیا ہو یا ٹھوڑی پر یا رخسار پر تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی،جب تک کہ شہوت سے نہ ہو۔اور امام ظہیر الدین بوسہ لینے میں مطلقاً حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں،اور فرماتے ہیں: کہ اس کا بلا شہوت ہونے کا دعویٰ سچا نہیں مانا جائے گا۔

علامہ شامی آگے چل کر لکھتے ہیں:

وقال فی "الفیض ": ولو قام الیھا وعانقھا منتشرا او قبلھا وقال لم یکن عن شھوۃ لا یصدق ، ولو قبل ولم تنتشر آلتہ وقال کان عن غیر شھوۃ یصدق،وقیل لا یصدق لو قبلھا علی الفم ، وبہ یفتی اھ۔

ترجمہ:''اور''فیض''میں فرمایا: کہ اگر اٹھ کر اس عورت کی طرف بڑھا اور اس کو گلے لگایا،اس حال میں کہ انتشارِ آلہ تھا یا بوسہ لیا اور کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا،تو اس کے قول کو نہیں مانا جائے گا۔اور اگر اس نے بوسہ لیا اور انتشارِ آلہ نہیں ہوا اور وہ کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا تو اس کا قول معتبر مانا جائے گا اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر منہ پر

بوسہ لیا ہے، تو اس کے بلاشہوت ہونے کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کی جائے گی، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص: 90 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ویشترط أن تکون المرأۃ مشتھاۃ کذا فی التبیین، والفتوی علی أن بنت تسع محل الشھوۃ لا مادونھا کذا فی معراج الدرایۃ وقال الفقیہ ابواللیث مادون تسع سنین لاتکون مشتھاۃ وعلیہ الفتوی کذا فی فتاوی قاضی خان۔

ترجمہ: "اور حرمت مصاہرت کے لئے شرط ہے کہ عورت مشتہاۃ ہو (یعنی وہ عمر اور جسمانی وضع کے اعتبار سے ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر مرد کو جنسی شہوت آئے)، "تبیین" میں اسی طرح ہے، اور فتویٰ اس پر ہے کہ نو سال کی عمر والی لڑکی محل شہوت ہے، اگر اس کی عمر اس سے کم ہو تو وہ محل شہوت نہیں ہے، "معراج الدرایہ" میں بھی اسی طرح ہے، اور فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ جو لڑکی نو سال سے کم عمر کی ہو، وہ مشتہاۃ نہیں ہے، (یعنی اس پر شہوت کی نظر ڈالنے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی)، اسی پر فتویٰ ہے، فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 274-275، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

اب صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائل لڑکی کے تایا اور خسر نے اس کی زبان چوسی اور خسر اس بات کا اقرار بھی کرتا ہے، اور منہ کا بوسہ لینے کی صورت میں مرد کا دعوائے عدمِ شہوت غیر معتبر ہے، جب کہ یہاں اس سے بھی بڑھ کر زبان بھی چوسی گئی ہے، جبکہ قرائن بھی اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ اس شخص نے یہ عمل شہوت سے کیا ہے، اس لئے مذکورہ بالا لڑکی اور اس کے شوہر کے درمیان حرمت مصاہرت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، اس لئے دونوں کو فوراً

علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔

حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں

سوال: 91

ایک گھر میں تقریباً 14 سال سے Joint Faimly رہتی ہے، ابھی پچھلے جمعہ اچانک بھابھی نے اپنے دیور (سائل) پر الزام لگایا کہ اس نے ان کے کمرے میں آکر (جہاں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سو رہی تھی) اُن کے رخسار پر بوسہ دیا ہے یہ بھابھی کا قول ہے، جبکہ دیور (سائل) کا قول یہ ہے کہ یہ سب ڈرائنگ روم میں سو رہے تھے، میں اپنے کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ بھابھی کی قمیص حد سے زائد پیچھے سے اٹھی ہوئی ہے، میں اس کو ڈھانپنے کے لئے گیا، ان کا بیٹا بھی ساتھ سو رہا تھا ڈھانپتے ہوئے اچانک میرا ہاتھ بھابھی کے چہرے پر لگ گیا جس سے وہ اٹھ گئیں اور انہوں نے غلط بات سمجھی۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ آیا بھابھی کا قول معتبر ہوگا یا دیور کا؟ میری بیوی کے بقول بھابھی نے مجھ کو معاف کر دیا ہے لیکن بھائی اور بھابھی نے ترکِ کلام کیا ہوا ہے میرے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟۔ (خالد احمد، بلاک 6 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وان ادعت الشهوة) في تقبيله أو تقبيلها ابنه (وأنكرها الرجل فهو مصدق)۔

ترجمہ: ''اور اگر عورت نے دعویٰ کیا کہ مرد نے اس کو بشہوت چھوا، یا اس عورت نے اس کے بیٹے کو بشہوت چھوا اور مرد نے اس کا انکار کیا تو مرد کا قول معتبر مانا جائے

WWW.NAFSEISLAM.COM

گا،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد: 4 ص: 92 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ،بیروت)۔"

حدیث میں ہے:عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: "ایاکم والدخول علی النساء" فقال رجل من الانصار:یا رسول الله افرأیت الحموقال الحمو الموت، "(اجنبی) عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو،انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ !دیور کا کیا حکم ہے؟،فرمایا کہ دیور موت ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث 5570 جلد 9،مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکۃ المکرمۃ)

عن علی بن الحسین :کان النبی ﷺ فی المسجد، وعنده ازواجه، فرحن،فقال لصفیة بنت حیی:"لاتعجلی حتیٰ أنصرف معك"۔ وكان بیتها فی دار أسامة،فخرج النبی ﷺ معها،فلقیه رجلان من الانصار،فنظرالی النبی ﷺ ثم أجازا، وقال لهما النبی ﷺ: "تعالیا،انها صفیة بنت حیی"۔قالا:سبحان الله یارسول الله ﷺ،قال :"انّ الشیطان یجری من الانسان مجری الدم،وانّی خشیت أن یلقی فی أنفسكما شیئاً"۔

ترجمہ:"علی بن حسین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے اور آپ کی زوجہء مطہرہ آپ کے پاس تھیں،وہ جانے لگیں تو آپ نے حضرت صفیہ سے فرمایا:ٹھہرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں اور ان کا حجرہ حضرت اسامہ کے مکان میں تھا۔نبی کریم ﷺ انکے ساتھ نکلے تو آپ کو انصار کے دو شخص ملے،انھوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آگے نکل گئے۔نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا:ادھر آؤ،یہ صفیہ بنت حیی ہے(یعنی میری بیوی ہے)۔دونوں نے عرض کیا:یارسول اللہ ﷺ: سبحان

اللہ! (یعنی آپ کی ذات کے بارے میں مومن کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کرسکتا) آپ نے فرمایا کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے تو مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا وہ تمہارے دل میں کوئی وسوسہ ڈال دے، (صحیح بخاری، جلد 2 رقم الحدیث 2038، مطبوعہ مکتبۃ العصریۃ، بیروت)۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ مواضعِ تہمت اور مواقعِ تہمت سے ہمیشہ اجتناب کرے، اپنی عزت وآبرو کا تحفظ مومن کی شرعی ذمہ داری ہے، کسی ایسے مقام پر جانا یا ٹھہرنا، جہاں دوسرے لوگ بدگمانی کی بنا پر ہدفِ تہمت بنا سکتے ہوں۔ ایک روایت میں ہے: من سلك مسالك الظن اتهم، ورواه الخرائطي في مكارم الاخلاق مرفوعاً بلفظ: من اقام نفسه مقام التهم فلايلومن من اساء الظن به۔

ترجمہ: جو بدگمانیوں کی راہوں پر چلے گا، وہ ہدفِ تہمت بنے گا، اور مکارم اخلاق میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا کہ "جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی نے مندرجہ بالا روایات کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: اگرچہ "اتقوا مواضع التھمۃ" ترجمہ: (مقامات تہمت سے بچو!) کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایات کی بنا پر معنًی ثابت ہے، (کشف الخفاء ومزیل الالباس، جز الاوّل، صفحہ 44، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

صورتِ مسئولہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوئی، آپ کی بھابھی نے آپ کو معاف کر کے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے اور چاہئے کہ ترکِ کلام نہ کریں اور دیور کے لئے لازم ہے کہ آئندہ محتاط رہے۔

شادی اور تقریبات پر فائرنگ اور آتش بازی

سوال: 92

شادی کے موقع پر فائرنگ کرنا کیسا ہے ،قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مدلل ارشاد فرمائیں، (سلمان حسین ،لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

زمانۂ قدیم سے ہی حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں میں طرزِ بود وباش ، معاشرتی میل جول اور خوشی وغم کے جذبات واحساسات کے پیرائیہ اظہار کے طورطریقے بدلتے چلے آرہے ہیں،اس حوالے سے مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہرقوم کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے، جو اس قوم کی شناخت بھی ہوتی ہے اور ہر قوم خوشی کا اظہار زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ثقافت کے مطابق کرتی رہی ہے ،مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رسوم ورواج اور ثقافتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، کہیں سادگی کا عنصر نمایاں ہو تو کہیں اظہارِ ثقافت کی زیادہ سے زیادہ نمود ونمائش پائی جاتی ہے، اور وہ رسومات جب تک شریعت سے متصادم نہ ہوں ،شرعاً ان پر طعن نہیں کیا جاسکتا،اور ان رسومات کے مذموم ومحمود ہونے کا مدار نیت پر ہے جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: فی الواقع نکاح میں بغرضِ اعلان بندوقیں چھوڑنے کی ممانعت شرع میں کہیں ثابت نہیں ۔ ہلالِ عید اور رمضان میں صدھا سال سے توپوں کے فائر کیے جاتے ہیں اس سے بھی اعلان ہی مقصود ہوتا ہے اس اعلان پر شرعاً عمل کا جزئیہ ردالمحتار میں مذکور ہے ۔نیتِ ریا وتفاخر نہ فقط شادی کی بندوقوں بلکہ نماز کو حرام کردیتی ہے، رسم کا اعتبار جب تک کسی فسادِ عقیدہ پر مشتمل نہ ہو اصل رسم کے حکم میں رہتا ہے اگر رسم محمود ہے، محمود ہے، مذموم ہو مذموم ہے، مباح ہو مباح ہے، واللہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ،جلد 24،ص:119 ،رضا فاؤنڈیشن لاہور)‘‘۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے شادیوں میں کی جانے والی مختلف رسومات مثلاً آتش بازی ، بندوق اور گانا بجانا،لکڑی کھیلنا،نوشہ (دولہا) کو پالکی میں سوار کرنے سے متعلق سوال ہوا،آپ نے جواب میں فرمایا:نوشہ کو پالکی میں سوار کرنا مباح وجائز ہے لان من الرسوم العامة التی لا مضر فیھا من الشرع ، (اس لئے کہ یہ اُن عادی رسموں میں سے ہے شریعت میں جن پر کوئی طعن نہیں)اور لکڑی پھینکنا،بندوقیں چھوڑنا اوراس قسم کے سب کھیل جائز ہیں جبکہ اپنے اور دوسرے کی مضرت کا اندیشہ نہ ہو،ایک اورسوال کہ ’’اعلان کے لئے شادی میں بندوقیں چھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟ ‘‘کے جواب میں لکھتے ہیں:جائز ہے۔اخرج الترمذی عن ام المؤمنین الصدیقة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا قالت قال رسول اللّٰہ ﷺ اعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوہ علیہ بالدفوف وروی احمد بسند صحیح وابن حبان فی صحیحہ والطبرانی فی الکبیر وابو نعیم فی الحلیة والحاکم فی المستدرک عن عبداللّٰہ بن الزبیر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما عن النبی ﷺ قال اعلنوا النکاح ،واللّٰہ تعالیٰ اعلم ۔

ترجمہ:’’امام ترمذی نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تخریج فرمائی کہ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو)اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اوراس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو۔ امام احمد نے سند صحیح سے ابن حبان نے اپنی صحیح میں ،طبرانی نے الکبیر میں،اورابونعیم نے الحلیہ میں اور حاکم نے المستدرک میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمائی کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح کا

اعلان کیا کرو، (فتاوٰی رضویہ، جلد 23،ص: 277، 289، 290، رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)"۔آج کل آتش بازی کی ممانعت کا قانون موجود ہے اور تقریبات کے موقع پر فائرنگ سے بعض اوقات حادثات بھی رونما ہوجاتے ہیں ،اس لئے قانون کی پابندی بھی ضروری ہے اور فی نفسہ ازروئے شرع پابندی کے جواز کے باوجود احتیاط پر عمل کرنا افضل ہے،اوراس حد تک آتش بازی اور فائرنگ جو اسراف کی حد میں داخل ہوجائے، بہرحال ممنوع ہے۔آگ کا کھیل تو ویسے بھی مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔

جبری نکاح کا حکم

سوال: 93

میری بیٹی رضوانہ جس کی شادی میری سالی کے بیٹے کے ساتھ ہوئی۔دوسری طرف میری بیوی گردوں کی خرابی کی وجہ سے 2005ءکو اس دنیا سے رخصت ہوئی ،اس پر میری بیٹی کراچی آئی ہوئی تھی۔چونکہ میری بیٹی امید سے تھی، میری بیٹی نے بڑے آپریشن سے بچے کو جنم دیا۔اس کے تین ماہ بعد اس کے شوہر نے کہا کہ میری ماں نے بمع بیوی اور بچے اپنے پاس سیہون بلانے کو کہا ہے،اس پر میں نے اجازت دی کہ اپنے گھر سیہون جاؤ۔اجازت دینے کے بعد چونکہ میری بیٹی آپریشن کی وجہ سے کمزور تھی۔اس کے ساتھ اس سے تیسرے نمبر پر میری بیٹی ارم کو ساتھ روانہ کیا تاکہ بچے کو سنبھال سکے۔واضح ہو کہ اس سے قبل میری بیٹی کی ساس نے میری دوسری بیٹی ارم کا رشتہ اپنے دوسرے بیٹے کے لئے مانگا تھا۔لیکن میں نے صاف انکار کردیا۔جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری پہلی بیٹی مشکلات میں تھی ۔اس کا شوہر کچھ بھی نہیں کماتا۔اور کچھ بھی جو تھوڑا بہت کماتا ہے۔وہ ماں کو دے دیتا ہے۔بجائے اپنی

بیوی کو دینے کے۔ جو کہ از روئے شریعت محمدی ﷺ بیوی کا حق ہے۔ اور شوہر کا فرض ہے۔ اس کا شوہر کوئی اخراجات میری بیٹی کے برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے دوسرے رشتے کے لئے میں نے انکار کر دیا۔ اور اپنے تیسرے نمبر والی بیٹی کی منگنی کہیں اور کر دی۔ جس میں میرے داماد کی مرضی بھی شامل تھی۔ بہر حال پہلی شادی شدہ بیٹی کے ساتھ بچے کی دیکھ بھال کے لئے اپنی تیسرے نمبر والی بیٹی کو بھیجا۔ اس کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد جب ارم کراچی آئی۔ تو اس نے بتایا کہ میرا زبردستی نکاح کروا دیا اپنے بیٹے کے ساتھ اور ان کو معلوم تھا۔ کہ ارم کسی اور کی امانت ہے۔ حالانکہ میں اس رشتے کے لئے دو دفعہ منع کر چکا تھا۔ ارم کے نکاح میں نہ میں شریک ہوا اور نہ ہی ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی یہاں تک کہ میری شادی شدہ بیٹی جو کہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ اسے بھی پتہ نہ تھا۔ اس پر میری تیسرے نمبر والی بیٹی نے کہا کہ مجھ سے زبردستی نکاح کروایا ہے۔ میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔ مجھ پر جادو ہوا تھا۔ اور میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں، جہاں میرے ماں باپ نے میری منگنی طے کی ہے، میں وہیں خوش ہوں۔ میں وہاں خوش نہیں رہوں گی۔ اسباب یہ ہے کہ میری پہلی بیٹی وہاں بھوک سے مر رہی ہے۔ اسی کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر اپنی دوسری بیٹی نہیں دینا چاہتا۔ آپ سے گذارش ہے کہ شریعتِ محمدی ﷺ کے مطابق فتویٰ صادر فرمائیں کہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟، (محمد نواز، ڈیفنس ویو، فیز II بنگلہ نمبر G-199 مدینہ اسٹاپ نزد ارم مسجد کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق جبر کی حالت میں نکاح ہو جاتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ لکھتے ہیں:

اقول وبتقریری ھذا اندفع ماعسیٰ ان یتوھم من ان النکاح مما یستوی فیہ الھزل والجد فلا یحتاج الی نیۃ وقصد متی لو تکلما بالایجاب والقبول ھازلین او مکرھین ینعقد۔

ترجمہ: ''اقول (میں کہتا ہوں) میری اس تقریر سے اس شبہ کا ازالہ ہوگیا، جس میں کہا گیا کہ نکاح تو ان امور میں سے ہے، جن میں مذاق اور قصد برابر ہیں، لہٰذا اس میں قصد اور ارادہ کی ضرورت نہیں حتی کہ جب مرد وعورت نے ایجاب وقبول کے کلمات بول دیئے اگرچہ مذاق یا جبر سے کہے ہوں، تو نکاح ہو جائے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ص:128)''۔

مزید لکھتے ہیں:

نکاح اگرچہ جبر واکراہ سے بھی ہو جاتا ہے، فی الھندیۃ الاصل ان تصرفات المکرہ کلھا قولا منعقدۃ عندنا الا ان مایحتمل الفسخ منہ کالبیع والاجارۃ یفسخ وما لایحتمل الفسخ منہ کالطلاق والعتاق والنکاح والتدبیر والاستیلاد والنذر فھو لازم کذا فی الکافی ا ھ

ترجمہ: ''ہندیہ میں ہے قاعدہ یہ ہے کہ جس پر جبر کیا گیا ہو اس کے اس حالت کے تمام تصرفات نافذ العمل ہونگے، ہاں وہ تصرفات جو فسخ کا احتمال رکھتے ہوں جیسے بیع اور اجارہ کہ یہ فسخ قرار پائیں گے، اور جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے، مثلاً طلاق، عتاق، نکاح، مدبّر بنانا، ام ولد بنانا اور نذر تو یہ امور لازم ہو جائیں گے، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ص:202-203)''۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نکاح منعقد ہوگیا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

جعلی نکاح نامے کی حیثیت

سوال: 94

ایک شخص نے کسی لڑکی سے جھوٹا اور جعلی نکاح نامہ تیار کرلیا ہے۔لڑکی اور اس کے والدین کواس نکاح کا کوئی علم نہیں ۔ازراہِ کرم یہ ارشادفرمائیں کہ اس جھوٹے نکاح نامہ کی بنیاد پر شرعی نکاح ثابت ہوگایا نہیں ہوگا؟یعنی اس صورت میں ہمیں لڑکے سے طلاق لینا ضروری ہے؟نکاح نامہ میں جو وکیل اور گواہان رکھے گئے ہیں۔وہ سب کے سب فرضی ہیں اور ہم لڑکی والے ان کو پہچانتے بھی نہیں۔

واضح رہے کہ لڑکی نے نکاح نامہ پر نہ دستخط کیے ہیں اور نہ ایجاب وقبول ہوا ہے ،(پروفیسر میر محمد سومرو،ساکن ہنگورجہ تحصیل سوبھودیر ضلع،خیر پور میرس)۔

جواب :

استفتاء میں مستفتی نے چند دعوے کیے ہیں:

(1)لڑکی کے ساتھ نکاح کے ثبوت کے لئے نکاح نامہ تو موجود ہے،لیکن جعلی ہے۔

(2) نکاح نامے میں دلہا دلہن کے دستخط اور گواہوں کے نام اور دستخط موجود ہیں،لیکن مستفتی کا دعویٰ ہے کہ لڑکی کے دستخط فرضی اور جعلی ہیں اور گواہان بھی فرضی ہیں۔

(3) ایجاب وقبول ہوا ہی نہیں ہے۔

ہمارا منصب افتاء ہے،قضا نہیں ہے، ہمارا جواب اس مفروضے پر مبنی ہوتا ہے کہ استفتاء میں بیان کردہ بیان اور حقائق اگر درست ہیں،تو صورتِ مسئولہ کا شرعی جواب یہ ہے ،باقی رہا یہ سوال کہ استفتاء میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ آیا حقیقت پر مبنی ہے اور واقعہ کے مطابق ہے؟قطعیت کے ساتھ اس کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے ۔پس اگر استفتاء میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ درست ہے تو شرعاً نکاح منعقد ہی نہیں ہوا ،لہٰذا

طلاق کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ طلاق، اس نکاح کی قید سے آزاد کرنے کا نام ہے، جو شرعاً منعقد ہو چکا ہو،فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت

سوال: 95

نیاز بی بی بنت شیر اکبر کا نکاح محمد حنیف ولد محمد اسلم خان کے ساتھ 4، اپریل 1997ء کو مصری خان ولد فضل الرحمٰن کی وکالت پر گواہان حاجی محمد نور ولد نواب اور محمد ایوب ولد نواب کے روبرو قاضی نکاح خواں نے پڑھایا۔جس میں نیاز بی بی کے والد شیر اکبر اوران کے ساتھ کئی قریبی رشتے دار بھی موجود تھے، اس نکاح کا اندراج رجسٹر میں نہیں کرایا، جوکہ ہمارے ہاں اکثر رخصتی پر یہ نکاح رجسٹرڈ کیا جاتا ہے۔لہٰذا اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے۔بغیر رجسٹریشن نکاح ہوا یا نہیں؟ محمد حنیف کے طلاق دیئے بغیر نیاز بی بی دوسرے فریق سے نکاح کر سکتی ہے؟، (نصیر احمد الحسنی ، اسلامک سینٹر، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے، نکاح کے شرعی طور پر منعقد ہونے کے لئے فارم پر کرنا یا رجسٹریشن کرانا شرط نہیں، البتہ یہ قانونی ضرورت بھی ہے اور دستاویزی ثبوت کی وجہ سے تنازعات کے حل میں مدد ملتی ہے، لہٰذا یہ مستحسن امر ہے اور ایسا کرنا بہتر ہے ۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ’’قاضی کا رجسٹر شرعاً کوئی شرطِ نکاح نہیں، رجسٹر آج سے نکلے ہیں، پہلے نکاح کیونکر ہوتے تھے، ہاں یادداشت کے لئے درج ہونا بہتر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 21،ص: 169، جلد: 23،ص: 193، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن،)‘‘۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: النکاح ینعقد بالایجاب و القبول ۔ ترجمہ: ''نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوجاتا ہے ، (فتاوٰی عالمگیری ، جلد 1 ، ص: 270 ، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لہٰذا مذکورہ بالا گواہوں کی موجودگی میں محمد حنیف کا نکاح نیاز بی بی سے منعقد ہوگیا اور چونکہ نیاز بی بی کے والد بھی نکاح کے وقت موجود تھے، اس لئے بجا طور پر ولی کی رضا بھی اس میں شامل ہے ۔ اور اب وہ اس کی پابند ہے، بغیر اس کے طلاق دیئے ، یا اس کی زندگی میں اس کے نکاح میں رہتے ہوئے کسی اور شخص سے نکاح کرنا حرام ہے اور اگر نکاح کیا تو منعقد ہی نہیں ہوگا اور زنا کی مرتکب ہوگی ۔

میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا

سوال: 96

ایک دفعہ T.V پر میں نے کسی وکیل سے سنا کہ اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر الزامات لگائیں اور اگر چہ وہ غلط ہوں یا صحیح تو شرعی حیثیت سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے ۔ مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا یہ درست ہے؟ ، (اسامہ بن سہیل، گلشن اقبال اصفہانی روڈ، کراچی)۔

جواب:

وکیل کا یہ بیان شرعاً غلط اور باطل ہے کہ اگر زوجین (میاں بیوی) ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائیں، تو اس امر سے قطع نظر کہ تہمت زنا فی الواقع صحیح ہے یا غلط ، ان دونوں کا نکاح از خود (Automaticaly) ٹوٹ جائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہے، وکیل صاحب کو شریعت کا علم نہیں ہے اور شرعی علم کے بغیر ایسے فتوے جاری نہیں کرنے چاہئیں ۔ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے ، یا اس کے نکاح میں رہتے

ہوئے اس عورت کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے، اسے ولدالزنا کہے اور اسے اپنی صحیح النسب اولاد ماننے سے انکار کردے، اور پھر معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچ جائے تو قاضی عورت سے شوہر کے دعوے (یعنی الزامِ زنا) کی صداقت کے بارے میں پوچھے گا، اگر وہ اقرار کرے تو اس پر حدِّ زنا جاری ہوگی، لیکن اگر وہ شوہر کے دعوے اورالزام کو رد کردیتی ہے اور اپنی عفت اور پاک دامنی کا دعویٰ کرتی ہے (ظاہر ہے کہ یہ اس صورت حال کی بابت ہے، جب شوہر کے پاس اپنی بیوی پر ثبوتِ زنا کے گواہ نہیں ہیں اور بیوی اعترافِ جرم سے انکاری ہے)، تو قاضی ان دونوں کے درمیان ''لِعان'' کرائے گا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

والذین یرمون ازواجھم ولم یکن لھم شھدآء الّا انفسھم فشھادۃ احدھم اربع شھادات م بااللہ انّہ لمن الصّٰدقین o والخامسۃ انّ لعنت اللہ علیہ ان کان من الکٰذبین o ویدرٔا عنھا العذاب ان تشھد اربع شھادات م باللہ انّہ لمن الکٰذبین والخامسۃ انّ غضب اللہ علیھآان کان من الصّٰدقین o

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں، اور ان کے پاس خود ان کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہوں، تو ان میں سے کسی ایک شخص کی گواہی یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ بے شک وہ (اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگانے میں) سچوں میں سے ہے o اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو o اور عورت سے حدِّ زنا اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ (یعنی اس کا خاوند) ضرور جھوٹوں میں سے ہے o اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہو اگر وہ (خاوند) سچوں میں سے ہو o (النور: 6 تا 9)'' حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما: أن ھلال بن امیة قذف امرأته عندالنبی ﷺ بشریك بن سحماء، فقال النبی ﷺ: "البینة أو حدٌ فی ظَھرك" فقال: یارسول اللّٰہ، اذا رأی احدنا علی امرأته رجلا، ینطلق یلتمس البینة؟ فجعل یقول: ''البینة والا ؟حد فی ظھرك"۔ فذکر حدیث اللعان۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی (اور نبی ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا) تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف کے کوڑے لگائے جائیں گے، اس نے کہا: یا رسول ﷺ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کیساتھ کسی اجنبی شخص کو حالتِ گناہ میں دیکھے تو کیا وہ گواہوں کو تلاش کرنے چل پڑے گا؟، آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم گواہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف لگائی جائے گی، پھر''لعان'' کے احکام نازل ہوئے، (صحیح بخاری جلد نمبر 2، رقم الحدیث: 2671، مطبوعہ مکتبہ عصریہ، بیروت)''۔

امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان جاری کرنے سے پہلے شوہر کو (ان الفاظ کے ساتھ) نصیحت وتذکیر فرمائی: انّ عذاب الدنیا اھون من عذاب الآخرة، قال: لا والّذی بعثك بالحق ما کذبت علیھا، ثم دعاھا فوعظھا و ذکّرھا واخبرھا انّ عذاب الدنیا اھون من عذاب الآخرة۔

ترجمہ:''دنیا کی سزا (حدقذف) آخرت کے عذاب کے مقابلے میں معمولی ہے، اس شخص نے کہا: قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اس پر جھوٹی تہمت نہیں لگائی۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلایا اوراس کو وعظ ونصیحت کی (یعنی عذاب آخرت سے ڈرایا) اور فرمایا: دنیا کی سزا (حد زنا) آخرت کے عذاب کے

مقابلے میں بہت معمولی ہے۔(صحیح مسلم،رقم الحدیث:3676)"۔

لعان کا طریقہ: شوہر قاضی کے سامنے چار بار اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہے گا کہ وہ (اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے میں) سچا ہے،اور پانچویں بار کہے گا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو،پھر بیوی چار مرتبہ قاضی کے سامنے قسم کھا کر یہ کہے گی کہ میرا شوہر مجھ پر زنا کا الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور پانچویں بار کہے گی کہ اگر اس کا شوہر اس پر زنا کا الزام لگانے میں سچا ہو تو اس (عورت) پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو۔

لعان کی چند شرطیں ہیں،ان کی بابت علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

لعان کے لئے چند شرطیں ہیں:"(1) نکاح صحیح ہو،اگر اس عورت سے اس کا نکاح فاسد ہوا اور تہمت لگائی،تو لعان نہیں (2) زوجیت قائم ہو،خواہ دخول ہوا ہو یا نہیں لہٰذا اگر تہمت لگانے کے بعد طلاق بائن دینے کے بعد تہمت لگائی یا زوجہ کے مر جانے کے بعد،تو لعان نہیں اور اگر تہمت کے بعد رجعی طلاق دی یا رجعی طلاق کے بعد تہمت لگائی تو لعان ساقط نہیں (3) دونوں آزاد ہوں (4) دونوں عاقل ہوں (5) دونوں بالغ ہوں (6) دونوں مسلمان ہوں (7) دونوں ناطق ہوں یعنی ان میں کوئی گونگا نہ ہو (8) ان میں کسی پر حد قذف نہ لگائی گئی ہو (9) مرد نے اپنے اس قول پر گواہ نہ پیش کئے ہوں (10) عورت زنا سے انکار کرتی ہو اور اپنے کو پارسا کہتی ہو اِصطلاحِ شریعت میں پارسا اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وطی حرام نہ ہوئی ہو نہ وہ اس کے ساتھ مُتّہم ہو لہٰذا طلاق بائن کی عدت میں اگر شوہر نے اس سے وطی کی اگرچہ وہ اپنی نادانی سے یہ سمجھتا تھا کہ اس سے حلال ہے تو عورت عفیفہ نہیں یوں ہی اگر نکاح فاسد کر کے اس سے وطی کی تو عفت جاتی رہی یا عورت کی اولاد ہے جس کے باپ کو یہاں کے

WWW.NAFSEISLAM.COM

لوگ نہ جانتے ہوں اگر چہ حقیقتاوہ ولد الزنا نہیں ہے یہ صورت مُتَّہَم ہونے کی ہے اس سے بھی عفت جاتی رہتی ہے اور اگر وطی عارضی سبب سے حرام ہو،مثلاً حیض ونفاس وغیرہ میں (جن میں وطی حرام ہے) وطی کی،تو اس سے عفت نہیں جاتی (11) صریح زنا کی تہمت لگائی ہو یا اس کی جو اولاد اس کے نکاح میں پیدا ہوئی اس کو یہ کہتا ہو کہ یہ میری نہیں یا جو بچہ عورت کا دوسرے شوہر سے ہے اس کو کہتا ہو کہ یہ اس کا نہیں (12) دارالاسلام میں یہ تہمت لگائی ہو (13) عورت قاضی کے پاس اس کا مطالبہ کرے (14) شوہر تہمت لگانے کا اقرار کرتا ہو یا دو مرد گواہوں سے ثابت ہو۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: اگر مسلمان مرد کی بیوی اہلِ کتاب میں سے ہے،تو اس پر لعان جاری نہیں ہوسکتا،(بہار شریعت جلد:1ص:943,944،مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز)"۔

عن نافع: ان ابن عمر رضی اللہ عنہما أخبرہ: ان رسول اللہ ﷺ فرق بین رجل وامراۃ قذفھا وأحلفھما۔

ترجمہ:"نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے والے مرد اور عورت دونوں کو قسم دلائی اور پھر ان کے درمیان تفریق فرمادی،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5313)"۔

لعان کے بعد زوجین کے درمیان از خود تفریق نہیں ہوتی بلکہ لعان کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی،لیکن نکاح سے خارج نہیں ہوگی بلکہ لعان کے بعد حاکمِ اسلام یا قاضی ان کے درمیان تفریق کرے گا۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں: مذھب مالک والشافعی ومن تبعھما الی ان الفرقۃ تقع بنفس اللعان قال مالک وغالب اصحابہ بعد فراغ المراۃ وقال

الشافعی واتباعه وسحنون من المالكية بعدفراغ الزوج وقال الثوری وابو حنيفة واتباعهمالا تقع الفرقة حتیٰ یوقعها علیهما الحاکم وعن احمد روایتان۔

ترجمہ: ''امام مالک، امام شافعی اوران کے موافقین کا یہ نظریہ ہے کہ نفسِ لعان سے لعان کرنے والوں کے درمیان ازخود تفریق واقع ہوجاتی ہے، امام مالک اور ان کے اکثر اصحاب کا قول یہ ہے کہ عورت کے لعان سے فارغ ہونے کے بعد تفریق ہو جاتی ہے اور امام شافعی، اوران کے پیروکار اور امام مالک کے مقلدین میں سے سحنون کا قول یہ ہے کہ شوہر کے قسم سے فارغ ہونے کے بعد زوجین کے درمیان فرقت لازم ہوجاتی ہے، امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اوران دونوں کے متبعین کا قول ہے کہ نفسِ لعان سے تفریق نہیں ہوتی تاوقتیکہ (لعان کے بعد) قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرے، اور امام احمد بن حنبل کے اس مسئلے میں دوقول ہیں، (یعنی ایک قول کے مطابق احناف کے ساتھ ہیں اور دوسرے کے مطابق شوافع کے ساتھ)، (عمدۃ القاری جلد 20 ص: 295 ادارۃ الطباعۃ المنیر، مصر)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وحُرم وطؤهابعد اللعان قبل التفریق۔

ترجمہ: ''اور لعان کے بعد اگر ابھی (دونوں کے درمیان) تفریق نہ ہوئی ہو تب بھی (شوہر کے لئے) اس عورت سے وطی حرام ہے، (اور ابن عابدین شامی نے محرکات واسباب وطی کو بھی حرمت میں شامل کیا ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 5، ص: 126، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس سے ثابت ہوا کہ لعان طلاق بائن کے حکم میں ہے، بیوی اگر شوہر پر زنا کا الزام لگائے تو لعان جاری نہیں ہوگا اور نکاح قائم رہے گا، تاوقتیکہ شوہر طلاق نہ دے۔

لیکن امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں: قال سهل: حضرت هذا عند رسول الله ﷺ، فمضت السنة بعد في المتلاعنين ان يفرق بينهما، ثم لا يجتمعان ابدا۔

ترجمہ: ''سہل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس (لعان) کے موقع پر حاضر تھا، اس کے بعد (لعان کرنے والے زوجین کے بارے میں) یہ سنت جاری ہوگئی کہ ان کے درمیان تفریق کردی جائے، پھر وہ کبھی بھی (نکاح میں) جمع نہیں ہوں گے، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 2244)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أي مادام حكمه باقياً ، فلو خرجا أو احدهما عن أهلية اللعان له أن ينكحها كما يأتي ، وعليه حمل الحديث المذكور، ولا ينافيه قوله ابدا كمافي قوله تعالىٰ: انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم في ملتهم ولن تفلحوا اذا ابدا، (الكهف: 20)۔

ترجمہ: ''یہ دائمی تفریق اس وقت تک مؤثر ہے، جب تک اس کا حکم باقی ہے، اگر وہ دونوں یا ان میں سے ایک اہلیت لعان سے خارج ہوگیا (مثلاً شوہر اپنی بیوی پر زنا کے الزام سے رجوع کرلے تو اس پر حد قذف لگے گی) تو پھر لعان کے بعد بھی اس سابقہ بیوی سے نکاح کرسکتا ہے، (کیونکہ لعان کی بناپر تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہے اور طلاق بائن کے بعد باہمی رضا مندی سے دونوں میں نکاح ہوسکتا ہے)، اور آگے چل کر شامی نے آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے کہ کلمہ ''ابداً'' ہمیشہ قطعی دائمی کے حکم میں نہیں ہوتا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 5، ص: 119 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

سوال: 97

زید نے ایک مطلقہ عورت سے شادی کی اس عورت کی پہلے خاوند سے اولاد (لڑکی) ہے اور زید کی بھی (پہلی بیوی سے) اولاد ہے، اب زید (اپنی پہلی بیوی کے) بیٹے کا نکاح اس عورت کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟، (قاری محمد زمان چشتی، مدرس: دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل یہ نکاح جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا بأس بان یتزوج الرجل امرأة ویتزوج ابنه ابنتها أو أمها کذافی محیط السرخسی۔

ترجمہ: "کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس شخص کے لڑکے نے عورت کی لڑکی سے نکاح کیا جو اس عورت کے پہلے شوہر سے تو حرج نہیں، یونہی اگر لڑکے نے عورت کی ماں سے نکاح کیا جب بھی یہی حکم ہے (بشرطیکہ حرمتِ نکاح کی اور کوئی وجہ نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

مفتی محمد نور اللہ نعیمی ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: اگر صورتِ سوال صحیح اور واقعی ہے تو یہ نکاح کرنا یقیناً روا ہے، قرآن کریم میں ہے: واحل لکم ماوراء ذالــــکــــم، فتاویٰ عالمگیری جلد: 2، ص: 6 میں محیط سرخسی سے ہے اور بحرالرائق، جلد: 3، ص: 98، درمختار، شامی جلد: 2، ص: 383 میں بحرالرائق اور فتاویٰ خیریہ سے ہے: والـنـظـم من الدر واما بنت زوجة ابیه او ابنه فحلال بحرالرائق میں اضافہ فرمایا: وقـد تـزوج مـحـمـد بن الحنفیه امرأة وزوج ابنه بنتها، سب عبارات کا

حاصل یہ ہے کہ یہ نکاح کرنا حلال ہے اور اہل بیت کرام میں بھی ہوا، حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام محمد بن حنفیہ نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اسی عورت کی بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے سے کرادیا اپنی بیوی کی لڑکی اپنے صاحبزادے کو نکاح کردی، (فتاویٰ نوریہ، جلد: 2، ص: 433، مطبوعہ: بصیر پور اوکاڑہ)''۔

حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح

سوال: 98

ایک بچے نے ایک عورت کا دودھ پیا۔ اس بچے کے بڑے بھائی کا رشتہ اس عورت کی لڑکی سے آیا ہے کیا یہ شادی ہوسکتی ہے۔ برائے مہربانی اس بات کی شرعی تصدیق فرمادیجئے کہ یہ شادی جائز ہے یا نہیں؟، (تحسین، مکان نمبر 2-65 قصبہ موڑ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل جس بچے نے عورت کا دودھ مدتِ رضاعت (یعنی ڈھائی سال کی عمر تک) پیا تو اس بچے کی رضاعت ثابت ہے اور اس عورت کی تمام اولاد خواہ وہ دودھ پلانے سے پہلے کی ہو یا بعد کی اس شوہر سے ہوں یا دوسرے شوہر سے وہ سب اس دودھ پینے والے کے لئے رضاعی بہن بھائی ہوگئے اور ان میں سے کسی کی شادی اس دودھ پینے والے سے نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے دوسرے بھائی بہن جنہوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا اس سے رضاعت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے آپس میں نکاح جائز ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وتحل اخت اخیہ رضاعا)______کأن یکون لاخیہ رضاعا اخت

نسباو بهما۔

ترجمہ: ''حقیقی بھائی کی رضاعی بہن یا رضاعی بھائی کی حقیقی بہن یا رضاعی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے۔(ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 4،ص: 301، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ: زید بکر کا چچا زاد بھائی ہے اور رضاعی بھی زید کے صرف ایک حقیقی چھوٹا بھائی ہے اور بکر کے ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن جو کہ حقیقی ہیں اور بکر کی بہن دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے تو زید کے چھوٹے بھائی کا نکاح بکر کی چھوٹی بہن سے جائز ہے یا نہیں؟، چونکہ زید اور بکر آپس میں رضاعی بھائی ہیں۔

جواب میں لکھتے ہیں: بکر نے اگر زید کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید اور اس کا بھائی بکر کے بھائی ہوئے نہ کہ خواہر بکر کے اور اگر زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید خواہر بکر کا بھائی ہوا نہ کہ زید کا بھائی بہر حال زید کے بھائی اور بکر کی بہن میں نکاح جائز ہے لقولھم تحل اخت اخیہ رضاعا (فقہاء کے قول کے مطابق بھائی کی رضاعی بہن حلال ہے)، واللہ تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد: 11،ص: 279،مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

لاعلمی میں بہن بھائی کا نکاح

سوال: 99

کچھ دن پہلے ہمارے محلے میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں ایک لڑکی کی شادی ہو کر آئی، شادی کے چھ ماہ بعد ان دونوں کو پتہ چلا کہ وہ آپس میں بہن بھائی ہیں، جو تین سال کی عمر میں بچھڑ گئے تھے، یہ بات معلوم

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہوتے ہی لڑکی نے خودکشی کرلی، جبکہ لڑکا دبئی چلا گیا اور وہیں شفٹ ہوگیا تاکہ یہاں شرمندگی نہ ہو۔ اب ایسے میں اسلام کیا کہتا ہے، کیا وہ لڑکا گنہگار ہے یا نہیں؟۔(نبیل بھٹی، لاڑکانہ)۔

جواب:

صورت مذکورہ میں وہ لڑکا یا لڑکی شرعاً گناہ گار نہیں ہیں، اگر انہیں نکاح کے وقت اس کا علم نہیں تھا، تاہم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں، لڑکی کا خودکشی کرنا شرعاً فعل حرام ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عفوومغفرت کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔ البتہ اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاءِ مجلس نکاح کو ان دونوں کے اس بھائی بہن کے رشتے کا علم تھا، اور انہوں نے اسے حلال جان کر کیا تو کفر ہے، توبہ کریں اور تجدیدِ ایمان وتجدیدِ نکاح کریں، اور اگر اسے حرام قطعی جانتے ہوئے کیا تو وہ سب فاسق وفاجر ہیں، توبہ کریں اور اللہ کے غضب سے ڈریں۔ اور اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاءِ مجلس نکاح کو بھی اس رشتے کا علم نہیں تھا تو پھر وہ سب بھی عنداللہ معذور ہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں اور معافی مانگتے رہیں۔ باقی نکاح کرنے والا بھائی چونکہ بہن کے رشتے سے لاعلم تھا، اس لئے معاشرے کو چاہئے کہ جو عنداللہ معذور ہو، اسے ملامت نہ کریں۔

تحلیلِ شرعی کے لئے زوجِ غیر کے ساتھ نکاحِ صحیح ضروری ہے

سوال: 100

ایک لڑکی ''ک'' کا نکاح بنام ''الف'' سے ہوا۔ شادی کے تقریباً سات سال بعد اس کے خاوند نے ''ک'' اس کو تحریری طور پر تین طلاقیں دے دیں اور حق مہر وعدت کے تمام واجبات ادا کر دیئے۔ ایک سال کے بعد دونوں میں مفاہمت کے

امکانات پیدا ہوگئے اور "تحلیلِ شرعی" کے لئے راضی ہوگئے۔ جس کے لئے ایک شخص "ش" سے غیر مشروط طور پر نکاح کرلیا، نکاح لڑکی کے والد نے پڑھایا، صرف لڑکی کی والدہ موجود تھی اور کوئی گواہ نہیں تھا، اس شخص یعنی "ش" نے ازدواجی تعلقات بھی تین مرتبہ قائم کئے، لیکن اس نکاح کو پوشیدہ رکھا گیا اور ایک ماہ بعد اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ یا شرط، اس نے "ک" کو فون پر اس کے والد کے روبرو تین طلاق دے دیں اور لڑکی نے عدت بھی مکمل کرلی۔ اب لڑکی "ک" دوبارہ اپنے سابقہ شوہر "الف" سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آیا تحلیلِ شرعی کے لئے کیا گیا نکاح درست ہوا یا نہیں؟ اور اب "ک" اپنے سابقہ شوہر "الف" سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟، (ایم یاسین عابد قریشی، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

نکاح کا اعلانیہ طور پر ہونا، نکاح کے مستحبات میں سے ہے، اور دو گواہوں کی موجودگی میں ہونا شرائط نکاح میں سے ہے، جیسا کہ اعلان نکاح کے حکم میں حدیث مبارکہ میں ہے: عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: اَعلِنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد واضربوه عليه بالدفوف۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو، (سنن ترمذی، رقم الحدیث :1089)"۔

نکاح کے منعقد اور صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ دو مسلمان گواہوں کے سامنے مجلسِ نکاح میں ایجاب وقبول کیا جائے، امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی

مسلک ہے، اوران ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ حدیث ہے: عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال: البغایا اللاتی ینکحن انفسھن بغیر بینۃ ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1103)''۔

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں: ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاھدین حرین عاقلین بالغین أو رجل و امرأتین۔

ترجمہ: ''مسلمانوں کا نکاح منعقد نہیں ہوتا جب تک وہاں دو آزاد عاقل و بالغ مسلمان مرد گواہ یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ موجود نہ ہوں''۔ اس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: أما اشتراط الشھادۃ فلقولہ علیہ السلام "لا نکاح الا بشھود "

ترجمہ: ''پس شہادت (گواہوں) کی شرط نبی کریم ﷺ کے اس قول کے مطابق لگائی گئی ہے کہ ''گواہوں کے بغیر نکاح (منعقد) نہیں''، (فتح القدیر مع ہدایہ، جلد 3، ص: 190,191 مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکات رضا، گجرات، ھند)''۔

علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ ''لا نکاح الا بشھود۔ (گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا)'' اور ہمارے علماء (حنفیہ) اسی حدیث پر عمل کرتے ہیں اور امام مالک، ابن ابی لیلیٰ، اور عثمان بتی رحمھم اللہ یہ کہتے ہیں کہ نکاح میں گواہ شرط نہیں بلکہ اعلان شرط ہے حتیٰ کہ بچوں اور مجنونوں کے سامنے بھی نکاح کا اعلان کردیا تو نکاح درست ہوگا اور اگر گواہوں کو یہ حکم دیا کہ وہ گواہی ظاہر نہ کریں تو نکاح درست نہیں ہوگا، (المبسوط، جلد 5، ص: 31، مطبوعہ: دار المعرفۃ، بیروت)''۔

صحتِ نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا شرط ہے، یعنی دو آزاد عاقل وبالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں لڑکی کے والد نے نکاح پڑھایا اور گواہ کی صورت میں صرف ایک عورت (یعنی لڑکی کی والدہ) موجود تھی ،گواہی کا نصاب مکمل نہیں ، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: لان النکاح بغیر شھود فاسد لاباطل۔

ترجمہ: ''گواہوں کے بغیر نکاح فاسد ہے باطل نہیں ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد 26،ص: 28، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

سوال میں بیان کردہ صورت سے واضح ہے کہ دوسرا نکاح ''ش'' سے تحلیلِ شرعی کی غرض سے پڑھایا گیا اور تحلیل شرعی کی بابت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز درمختار (جلد 5ص: 34 تا 36، مطبوعہ بیروت) کی ایک عبارت کی تلخیص فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''درمختار میں ہے: لاینکح مطلقة بالثلاث حتی یطأھا غیرہ بنکاح نافذ خرج الفاسد والموقوف، ترجمہ: ''تین طلاقوں سے مُطلّقہ عورت سے دوبارہ اس وقت تک نکاح نہیں ہوسکتا ،جب تک دوسرا خاوند (شرعی طور پر) نافذ (اور مؤثر وصحیح) نکاح کے ساتھ اس عورت سے جماع نہ کرلے، صحیح اور نافذ نکاح کی قید سے نکاح فاسد اور نکاح موقوف خارج ہوگیا ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد 12 ،ص: 423، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مذکورہ بالا میں جب نکاح صحیح طور پر منعقد ہی نہیں ہوا تو وہ عورت طلاق کا محل ہی نہیں بنی ،لہٰذا طلاق کیسے مؤثر ہوگی؟ ،اور اس سے شوہرِ اوّل کے لئے حِلّت کیسے ثابت ہوگی؟۔ اس خاتون ، اور اس کے ساتھ نکاحِ فاسد میں شریک شخص اور دیگر شرکاءِ معاملہ سب کو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔ اور ''تحلیلِ شرعی'' اب بھی

ازروئے قرآن ''زوج غیر'' کے ساتھ غیرمشروط نکاح اور پھر اس کا اپنی مرضی سے طلاق دینا اور عدت کا گزر جانا ضروری ہے۔

عنین کا حکم

سوال: 101

12 مئی کو میرے چھوٹے بھائی نوید کی شادی ہوئی لیکن شادی کے بعد سے اب تک وہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار نہیں کرسکا لڑکی والوں کا کہنا ہے کہ اب لڑکی کی شادی لڑکے کے بڑے بھائی سے کردی جائے اور وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ہم یہ چاہتے ہیں کہ لڑکی والے ہم کو وقت دیں تا کہ ہم اس کا علاج کرواسکیں لیکن لڑکی والے اس کے لئے تیار نہیں ہو رہے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟ عدت سے متعلق کیا حکم ہے؟ اور کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ ،(جاوید،اورنگی،کراچی)۔میری بیٹی کی شادی 12 مئی کو ہوئی اور لڑکا حقِ زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔اس صورت میں ہم اس کے بھائی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔آیا عدت کرنا ہوگی یا کوئی کفارہ ہوگا؟،(محمد شریف،اورنگی،کراچی)۔

جواب:

جو شخص اپنی بیوی کے ازدواجی حقوق ادا کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اسے اصطلاحِ فقہ میں ''عنین'' کہتے ہیں۔

عبدالرزاق عن معمر عن الزهری عن سعید بن المسیب قال: قضی عمر بن الخطاب رضی الله عنه فی الذی لایستطیع النساء ان یؤجل سنة قال معمر: وبلغنی انه یؤجل سنة من یوم ترفع امرها۔

ترجمہ:امام عبدالرزاق اپنی سند کے ساتھ سعید بن مسیّب سے روایت فرماتے ہیں:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسے شخص کے بارے میں کہ جو اپنی عورت پر (جماع کی) قدرت نہ رکھتا ہو، کے بارے میں فیصلہ فرماتے کہ اس کو ایک سال کی مدت دی جائے، معمر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ اس کو ایک سال کی مدت اس روز سے دی جائے گی کہ جس دن یہ معاملہ قاضی کے پاس پہنچا، (مصنف عبد الرزاق ،رقم الحدیث:10720)"۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

عورت بے موت یا طلاق جدا نہیں ہوسکتی اگر چہ مرد نامرد ہو، ہاں چارۂ کار حاکم شرعی کے یہاں دعویٰ ہے، وہ اس ثبوت لینے کے بعد کہ مرد اس پر قادر نہ ہو، مرد کو ایک سال کی کامل مہلت دے کہ اپنا علاج کرے، اس سال میں عورت مرد سے جدا نہ رہے اگر سال گزر جائے، اور اب بھی قادر نہ ہو، عورت پھر دعویٰ کرے اور حاکم پھر ثبوت لینے کے بعد عورت سے پوچھے کہ تو اپنے شوہر کے پاس رہنا چاہتی ہے یا اپنے نفس کو اختیار کرتی ہے، اگر عورت فوراً بلا تاخیر کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا تو حاکم ان میں تفریق وجدائی کردے، یہ تفریق طلاق ہوگی، اور اب بعد عدت عورت دوسرے سے نکاح کر سکے گی ورنہ نہیں، یہ حکم عورت کی جانب ہے، رہا مرد، اسے حکمِ شریعت ہے کہ جب وہ عورت کا حق ادا نہیں کرسکتا تو اس پر فرض ہے کہ عورت کو طلاق دے دے، نہ دے گا تو گنہگار و مستحقِ عذاب ہوگا۔ واللہ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ ، جلد:12،ص:488)"۔

سوال میں بیان کردہ واقعات اگر درست ہیں، تو شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو فی الفور طلاق دے دے، ورنہ وہ گنہگار ہوگا اور مستحقِ عذاب ہوگا اور شوہر کے گھر والوں کو چاہئے کہ وہ اسے برضا و رغبت طلاق دینے پر آمادہ کریں، اگر وہ اس کے باجود طلاق

دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر بیوی عدالت سے رجوع کرے اور عدالت شوہر کو ایک سال کا وقت دے، اگر وہ اس ایک سال کے دوران اپنی اہلیت مباشرت ثابت نہ کر سکے تو عدالت نکاح فسخ کر دے گی اور عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہو گی، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ہمیں حرمتِ مصاہرت سے متعلق دو سوالات موصول ہوئے

ترتیب وار پیشِ خدمت ہیں۔

حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے

سوال: 102

میں ایک رات جلسے میں شرکت کرنے کے بعد کافی دیر سے گھر آیا تو سب گھر والے سو چکے تھے، میں اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے لائٹ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ معمول کے مطابق میری چارپائی کے ساتھ بیوی کی چارپائی ہوتی ہے۔ مجھے کچھ خواہش ہوئی جس کی وجہ سے میں نے اپنا ہاتھ بیوی کی طرف بڑھایا اور میں نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، بعد ازاں قمیص کے اندر بھی ہاتھ داخل کیا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ میں نے لائٹ لگائی تو فی الواقع وہ میری بیوی نہ تھی بلکہ میری ساس تھی جو بیوی کی جگہ لیٹی ہوئی تھی اور ساتھ میں میری بچی بھی سو رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے فوراً توبہ واستغفار کیا۔ میں نے حنفی علماء کرام سے اس مسئلے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہاری بیوی اب تم پر حرام ہے۔ خدارا آپ اس مسئلے کو مفصل ومدلل تحریر فرما کر میری پریشانی کا شافی حل بتائیے۔ میرے سب رشتے دار بڑے غصے میں ہیں، جو بھی حکم از روئے قرآن وحدیث ہے اس سے ہمیں اپنے فتویٰ کے ذریعے آگاہ فرمائیے۔ (محمد عبدالرحمٰن، بنوں، صوبہ سرحد)۔

جواب :

وہ عورتیں ،جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں،تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہو جائیں گے ۔اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہو جائیں گے ،اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں ۔یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی ،اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں ۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىْ فِىْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ۔

ترجمہ:''(اور تم پر حرام کی گئی ہیں)تمہاری بیویوں کی مائیں ،اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو ،(النسآء :23)''۔

قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح وطی کر لی گئی ہو اور شہوت کے ساتھ چھونا بھی وطی کے حکم میں ہے، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وکما تثبت هذه الحرمة بالوطء تثبت بالمس والتقبيل والنظر الى الفرج بشهوة كذافي الذخيرة۔

ترجمہ:''حرمت مصاہرت ، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے ، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 274-275، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (ولا فرق فيما ذكر وبين اللمس والنظر

بشهوة بين عمد ونسيان و خطاء و اکراہ۔

ترجمہ: ''کسی عورت کوشہوت کے ساتھ چُھوا ،یا (شرمگاہ کونظرِ شہوت) دیکھا حرمت ثابت ہوجائے گی ،اگر چہ یہ کام جان بوجھ کر کیا ہو، بھولے سے ہو، غلطی سے ہو یا زبردستی کرایا گیا ہو، ہرصورت میں حرمت ثابت ہوجائے گی ، (ردالمحتار علی الدرالمختار، فصل فی المحرمات،جلد 2ص:306 مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ثم لا فرق فی ثبوت الحرمة بالمس بین کونہ عامدا أو ناسیا أو مکرھا أو مخطئا کذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ: ''پھرکوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کاچُھونا ،خواہ (یہ فعل) جان بوجھ کر ہو،یا بھول کر ہو یااس سے زبردستی کرایا گیا ہو یا غلطی سے ہوا ہو، ہرصورت حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجائے گی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 274 مطبوعہ:مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

لہٰذا جب بیوی کی ماں کوشہوت سے چھولیا تو بیوی اسی وقت حرام ہوگئی اور بیوی کی ماں تو پہلے سے ہی حرام تھی ،اب دونوں ماں بیٹی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئیں کہ ان سے نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔متارکہ کے بعد عورت کواختیار ہے کہ اس شخص کے سوا جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔متارکے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر دو گواہوں کے سامنے کہے ''میں نے اپنی بیوی کوچھوڑ دیا وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے''۔متارکہ کے بعد عدت شروع ہوگی۔

سوال: 103

میری خالہ دبئی سے آئی ہیں اور اپنی سگی بہن (میری والدہ) کے گھر پر ٹھہری ہیں۔میری خالہ کی ایک بیٹی ہے،میری امی نے خالہ سے میرے بھائی کے لئے ان کی بیٹی کا رشتہ کرلیا نکاح کے چھ سات مہینے باقی تھے اسی دوران خالہ اور بھانجے میں

صحبت (زنا) ہوگئی۔لیکن بھائی اور خالہ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا۔خالہ بہت پرہیز گار اور پانچ وقتہ نمازی ہے۔خالہ کی عمر 32 سال ہے اور بھائی کی عمر 18 سال ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں پتا تھا سات مہینے بعد جب لڑکی کے ابو دبئی سے آئے تو ہم سب نے مل کر منگنی اور نکاح کر دیا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی نکاح کے بعد لڑکی اور لڑکے کا آمنا سامنا تھا نکاح کے تین مہینے بعد لڑکا نے لڑکی سے صحبت کرلی۔اسی دوران لڑکا اور لڑکی کی آپس میں لڑائی ہوگئی ماموں کے حوالے سے تو لڑکے نے غصے میں آکر کہا ''میں تمہیں تین طلاقیں دیتا ہوں اگر تم ماموں کے سامنے گئی تو'' طلاق دینے کے بعد کہا کہ تمہیں سمجھ میں آئی کہ میں نے کیا کہا تیسری دفعہ بھی یہی کہا۔میری خالہ نے خالو کو میرے بھائی کے ساتھ زنا کی بات بتادی اور طلاق والی بات بھی بتادی، خالو نے غصے میں بیٹی کو ماموں کا سامنا کرادیا ،کیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟۔(ایک سائل،کراچی)۔

جواب :

اللہ تعالٰی کا فرمان ہے:حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ۔

ترجمہ:''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں ،اور تمہاری بیویوں کی مائیں ،اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو،(النسآء:23)''۔

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، وہ اسباب جن کے سبب نکاح حرام ہے ان میں ایک قسم نسب ہے، محرماتِ نسبیہ میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں شامل ہیں، ان سے نکاح کرنا، صحبت کرنا اور کسی قسم کا کوئی بھی شہوانی عمل کرنا دائما حرام ہے۔

دوسرا سبب حرمتِ مصاہرت ہے، یعنی مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول و فروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول و فروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح وطی کر لی گئی ہو یا انہیں شہوت کے ساتھ چُھوا، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: و کما تثبت ھذہ الحرمۃ بالوطیٔ تثبت بالمس و التقبیل و النظر الی الفرج بشھوۃ کذا فی الذخیرہ۔

ترجمہ: ''حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرف شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275-274، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔ اب صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائل اس کے بھائی نے خالہ سے زنا کیا اور خالہ تو پہلے ہی حرام تھی اب اس کی اولاد بھی اس پر حرام ہو گئی، اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، تو طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یعنی جب وہ

خاتون اس لڑکے کے لئے محلِ نکاح ہی نہیں بنتی، تو اس کے ساتھ نکاح ابتداءً ہی منعقد نہیں ہوسکتا۔ پس وہ محل طلاق ہی نہیں ہے، کیونکہ طلاق تو نکاح کی بندش کو اٹھانے کا نام ہے، لہذا دونوں کو فوراً علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہیے۔

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الطلاق﴾

''دلالتِ حال'' نسبت طلاق کے لئے کافی ہے

سوال: 104

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا اور پھر کہا طلاق، طلاق، طلاق، آیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (معرفت صاحبزادہ نورالعارفین صدیقی، آشٹن، اولڈھم، یو۔کے)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق وقوعِ طلاق کے لئے نسبت شرط ہے اور نسبت یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت شوہر اپنی بیوی کی زوجیت کا اظہار کرے، مثلاً یوں کہے کہ میری بیوی کو طلاق ہے یا بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے کہ اس کو طلاق ہے یا طلاق دیتے وقت بیوی کا نام ذکر کرے، جس طلاق میں نسبت نہ ہو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ نسبت کا صریح لفظوں میں پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہو تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ولا یلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه الخ۔

ترجمہ: ''کلام میں (بیوی کی طرف) نسبت کا صریح ہونا لازمی نہیں ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: لان دلالة الحال قائمة مقام النیة الخ۔

ترجمہ: ''اس لئے کہ دلالتِ حال نیت کے قائم مقام ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:4، ص:338، 339 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

نسبت معنوی کی بنا پر وقوعِ طلاق کی مثالیں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں، شیخ الامام

محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز کردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں: قال لها بعد المخلع من ساعته هرسه هرسه اخاف وقوع الثلاث وان لم توجد الاضافة لانه سبق ذکر الطلاق۔

ترجمہ: "(شوہر نے) بیوی سے خلع کے بعد اسی وقت کہا: "تین کی تین"، (اس میں) اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت نہیں پائی گئی، (پھر بھی) تینوں طلاق واقع ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ طلاق کا ذکر پہلے گزر چکا ہے"۔

اس کے بعد آگے چل کر لکھا: "این زن که مراست دسه" لا یقع وقال ابوبکر العیاض ان نوی یقع وقال الورشتنی رحمه الله طلقت امرأته لانه وجدت الاضافة فی اول الکلام۔

ترجمہ "(شوہر نے کہا:) یہ جو میری بیوی ہے (اس کو) تین طلاق واقع ہوں، (تو طلاق) واقع نہیں ہوگی، اور ابوبکر عیاض نے کہا: (اگر شوہر نے) نیت کی ہے تو واقع ہوگی اور ورشتنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: اس کی بیوی کو طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ ابتدائے کلام میں نسبت ہے۔

اس سے پیشتر انہوں نے لکھا: وسئل احمد القلانسی عمن وکز امرأته فقال" اینك یك "یقع طلاق ثم ذکر ثانیا وقال "اینك دو طلاق" وکذا فی الوکزة الثالثه، قال تطلق ثلاثاً الخ۔

ترجمہ: "احمد القلانسی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو مکا مار کر کہا: "اس کو ایک" تو ایک طلاق واقع ہوجائے گی، پھر دوبارہ ذکر کیا اور کہا: "اس کو دو طلاق"، اسی طرح تیسری بار مکا مار کر کہا: "اسے تین طلاق" تو (احمد القلانسی) نے کہا: (اس کی بیوی کو) تین طلاق واقع ہوجائیں گی، (فتاویٰ بزازیہ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری

ج:4،ص:179،172 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)"۔

امام احمد رضا قادری سے دریافت کیا گیا: محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا، اس کی والدہ نے کہا کہ اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی مظفر نے کہا کہ طلاق دیتے ہیں پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا: طلاق، طلاق، طلاق بغیر مخاطب کرنے کسی کو، اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

جواب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "تین طلاقیں ہوگئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی۔(فتاویٰ رضویہ ج:12 ص 359،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)"۔

مولانا محمد امجد علی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک طویل سوال میں پوچھا گیا: ساس نے داماد سے کہا کہ یہ کمینہ پن ہے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح نہیں مارتا ہے، تم یہاں سے نکل جاؤ، (شوہر نے) یہ سن کر کہا: طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، اس وقت زید کی بیوی اپنے چچا کے مکان کے سائبان میں تھی الخ۔

اس کے جواب میں علامہ امجد علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

اگر چہ زید کے ان الفاظ میں اضافت نہیں ہے اور وقوعِ طلاق کے لئے اضافت ضروری ہے مگر چونکہ ساس کے جواب میں کہا تھا، لہٰذا زید کے الفاظ کے یہی معنی متعین ہیں کہ تمہاری بیٹی کو طلاق الخ ،(فتاویٰ امجدیہ ،جلد : دوم،ص : 227،228)۔

صورتِ مسئولہ میں شوہر کے کلام میں اگر چہ (بیوی کی طرف) نسبت صریحہ نہیں ہے، لیکن چونکہ پہلے شوہر نے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، جیسا کہ خط کشیدہ

الفاظ سے ظاہر ہے لہٰذا اس قرینے کے پیش نظر صورتِ مسؤلہ میں نسبت معنوی پائی گئی اور مذکورہ خاتون کو تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ متکلم کی "دلالتِ حال" نیت کے قائم مقام ہے اور یہاں "دلالتِ حال"، الفاظِ طلاق کی ادائیگی سے پہلے، ارادہ طلاق کا اظہار ہے۔

ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق

سوال: 105

میرے خاوند نے دو سال پہلے مجھے ایک طلاق دی اس کے بعد ہم نے رجوع کرلیا، پھر چھ ماہ بعد انہوں نے مجھے دوسری طلاق دی اور پھر ہم نے رجوع کرلیا اس کے چار ماہ بعد ایک بار جب پاکستان سے میرے بھائی اور بہنوئی نے مجھے موبائل پر فون کیا اور میری ان سے بات ہوئی، جب میرے خاوند گھر آئے تو انہوں نے موبائل چیک کر کے پوچھا کہ کیا آج تمہارا پاکستان سے فون آیا تھا، (میں یہ بتاتی چلوں کہ کچھ جھگڑوں کی وجہ سے دونوں خاندانوں کی بول چال بند تھی، میرے خاوند کو بالکل پسند نہیں کہ میں یا وہ فون کریں اور دوسرا یہ کہ وہ بہت شکی، اور وہمی طبیعت کے مالک ہیں) خیر جب میرے خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہاری بات ہوئی ہے تمہارے گھر والوں سے میں نے کہا کہ ہاں، انہوں نے کہا کہ کس کس سے ہوئی؟ میں نے کہا کہ بھائی، بہن، امی سے ہوئی (یہ میں نے جھوٹ کہا تھا جبکہ میری بات صرف بھائی اور بہنوئی سے ہوئی تھی) پھر انہوں نے کہا کہ کیا بہنوئی سے بھی ہوئی، میں نے بات نہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ شاید ہوئی ہو، کیونکہ مجھے ان کی طبیعت کا اندازہ تھا، انہوں نے کہا "اچھا اگر تو گل کیتی تے تو میری بیوی نہیں"۔ بقول میرے خاوند کے کہ یہ الفاظ میں نے طلاق کی نیت سے استعمال نہیں کئے۔ بلکہ میرے دل میں یہ تھا

کہ بیویاں اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اگر تم کو میری عزت کا خیال ہوا تو اگلی بار تم بات نہ کروگی۔ میں نے یہ مسئلہ جب Dues Bury England کے مفتی موسیٰ سے پوچھا! تو انہوں نے کہا کہ آپ کے شوہر سے بات کرنی پڑے گی کہ آیا ان کی نیت کیا تھی۔ پھر میرے خاوند نے کہا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دینی ہوتی تو جس طرح پہلی دونوں بار طلاق کا لفظ استعمال کیا اب بھی کرتا۔ خیر مفتی صاحب نے اجماع کرکے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ کیا معلوم اس وقت ان کی نیت کیا ہو۔ بہت پریشان رہتی ہوں۔ پر میرے خاوند بہت قسمیں اٹھاتے ہیں۔ اور مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ پھر اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، اگر وہ غلط بیانی کرتا ہے۔ آپ میری صحیح رہنمائی کریں۔ میرے شوہر نے مجھ پر بہت گندے الزامات اور بہتان لگائے ہیں، اپنے گھر والوں کے کہنے پر اس کی حمایت اور تائید میرے خاوند نے بھی کی۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، اب 4 ماہ سے میں نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے، وہ بچوں سے ملنے آتے ہیں، پر نان نفقہ بالکل نہیں دیتے، کہتے ہیں کہ جب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، تو تم کیوں الگ رہتی ہو، وہ کہتے ہیں کہ کبھی مجھ کو طلاق نہیں دیں گے۔ چاہے دوسری شادی بھی کرلیں۔ اپنے خاوند کے بارے میں یہ بتاتی چلوں کہ دینی اعتبار سے نابلد ہیں۔ اور جھوٹے اور لالچی انسان ہیں، (یاسمین، معرفت محمود احمد، مکان نمبر 558، گلی نمبر 16 مرگلہ، اسلام آباد)

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع

WWW.NAFSEISLAM.COM

صرف نظر کرنی چاہیۓ، خاص کر شوہروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تمہاری بیویاں تمہیں پسند نہ آئیں تو صبر کا مظاہرہ کرو ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیاء و یجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا (النساء:19)۔

ترجمہ: "پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بھلائی رکھے، اس تمہید کے بعد صورت مسئولہ میں شوہر پہلے دو طلاقیں دے چکا ہے، ازروئے شرع شوہر کو مزید صرف ایک طلاق دینے کا حق ہے، آئندہ کبھی اگر شوہر نے ایک طلاق دے دی تو بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی۔

استفتاء میں درج پنجابی کے خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔ فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:386 پر ہے:

ولوقال "توزن من نئی" لا یقع ان نوی وھوالمختار

ترجمہ: "اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے تو میری بیوی نہیں ہے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگر چہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے" لہٰذا نکاح باقی ہے، عورت اگر شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو بشرطیکہ شوہر کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو تو ایسی عورت کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم نہیں ہے، عالمگیری جلد 1 ص:545 پر ہے:

وان نشزت فلا نفقة لھا حتی تعود الیٰ منزلہ الخ۔

ترجمہ: "اگر عورت مرد کی نافرمانی کرے، تو مرد کے ذمہ اس کا خرچہ نہیں ہے، جب تک کہ وہ واپس اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں نہ رہے"۔

طلاقِ ثلاثہ کے بعد شوہرِ اول سے نکاح کا حکم

سوال: 106

آپ نے 18 جون کے دین و دانش ایڈیشن میں ایک سائل کے جواب میں مسئلہ طلاق کے ذیل میں بیان فرمایا کہ تین طلاقوں کے بعد عورت سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی اس کے علاوہ کسی بھی مرد سے نکاح کے سلسلے میں آزاد ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اگر تینوں طلاقیں دینے کے بعد میاں بیوی اپنے فیصلے پر پشیمان ہوں، اور بچوں وغیرہ کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے دوبارہ گھر بسانا چاہیں تو شریعت اس کا کوئی حل پیش کرتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے ضلع میں ایک واقعہ ہوا ہے کہ تین طلاقوں کی عدت گزرنے کے بعد اس عورت کا نکاح کسی نامعلوم مرد سے ہوا اور مباشرت کے بعد اس نے طلاق (تین بار) دے دی، اور اس کی عدت گزرنے کے بعد پھر پہلے مرد سے نکاح کردیا گیا، کیا قرآن وسنت میں ایسے کسی طریقے کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟، اگر نہیں تو ان لوگوں اور نکاح خواں کا یہ عمل کیسا ہے اور شریعت اس پر کیا حد لگاتی ہے۔ ایسا نکاح کرنے والے امام کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں اور مسجد میں اسے مستقل امام مقرر کیا جائے یا نہیں؟، برائے مہربانی جلد اخبار میں جواب سے نوازیں، (رشید احمد خان، دکان نمبر 147 پرانی لکڑمنڈی، منڈی بہاؤالدین)۔

جواب:

ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا ہوا ہے، یہ بات ہمارا خالق و مالک رب تبارک وتعالیٰ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء آیت نمبر 11 میں احکام وراثت بیان کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰبَـآؤُ كُـمْ وَاَبْنَـآ ؤُ كُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَ يُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ط

ترجمہ: ''تمہارے باپ اور تمہارے بیٹوں میں سے کون تمہارے نفع کے اعتبار سے تمہارے زیادہ قریب ہے؟''۔

قرآن میں اللہ تعالٰی نے جو احکام قطعیت کے طور پر بیان کردیئے ہیں، ان میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے، طلاق کے حوالے سے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 229 میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمۡسَاكٌ ۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌ ۢ بِاِحۡسَانٍ ط

''طلاق کی وہ صورت جس میں شوہر کو طلاق کے بعد اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کا حق حاصل ہے، وہ فقط دو (رجعی) طلاقیں ہیں، پھر (اس کے بعد اس کے پاس دو راستے ہیں) یا تو معروف طریقے سے (رجوع کرکے) اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے یا بھلائی کے ساتھ اس کا راستہ کھلا چھوڑ دے''۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر فرمایا: فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ط

ترجمہ: ''اگر وہ (دو طلاق رجعی کے بعد ایک) طلاق (اور دے دے) تو اب (تین طلاق کے بعد) وہ مطلقہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ وہ عورت اس (سابق شوہر) کے علاوہ کسی اور شوہر سے نکاح کر لے''، پھر اگر وہ (زوج ثانی اپنی مرضی سے) اسے طلاق دے دے، تو (اس عورت اور اس کے سابق شوہر) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر انہیں گمانِ (غالب) ہو کہ وہ (اب دوبارہ شروع ہونے والی اپنی ازدواجی زندگی میں) اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، تو (عدت طلاق) گزرنے کے بعد لوٹ کر دوبارہ نکاح کرلیں۔ اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز ہونے کوئی صورت نہیں ہے۔

الفاظِ طلاق

سوال: 107

میرے شوہر شاہنواز احمد خان نے گھریلو پریشانیوں سے تنگ آ کر غصہ کرتے ہوئے لفظِ طلاق استعمال کیا، جھگڑا اس وجہ سے شروع کیا کہ پانچ ہزار کا مطالبہ کیا یہ کہہ کر کہ میں چلا جاؤں گا اور تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا۔ میں نے کہا میرے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس پر کہا کہ میرے دل میں تو ہے۔ 2 جون 2006ء جمعہ کی رات تقریباً ساڑھے دس بجے غصہ کرتے ہوئے کہا کہ "میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں، میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں"، میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا۔ آیا مذکورہ صورت میں کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں؟۔ (ریحانہ بیگم، ماریہ اپارٹمنٹ نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائلہ اس کے شوہر کا یہ قول کہ "تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا" یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاءآت میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر (بصیغۂ حال) کہے کہ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں"، یا بصیغۂ ماضی کہے "میں نے تمہیں طلاق دی"، لہٰذا مذکورہ الفاظ "تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا" سے کوئی طلا

ق واقع نہیں ہوئی۔

پھر سائلہ کے بیان کے مطابق 2 جون، 2006ء کی شب سائلہ کے شوہر نے دو مرتبہ کہا کہ "میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں" ان الفاظ سے دو طلاق صریحہ واقع ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطلاق مرتٰن ص فامساک م بمعروف او تسریح باحسان ط

ترجمہ: "طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)"۔ شوہر چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ سائلہ کے بیان کے مطابق "میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا" چونکہ یہاں طلاق کو فون کرنے اور دونوں بھائیوں کے آنے پر معلق کیا

تھا اور شرط نہیں پائی گئی لہٰذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، واللہ اعلم بالصواب۔

مذاکرۂ طلاق

سوال: 108

میری شادی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے جبکہ میری بیٹی تین ماہ کچھ دن کی ہے جب سے میری شادی ہوئی ہے گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے، میرے بھائی اور بہنوں کے میری بیوی سے بہت اختلافات ہیں ابھی دو دن پہلے کی بات ہے صبح ناشتہ کے ٹائم گھر میں جھگڑا ہوگیا میری بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق کہتا رہا جبکہ میں نے دل سے طلاق نہیں دی بلکہ معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کہا جبکہ سن کر میری بیوی رونے لگی اور سب گھر والے بھی رونے لگے میں نے اپنی بیوی کو تھوڑی دیر بعد کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور میں اپنی بیوی اور بیٹی کو سسرال چھوڑ کر آیا اور میں نے اس سے وعدہ لیا کہ اس جھگڑے کا کسی سے ذکر نہیں کروگی، میں تمہیں دو چار دن میں کرائے کا گھر لے کر چلا جاؤں گا بلکہ میں اپنی اس حرکت شیطانی پر بہت شرمندہ ہوں، (سہیل عمران، الکرم اسکوائر بلاک 4 لیاقت آباد، کراچی)۔

بیان زوجہ: میں مسماۃ خالدہ بنت ضیاء الحق حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ مورخہ 31 مئی 2006ء صبح کے وقت میرے اور میری نند کے درمیان گفتگو جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی اور بات بڑھتے بڑھتے یہ ہوئی کے میرے دیور نے مجھے گالیاں

دیتے ہوئے میرے شوہر سے یہ کہا کہ آپ اسے طلاق دے دیں ہم آپ کی دوسری شا
دی کردیں گے اور اس پر میرے شوہر نے ان کو ڈانٹا لیکن وہ بار بار طلاق دینے پر اصر
ار کرتا رہا، اس دوران انتہائی غصے میں میرے شوہر نے تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہا
نہ مجھے مخاطب کیا اور نہ ہی میرا یا اپنا نام لیا، (خالدہ بنت ضیاء الحق)۔

جواب:

طلاق میں اضافت کا پایا جانا ضروری ہے خواہ وہ اضافتِ لفظی ہو یا معنوی ہو یا کسی ایسے کلام کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور تھی، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافۃ فی اللفظ فاقول علی ثلثۃ انحاء، الاول تحققھا صریحاً فی کلام الزوج وھذا الذی ذکر الحلبی والطحاوی امثلتہ کقولہ انت طالق او طلقتك او ھذہ او زینب او بنت زید او ام عمرو او اخت بکر او امرأتی طالق، الثانی تحققھا فیہ لاجل کونہ جواباً لکلام تحققت فیہ فتحقق فی الجواب ایضاً لان السوال معاد فی الجواب وھذا مافی الھندیۃ عن الخلاصۃ قالت طلاق بدست تو است، مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق می کنم و کرر ثلثا طلقت ثلثا اھ۔

ترجمہ: ''یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے وہ یہ ہے جس کی مثالیں علامہ حلبی اور علامہ طحاوی نے یہ ذکر کی ہیں، مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (بیو ی کو اشارہ کرتے ہوئے) اسکو، نام لے کر، زینب کو، زید کی بیٹی کو، عمرو کی ماں کو، بکر کی بہن کو، میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت، یہ کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے

جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جوابا ً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں ہندیہ میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے "طلاق تیرے ہاتھ میں ہے مجھے طلاق دے"۔ تو جواب میں خاوند کہے "میں نے طلاق دی" تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاوی رضویہ جلد 12 ص: 344.345 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا اس کی والدہ نے کہا کہ اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی ،مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق،، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعا صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟ جواب میں لکھتے ہیں:

"تین طلاقیں ہوگئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاوی رضویہ جلد 12 ص: 360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اور حلفیہ اقرار زوجہ بصورتِ مسئولہ میں مذاکرۂ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ: طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے۔ آپ کے تحریری و زبانی بیان کے مطابق کہ "میرے بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ

مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا "،آپ کا لفظِ طلاق کہنا آپ کے بھائی کے کلام کے جواب میں تھا،اسی کو اصطلاح فقہاء میں مذاکرۂ طلاق کہتے ہیں،لہٰذا تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی ہیں۔

تین طلاق کا حکم

سوال: 109

میں روبینہ انجم سبحانی بنت سبحان خان میری شادی محمد افسر سے 28مارچ 1986ء کو انجام پائی ہم دونوں فقہ حنفی سے تعلق رکھتے ہیں،10 سال پہلے میرے شوہر نے غصے میں آکر ایک ہی نشست میں مجھے کئی بار یہ لفظ ادا کیے "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے،پھر وہ مکتبۂ اہلِ حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ تین طلاق سے ایک ہی طلاق واقع ہوئی ہے ہم پھر ساتھ رہنے لگے،اس کے بعد وہ مجھ پر تشدد کرتے اور کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتے،تالے میں مجھے بند رکھتے ،اس واقعہ کے 7 سال بعد انہوں نے 5مرد اور 7 خواتین کی موجودگی میں قبلہ رو ہو کر کلمہ پڑھا اور کہا "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں،میں تمہیں طلاق دیتا ہوں،میں تمہیں طلاق دیتا ہوں"۔میرے چار بچے ہیں،بڑے بیٹے کی عمر 18 سال ،12 سال کی ایک بیٹی،10 سال کا ایک بیٹا پھر 8 سال کی بیٹی،تین چھوٹے بچے میرے بغیر نہیں رہتے اور میرے ساتھ ہیں وہ (بچوں کے والد) کوئی خرچہ بھی نہیں دیتے اور تشدد کر کے بچے چھین کر لے جاتا ہے،قرآن وسنت کے حساب سے باپ پر بچوں کا خرچہ کیا بنتا ہے؟،(روبینہ انجم،روفی گرین سٹی بلاک 18 گلستانِ جوہر،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو دس

سال قبل جو تین طلاق دیں وہ موثر ہیں اور دیانۃً طلاق اسی وقت واقع ہو گئی ہے اور باوجود فقہ حنفی سے تعلق رکھنے کے، غیر مقلدین سے فتویٰ لینا محض ہوائے نفس کی پیروی اور جہالت ہے اور اس کے بعد جتنا عرصہ ساتھ گزارا وہ سب حرام اور زنا میں شمار ہوگا، آپ نے لکھا ہے کہ پہلی بار جب آپ کے شوہر نے تین طلاقیں دیں تو اس کے گواہ نہیں ہیں، عنداللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی، لازم نہیں ہے ،آپ کے بقول آپ کے شوہر مسلک اہل حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی بار بھی تین طلاق دینے کا اقرار کرتے ہیں اور یہ اعتراف قضاءً طلاق کے لئے مؤثر ہونے کے لئے کافی ہے۔بچوں کی کفالت اور پرورش کا حق اوّلاً ماں کو حاصل ہے۔علامہ علاوالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیۃ الولد(تثبت للام)۔ ترجمہ:"حق حضانت (نگہداشت کا حق)نسبی ماں کو حاصل ہے، (جلد نمبر 5،ص: 203مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)"۔اگر مطلقہ ماں کی عدّت ختم ہو چکی ہو اور وہ بچے کی پرورش پر اجرت کا تقاضہ کرے تو اجرت دینا باپ کے ذمّے واجب ہے، البتہ اگر وہ عدّت میں ہو تو یا غیر مطلّقہ ماں اجرت کا تقاضا کریں تو ایسی صورت میں وہ اجرت کا مطالبہ نہیں کرسکتیں۔درمختار میں ہے:

(وتستحق)الحاضنۃ(اجرۃ الحضانۃ اذا لم تکن منکوحۃ ولا معتدۃ)لابیہ۔ ترجمہ:"بچے کی پرورش کرنے والی عورت پرورش کرنے کی اجرت کی مستحق ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ بچے کے باپ کی منکوحہ نہ ہو اور نہ ہی وہ بچے کے باپ کی مطلّقہ معتدہ ہو، (جلد نمبر 5،ص:209 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)"۔

بالغ بیٹا آزاد ہے چاہے ماں کے ساتھ رہے یا باپ کے ساتھ، نابالغ بچوں کی

WWW.NAFSEISLAM.COM

نگہداشت کا حق ماں کو حاصل ہے اوران کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے،نفقہ باپ کی مالی حیثیت کے مطابق طے ہوگا۔اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

وعلی المولود لہ رزقھنّ و کسوتھن بالمعروف ط لا تکلف نفس الّا وسعھا ج

ترجمہ:''اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کیا جائے گا، (البقرہ 233:)''۔اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لینفق ذو سعۃمن سعتہ ط و من قدر علیہ رزقہ فلینفق ممّآ اٰتٰہ اللہ ط لا یکلف اللہ نفساً الّا مآ اٰتٰھا ط

ترجمہ:''گنجائش والے کو چاہئے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہوتو وہ اسی میں سے نفقہ دے جو اللہ نے اسے دیا اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے،(الطلاق:7)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

فتستحق النفقۃ(بقدر حالھما)، بہ یفتٰی ،ویخاطب بقدروسعہ والباقی دین الی المیسرۃ۔

ترجمہ:''خاوند پر دونوں کی حیثیت کے مطابق نفقہ واجب ہوگا،اسی پر فتوٰی دیا جائے گا،اورخاوند اپنی وسعت کے مطابق ادائیگی کا مکلّف ہوگا اور جو رقم باقی رہ جائے،تو وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا،جس کو اپنی سہولت سے ادا کرے گا''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قال فی "البحر": واتفقوا علی وجوب نفقۃ الموسرین اذا کانا موسرین،

علی نفقة المعسرين اذا كانا معسرين، وانما الاختلاف فيما اذا كان احدهما موسرا والآخر معسرا، فعلى ظاهر الرواية الاعتبار لحال الرجل، فان كان موسرا وهی معسرة فعليه نفقة الموسرين، وفی عكسه نفقة المعسرين۔ واما علی المفتی به فتجب نفقة الوسط فی المسألتين وهو فوق نفقة المعسرة ودون نفقة الموسرة۔

ترجمہ: ''''بحر'' میں ہے: سب کا اتفاق ہے کہ اگر دونوں خوش حال ہیں،تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ واجب ہوگا،اوراگر دونوں تنگ دست ہیں،تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ ہوگا، اور اختلاف صرف اس صورت میں ہے،جب دونوں میں سے ایک امیر اور دوسرا غریب ہے،ظاہر روایت کے اعتبار سے مرد کے حال کا اعتبار ہوگا،پس اگر خاوند خوشحال ہو،اور زوجہ تنگ دست،تو ان پر خوشحالی کا نفقہ واجب ہوگا،اوراس کے برعکس ہو تو تنگ دستی کا نفقہ واجب ہوگا،اور مفتی بہ قول یہ ہے کہ درمیانہ نفقہ دونوں مسئلوں میں واجب ہوگا،اور وہ یہ ہے کہ خوشحالی سے کم اور تنگ دستی سے زائد ہو'' .... آگے چل کر لکھتے ہیں:

ويؤيدهقول ''البدائع'':حتی لو كان الرجل مفرطا فی اليسار يأكل خبزالحواری ولحم الدجاج والمرأة مفرطة فی الفقر تأكل فی بيت اهلها خبزالشعير يطعمها خبز الحنطة ولحم الشاة ۔

ترجمہ: ''''بدائع'' میں ہے:اگر خاوند انتہائی خوشحال ہونے کی بنا پر صاف باریک آٹا اور مرغ کا گوشت کھاتا ہے اور بیوی انتہائی تنگ دستی کی بنا پر اپنے گھر والوں کے ہاں جو کی روٹی کھاتی ہے،تو خاوند اسے گندم کی روٹی اور بکرے کا گوشت نفقہ کے طور پر کھانے کو دیگا''۔(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5 ص:226-225 مطبوعہ داراحیاء

WWW.NAFSEISLAM.COM

التراث العربي، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقدر نفقتھا بالدراھم والدنانیز علی أی سعر کانت بل یقدر بھا علی حسب اختلاف الاسعار غلا ورخصا رعایۃ للجانبین کذافی البدائع۔

مفہوم: "نفقہ کا تعین اشیاء ضرورت کی مروجہ قیمت سے صرف نظر کر کے (ایک مستقل معیار کے طور پر) درہم ودینار (روپوں) سے نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہمیشہ اتنے ہی روپے دیئے جائیں، اس لئے کہ اشیاء ضرورت کی قیمتیں کم وبیش ہوتی رہتی ہیں) بلکہ (ہر دور میں) مہنگائی اور ارزانی کے اعتبار سے نفقہ کا تعین ہوگا تاکہ جانبین کی رعایت ملحوظ رہے۔ ارزانی وگرانی دونوں ادوار کے مصارف یکساں ں ہو سکتے، بلکہ گرانی میں اس کے لحاظ سے نفقہ کی مقدار بڑھائی جائے گی اور ارزانی میں کم کی جائے گی بدائع الصنائع میں بھی اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 547 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

طلاق میں اضافت

سوال: 110

میرا ایک مسئلہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں گھریلو بات پر لڑائی ہوئی ۔بہت ہی شدید غصے میں لڑائی اسقدر بڑھ گئی کہ ہم دونوں ہوش وحواس کھو چکے تھے، اور میں نے شدید غصے میں اسے دو مرتبہ طلاق، طلاق کہا۔ نہ تو میں نے اپنی بیوی کا نام لیا اور نہ ہی یہ کہا کہ تجھے طلاق، اس طرح کی بات بالکل نہیں۔ صرف طلاق، طلاق کہا ۔میرے یہ الفاظ کہنے سے پہلے ہم دونوں کے درمیان گالیاں چل رہی تھیں اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے جب جھگڑا شروع ہوا تو اس وقت کہا تھا کہ مجھے علیحدگی چاہئے جس

وقت طلاق کے لفظ کہے اس وقت بدکلامی ہورہی تھی۔ اب ہم دونوں ہی بہت پریشان ہیں ہمارا ڈیڑھ سال کا بچہ ہے، براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں ہمارے اس مسئلے کا حل بتائیں، (فیصل خان، بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

طلاق میں اضافت ضروری ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة فی اللفظ فاقول علی ثلثة انحاء، الاول تحققها صریحاً فی کلام الزوج وھذا الذی ذکر الحلبی والطحاوی امثلته کقوله انت طالق او طلقتك او ھذہ او زینب او بنت زید او ام عمرو او اخت بکر او امرأتی طالق، الثانی تحققها فیه لاجل کونه جواباً لکلام تحققت فیه فتحقق فی الجواب ایضاً لان السوال معاد فی الجواب وھذا مافی الھندیة عن الخلاصة قالت طلاق بدست تو است مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق می کنم وکرر ثلثا طلقت ثلثا۔

ترجمہ: ''یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے اس کی صورت وہ ہے جو علامہ حلبی اور علامہ طحاوی نے ان الفاظ میں ذکر کی ہیں: مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (یا بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے طلاق دی) یا بیوی کا نام لے کر کہا کہ (مثلاً اس کا نام زینب ہے) میں نے زینب کو طلاق دی، (یا اس کی کنیت کی نسبت سے کہا کہ) میں نے زید کی بیٹی کو یا عمرو کی ماں کو یا بکر کی بہن کو طلاق دی، یا یوں کہا میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے

کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی، تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں فتاویٰ عالمگیری میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے "طلاق تیرے اختیار میں ہے مجھے طلاق دے" تو جواب میں خاوند کہے "میں نے طلاق دی" تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاوی رضویہ جلد 12 ص:344.345 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا تو اس کی والدہ نے کہا کہ: اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟

جواب میں لکھتے ہیں:

تین طلاقیں ہوگئیں، تحلیلِ شرعی کے بغیر اس کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاوی رضویہ جلد 12 ص:360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

صورتِ مسئولہ میں بر صدقِ بیانِ سائل، چونکہ مذاکرۂ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ:

طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اسی کو اصطلاحِ فقہاء میں مذاکرۂ طلاق کہتے ہیں، لہٰذا دو طلاق واقع ہوگئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الطلاق مرتٰن ص فامساك م بمعروف او تسريح باحسان ط

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے ، (البقرہ 229)''۔

شوہر چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کرسکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کرلے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کرسکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، کیونکہ پہلے دی ہوئی طلاقیں رجوع کے باوجود آئندہ طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہتی ہیں، لہٰذا شوہر اول کے رجوع یا عقد ثانی کے بعد اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر تین طلاقیں ہوجائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی، اسے انتہائی محتاط زندگی گذارنی ہوگی۔

بیوی کو مشروط طلاق دینا

سوال: 111

محمد اشرف نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہ الفاظ کہے ''اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے تم کو طلاق ہوگی''۔ اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے اور ایک سال سے بیوی کا بھائی اس سے ملتا بھی ہے اس

WWW.NAFSEISLAM.COM

کے گھر میں کھانا کھاتا اور رہتا بھی ہے بہن جاہل ہے وہ ضد سے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔محمد اشرف نے بیان دیا کہ "میں نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے اس کو طلاق ہوگی"۔اس بیان کے گواہ محمد اشرف کی ہمشیرہ اور ایک بہنوئی موجود ہیں۔معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت دونوں میاں بیوی کی کیا حیثیت ہے کیا وہ دونوں میاں بیوی رہے ہیں یا نہیں؟،(محمد عربی فورمین،کوئٹہ)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور شوہر (محمد اشرف) نے اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ کلمات کہے ہیں اور وہ ان کلمات کا اقرار کرتا ہے،تو جب پہلی بار بیوی نے بھائی سے بات کی،تو اس پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی،اس کے بعد چونکہ وہ بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے،لہٰذا رجوع ہوگیا اور ان کا نکاح قائم ہے۔آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی ہے،اگر شوہر منکر ہے اور مدعی کے پاس چونکہ ایک مرد اور ایک عورت گواہ ہے لہٰذا اس سے نصابِ شہادت پورا نہیں ہوتا،بصورتِ انکار شوہر کو قسم دی جائے گی،یہ مسئلہ قضا یعنی عدالتی ثبوت کے اعتبار سے ہے،عنداللہ حقیقتِ حال اور دیانت پر فیصلہ ہوتا ہے۔

خلع اور حقِ حضانت

سوال: 112

میری بیٹی پانچ ماہ کی حاملہ ہے خلع ہونے کی صورت میں کیا بچے کی پیدائش سے پہلے اس کے ماں یا باپ کے پاس رہنے کا فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔بچے کی ولادت کے بعد بچہ کتنے عرصے تک ماں کے پاس رہ سکتا ہے اور اس کے بعد شریعت کیا کہتی

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہے،(سید ارشاد علی،23-X-عثمان گارڈن بلاک 13،گلستان جوہر،کراچی)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش ونگہداشت کا حق بچے کی ماں کو حاصل ہے،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

الحضانة للأم------------ (ثم)أی عدم الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبی (أم الأم) وان علت عند عدم أهلية القربیٰ(ثم أم الأب وان علت) بالشرط المذکور ،و أما أم ابی الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة أيضاً ۔

ترجمہ:''بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے------------آگے چل کر لکھتے ہیں:ترجمہ:''ماں فوت ہوجائے یا بچے کوقبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے،یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرلے جو بچے کے لئے اجنبی ہےتو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا،اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو،پھر دادی کواور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا،پھر نانا کی ماں،دادی بلکہ خالہ سے بھی مؤخر ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیت الولد(تثبت للام) النسبیة۔

ترجمہ:''حق حضانت (نگہداشت کا حق)نسبی ماں کو حاصل ہے،(جلدنمبر5،ص:203مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی بیروت)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لڑکے کے حقِ پرورش کے متعلق لکھتے ہیں:

(والحاضنة) أما أو غيرهما (أحق به) أی بالغلام حتی يستغنی عن النساء

وقدر بسبع وبه یفتی لأنه الغالب۔

ترجمہ:''پرورش کرنے والی ماں ہوں یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہو جائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔

لڑکی کی پرورش کے بارے میں لکھتے ہیں:

(الأم والجدۃ) لأم أو لأب (احق بھا) بالصغیرۃ (حتی تحیض) ای تبلغ (وغیرھما احق بھا حتیٰ تشتھی) وقدر بتسع وبه یفتی۔

ترجمہ:''ماں اور نانی اور دادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشتہاۃ (قریب البلوغ) ہونے تک ہے اور اس کی مدت کا اندازہ 9 سال لگایا گیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5 ص: 210 تا 216 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

صورتِ مسئولہ میں بچے کی پیدائش کے بعد اگر لڑکا ہو تو سات سال، اور لڑکی ہو تو نو سال کی عمر تک ماں کے پاس رہیں گے اور اس کی پرورش کا خرچہ (جب تک وہ بچہ اپنی بقاء و نگہداشت کیلئے ماں کی محتاج ہے) بچے کے باپ کے ذمے ہے، اور یہ خرچہ وہ اپنے مالی معیار کے مطابق دینے کا پابند ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وعلی المولود لهٗ رزقھن وکسوتھن بالمعروف۔

ترجمہ:''اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے، (البقرۃ:233)''۔

(وتستحق)المحاضنة(اجرة المحضانة اذالم تكن منكوحة ولا معتدة)لابيه۔

ترجمہ:''بچے کی پرورش کرنے والی (ماں) اجرتِ حضانت کی حق دار ہے،بشرطیکہ نہ وہ کسی شخص کے نکاح میں ہواور نہ ہی اس (زیرنگہداشت) بچے کے باپ کی عدت (طلاق) میں ہو ،(جلدنمبر 5،ص: 209 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔

طلاقِ بائن

سوال: 113

میرے شوہر نے مجھے دومرتبہ یہ کہا کہ میں نے تجھے آزادکیا،ابھی جب یہ مجھے چھوڑ کر گئےتو دوبارہ یہی الفاظ دہرائے وہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ استعمال نہیں کئے اس صورت میں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے برائے مہربانی آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ دے دیجئے،(شہلاظفر،R-822بلاک 14فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو قال اعتقتك طلقت بالنية كذا فی معراج الدراية۔

ترجمہ:''اوراگر(خاوند) نے اپنی بیوی سے کہا:''میں نے تجھے آزادکیا''،اگر(یہ کلمات اداکرتے وقت)ان کی نیت طلاق کی تھی،تو ایک طلاق واقع ہوجائیگی،جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1ص: 376 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

یہ طلاقِ بائن کا کلمہ ہےاوراس کا دارومدار نیت پر ہے،عام فقہی قاعدہ یہ ہے کہ بائن

،بائن کولاحق نہیں ہوتی ہے،لیکن اگر ثانی کو اوّل کی خبر بنانا ممکن ہوتو ،ثانی سے اوّل ہی مراد ہوتی ہے،چونکہ شوہر نے ''میں نے تجھے آزاد کیا'' کا کلمہ دو مرتبہ متصلاً کہا ہے، اس لئے اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی ،اس کے بعد جب دوبارہ آپ کو چھوڑ کر جاتے وقت یہی کلمہ اگر عدت کے اندر طلاق کی نیت سے کہا ہے،تو اس سے دوسری طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

اذا امکن جعلہ اخبارا عن الاول کانت بائن بائنٌ او ابنتك بتطلیقة فلا یقع لانہ اخبارٌ فلا ضرورة فی جعلہ انشاء بخلاف ابنتك باخری او انت طالق بائنٌ۔

ترجمہ:''طلاق بائن کو (دوسری) بائن لاحق نہیں ہوتی ،جبکہ دوسری کو پہلی کی حکایت وخبر قرار دینا درست ہو، جیسے شوہر یوں کہے،تو بائن ہے، بائن ہے یا یہ کہے کہ میں نے تجھے ایک طلاق بائن دی تو یہ دوسری بائن واقع نہیں ہوگی ،کیونکہ یہ پہلی ہی کی حکایت وخبر ہے۔تو اسے انشاء یعنی نئی طلاق قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر وہ کوئی ایسے کلمات کہہ دے،جنہیں پہلی کی خبر قرار دینا ممکن نہ ہوتو وہ دوسری طلاق شمار ہوگی ،جیسے یوں کہے کہ: ''میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی،(ردالمحتار علی الدرالمختار،ج4ص:409-408،داراحیاءالتراث العربي، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا یلحق البائن البائن بان قال لها انت بائن ثم قال لها انت بائن لا یقع الا طلقة واحدة بائنة لانہٗ یمکن جعلہ خبراعن الاول.

ترجمہ:''طلاق بائن ،بائن کولاحق نہیں ہوتی ،مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا تو بائن

ہے، پھر اس سے کہا تو بائن ہے، تو اس سے ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ دوسری کو پہلی کی حکایت وخبر قرار دینا ممکن ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج 1 ص: 377 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

اور اگر شوہر کی نیت طلاق کی نہیں تو یہ کلمات لغو ہوں گے اور کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن اگر طلاق دیتے وقت شوہر کی نیت طلاق کی تھی، مگر بعد میں وہ منکر ہوگیا، تو قضاءً عدمِ وقوعِ طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

"تم تو میری بیوی نہیں ہو" الفاظِ طلاق نہیں

سوال: 114

میرے شوہر نے آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے جھگڑے کے دوران غصے میں دو تین مرتبہ کہا "تم تو میری بیوی نہیں ہو" اس کے بعد میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارا میرا تعلق صحیح نہیں ہے، انہوں نے کہا: میں نے طلاق کی نیت سے نہیں کہا، آپ سے گزارش ہے کہ جلد میرے مسئلے کا حل کر دیجئے، کہ مجھے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔(ایک دینی بہن، معرفت علامہ جمیل احمد نعیمی)۔

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد واتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف نظر کرنی چاہئے، استفتاء میں درج خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔

ولو قال "توزنِ من نئی" لا یقع ان نوی وھو المختار۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو میری بیوی نہیں ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگر چہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے''۔ لہٰذا نکاح باقی ہے، فتاوٰی عالمگیری جلد 1 ص: 386 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

مسئلہ طلاق

سوال: 115

میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ 7 سال قبل میرے اور شوہر کے بیچ جھگڑا ہو رہا تھا کہ اتنے میں میرے شوہر نے کہا: ''چپ ہو جاؤ ورنہ کچھ بول دوں گا''۔ بولوں ابھی ''طلاق''۔ پھر بولوں! چپ ہو جاؤ، میں نے ان کو چپ کرایا، ہمارے بیچ کوئی طلاق کی بات نہیں چل رہی تھی اور نہ میں نے ان سے کبھی طلاق کا مطالبہ کیا۔ پھر انہوں نے قرآن اٹھایا اور کہا: کہ میں یہ لفظ آئندہ نہیں بولوں گا۔ اس کے تین سال بعد میرے شوہر نے پھر لفظ ''طلاق'' کہا، جھگڑے کے دوران۔ تب بھی کوئی مطالبہ یا کوئی بات طلاق کی نہیں چل رہی تھی، پھر ان سے میں نے کہا کہ ہمارے بیچ نازک رشتہ ہے اور دو بار آپ بول چکے ہیں تو انہوں نے پھر قرآن اٹھایا اور کہا کہ آئندہ یہ لفظ نہیں بولوں گا۔ میں نے یہی سمجھا کہ انہوں نے دو طلاقیں دیں یا دو بار بولا۔ اور ان کو سمجھایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال پھر انہوں نے کچھ مہینے قبل جھگڑے میں کہا کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ اب ہماری ۳ ہو گئی ہیں اور میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں، تو انہوں نے کہا کہ یہ دوسری بار ہے، اس کے بعد میں اپنی امی کے گھر آ گئی۔ پھر میری ان سے فون پر بات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ ''میں نے دے دوں گا'' کہا تھا اور وہ اللہ کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں۔ بہر حال اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے صرف ایک طلاق دی ہے اور

ہم اب بھی میاں بیوی ہیں۔ برائے مہربانی میرا مسئلہ قرآن وسنت کی روشنی میں حل کردیجیے ،تا کہ میں سکون سے رہ سکوں۔ میری آخرت اور دنیا دونوں سرخرو ہو سکیں۔ ایک بات یاد رہے کہ میں نے ان سے ان تینوں موقعوں پر طلاق کی بات یا مطالبہ نہیں کیا، اچانک غصے کی حالت میں وہ یہ نکال دیتے۔ اب وہ یہی کہتے ہیں کہ ایک طلاق ہوئی ہے۔ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دیجیے کہ ہمارا نکاح باقی ہے یا نہیں یا کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں۔ (بشریٰ بنت اقبال، A-492، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں متعدد احتمالات ہیں، جس کی وجہ سے علی التعیین ایک حکم بیان کرنا مشکل ہے،لہٰذا تمام احتمالات میں سے ہر ایک کا حکم حسب ذیل ہے:

پہلی مرتبہ شوہر نے یہ الفاظ کہے ’’بولوں ابھی طلاق‘‘ اور پھر کہا: ’’پھر بولوں‘‘، دوبارہ ’’پھر بولوں‘‘ کہنا اس بات کا قرینہ ہے کہ پہلی بار اس نے طلاق کی نیت کی ہے، لہٰذا ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ تین سال کے بعد جب دوبارہ شوہر نے لفظ طلاق بولا تو اس صورت میں بھی اگر اس نے یہ لفظ اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے بولا ہے تو ایک اور طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔ اور شوہر کا یہ کہنا ’’ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے‘‘ بظاہر اس بات پر قرینہ ہے کہ مذکورہ لفظ طلاق بہ نیت طلاق زوجہ کہا ہے۔ لہٰذا مذکورہ خاتون کو ایک اور طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔ شوہر کا یہ کہنا کہ طلاقِ رجعی کے بعد رجوع کرلیا جائے، تو وہ طلاق کالعدم ہو جاتی ہے، درست نہیں ہے، بلکہ وہ آئندہ طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے بدستور مؤثر رہتی ہے، تاہم دو طلاقِ رجعی کے بعد شوہر کو پھر بھی رجوع کا حق حاصل رہتا ہے۔ شوہر نے جب تیسری بار ’’میں تجھے طلاق دیتا ہوں‘‘ کے الفاظ کہے تو اب یہ طلاق پچھلی دو طلاقوں کے ساتھ مل کر تین

طلاقیں ہو جائیں گی۔لیکن اگر شوہر کہتا ہے کہ میں نے ''طلاق دے دوں گا'' کے الفاظ کہے تھے،تو بیوی سے گواہ طلب کیے جائیں گے،اگر گواہوں سے ثابت ہو جائے تو تیسری طلاق کا حکم لگا دیا جائے گا اور بیوی شوہر کے لئے حرام ہو جائے گی ورنہ شوہر کے انکار کی صورت میں قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا اور اس صورت میں نکاح قائم رہے گا۔

مشروط طلاق

سوال: 116

میں نے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے شوہر سید محمد طارق کو طلاق دینے کا نوٹس دیا تھا اور اس نوٹس کے جواب میں انہوں نے ایک خط تحریر کر کے روانہ کیا جس کی نقل منسلک ہے یہ خط مجھے 11 اگست 2006ء کو ملا۔اس خط میں ایک طلاق کا ذکر ہے میں گذشتہ دو سال سے والدین کے ساتھ مقیم ہوں اور اس خط کے موصول ہونے کے بعد بھی اُس مقررہ تاریخ پر یا اس کے بعد شوہر کے گھر نہیں گئی اور تا حال والدین کے گھر میں رہ رہی ہوں،خط کی تحریر مندرجہ ذیل ہے:

ڈیئر ریشماں !السلام علیکم!

تم ایک طویل عرصے سے میکے میں بیٹھی ہو اور میرے بار بار بلانے پر بھی واپس نہ آئی اب میں تم کو حتمی طور پر کہتا ہوں کہ 14 اگست 2006ء یومِ آزادی کے دن دوپہر بارہ بجے تک واپس آجاؤ ورنہ تم پر میری جانب سے پہلی طلاق نافذ ہو جائے گی اور اسی دن سے عدت شروع ہو جائے گی، دورانِ عدت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو آسکتی ہو وہ رجوع سمجھا جائے گا،ورنہ عدت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہو جائے گی،خیر اندیش طارق۔

مہربانی فرما کر اس خط کی شرعی حیثیت پر فتویٰ صادر فرمائیں۔

۱۔ کتنی مدت تک مجھے انتظار کرنا ہوگا کہ طلاق مکمل ہو جائے؟

۲۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور نوکری کرتی ہوں لہٰذا اس مدت کے دوران تو کوئی عدت نہیں کیونکہ مجھے نوکری پر جانا ضروری ہے۔

۳۔ اگر خاص مدت کے بعد خود بخود طلاق ہو جاتی ہے تو میرے پاس تو کوئی تحریر نہیں ہے کہ مجھے مکمل طلاق ہوگئی ہے شوہر کی جانب سے مکمل طلاق کی تحریر کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟۔ (ریشماں صدیقی، A-33/9 دستگیر سوسائٹی فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائلہ ریشماں صدیقی کا بیان درست ہے، تو ان کے شوہر نے انہیں ایک مشروط طلاق دی تھی کہ اگر وہ 14، اگست 2006ء (یوم آزادی) کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس چلی گئیں تو فبھا، ورنہ ایک طلاق واقع ہو جائے گی، اور وہ 14، اگست 2006ء کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس نہیں گئیں، لہٰذا شرط کے مفقود ہونے پر یہ طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ دوسری بات جو شوہر (طارق) نے خط میں اپنی بیوی (ریشماں صدیقی) کو لکھی، یہ ہے کہ: "دورانِ عدّت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو، آسکتی ہو، وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدّت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہو جائے گی"۔ سائلہ چونکہ 14، اگست 2006ء بارہ بجے دوپہر تک شوہر کے ہاں نہیں گئی، پس اس بنا پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی اور اسی تاریخ سے عدّت بھی شروع ہوگئی، عدّت شروع ہونے کے لئے کسی نیت یا خاص عمل کی ضرورت نہیں ہے، طلاق کے بعد عدّت از خود شروع ہو جاتی ہے۔

پھر دورانِ عدّت نہ تو شوہر نے رجوع کیا اور نہ ہی بیوی خود شوہر کے پاس گئی، کیونکہ شوہر نے دورانِ عدّت اس کے واپس آجانے پر رجوع کو معلّق و مشروط کیا تھا۔لہٰذا عدّت کے گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہوگئی۔اب یہ خاتون (ریشماں صدیقی) باہمی رضامندی سے اپنے سابق شوہر کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے اور کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھی۔سابق شوہر کے ساتھ نکاح کی صورت میں خدانخواستہ اگر اس نے دوبارہ ایک یا دو طلاقیں دیں،تو تجدیدِ نکاح کے باوجود یہ پہلی طلاق ان کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہے گی،یعنی نکاحِ ثانی کے بعد اگر اس نے ایک طلاق دی،تو وہ اس پہلی طلاق کے ساتھ مل کر دو ہو جائیں گی اور اگر دو طلاقیں دیں تو وہ اس پہلی کے ساتھ مل کر تین ہو جائیں گی۔شرعی تقاضوں کے مطابق شوہر کا یہ خط ثبوتِ طلاق کے لئے کافی ہے، قانونی کارروائی اور طلاق کی توثیق کے لئے یو۔سی ناظم سے رجوع کریں۔

طلاقِ معلّق بالشرط

سوال: 117

گذشتہ چند ماہ سے گھریلو جھگڑے کی وجہ سے میری بیوی اپنے والدین کے گھر گئی ہوئی تھی، میں کئی مرتبہ لینے گیا لیکن بے سود رہا۔فون پر بات ہوئی، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر مُصر رہی، میں نے کہا کہ طلاق لکھ کر بھیج دوں؟، پھر ماں باپ کے پاس بیٹھی رہوگی۔اس نے جواباً کہا کہ میں پوری زندگی آپ کے ساتھ رہوں گی طلاق مجھے قطعاً نہیں چاہئے لیکن میری شرائط وہی ہیں۔شرائط سے اس کی مراد یہ ہے کہ میں اس کے والدین اور بھائیوں کے ماتحت رہوں اور گھر میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو۔جب کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی تو بقائمی ہوش وحواس اور

طبیعت میں سختی کے ساتھ طلاق دینے کی نیت سے میں نے یہ الفاظ کہے ''تین قبول کر''،اس کے بعد (میں نے غالبًا)،''طلاق قبول کرلو'' کے الفاظ کہے اور پھر میں نے فون بند کردیا۔ان الفاظ کی ادائی کے دوران بھی وہ اپنی بات پر بضد رہی شاید میری بات پر توجہ بھی نہیں دی اور میرے کہے ہوئے الفاظ شاید اس نے نہیں سنے اور میں نے اپنی بات کہہ کرفون بند کردیا۔گھر آکر میں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ میں نے اسے فارغ کردیا ہے،طلاق دے دی ہے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟،اگر ہوگئیں تو کتنی؟،(معرفت:سید مختار حسین شاہ،امام مسجد محلّہ جدون آباد،ہری پور،ہزارہ صوبہ سرحد)۔

جواب :

شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے یہ کہنا کہ: ''تین قبول کر''۔یہ طلاق کنایہ کے الفاظ ہیں اور چونکہ نیت طلاق موجود ہے،اس لئے تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔اب تحلیل شرعی کے بغیر عدّت کے اندر اور عدّت کے بعد دونوں کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ولو قال لھا: ثلاثہ دہ ونوی الطلاق،یقع۔

ترجمہ:''شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے کہا: تجھے تین دیئے،تو طلاق واقع ہوجائے گی،(فتاوی عالمگیری،جلد:1،ص:380)''۔

خلع

سوال: 118

عرض ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز کی بیٹی کا نکاح تقریبًا ایک سال پہلے ہوا تھا اور ایک سال کے بعد رخصتی ہونا تھی لہٰذا گھریلو طور پر عورتوں میں کافی اختلافات

WWW.NAFSEISLAM.COM

پڑ گئے جس کی وجہ سے خلع تک نوبت آ گئی لہٰذا اب کوئی صورت بات بنتی نظر نہیں آ رہی لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ خلع کی صورت میں شرعی کیا پہلو ہیں؟۔(حنیف شیخ بلالی،کراچی)۔

جواب:

خلع زوجین کی رضامندی سے ہوتا ہے،یعنی بیوی کچھ مال دے کر خلع حاصل کرے یا مطالبہ مہر سے دستبردار ہو جائے،اس سے طلاق بائن ہو جاتی ہے۔مال کے بدلے نکاح زائل کرنے کو خلع کہتے ہیں۔خلع میں عورت کا قبول کرنا شرط ہے اور اس کے الفاظ معین ہیں ان الفاظ کے علاوہ اور لفظوں سے خلع نہ ہوگا۔خلع ایک طلاق بائن کے درجے میں ہوتا ہے۔صورتِ مسئولہ میں اگر زوجین خلع پر رضامند ہو جاتے ہیں تو چونکہ رخصتی تا حال نہیں ہوئی اور عورت غیر مدخولہ ہے لہٰذا اس پر عدت نہیں ہے۔

زوجِ مفقود الخبر

سوال: 119

میرے خاوند فاروق قیصر کوٹ لکھپت جیل لاہور میں بطور کانسٹیبل کام کرتے تھے۔1994 میں وہ صبح گھر سے اپنی ڈیوٹی پر گئے،گھر سے نکلتے ہی کچھ لوگوں نے انہیں اغوا کرلیا،شام تک میرے خاوند گھر واپس نہیں آئے تو ہم نے ان کے آفس (جیل) سے معلوم کیا،تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس دن ڈیوٹی پر نہیں آئے۔ہم نے اس دن ہی ان کی اغوا کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں درج کرادی تھی۔پولیس نے بھی کافی عرصہ اس کسی کی تفتیش کی،مگر آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔آج ان کے اغوا کو گیارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے،لیکن اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔عرض یہ ہے کہ میں اس وقت سے اپنے ضعیف والدین کے ساتھ رہ رہی ہوں،میرے تین

بچے ہیں، میرے والدین میری اور میرے بچوں کی اس دن سے کفالت کر رہے ہیں۔میرے والدین کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ دراصل میں اپنا اب گھر بسانا چاہتی ہوں تا کہ باقی ماندہ زندگی باعزت اور شرعی طور پر گزرے۔میرے میکے والے بھی مجھے قبول نہیں کر رہے ہیں۔اور نہ میری کفالت کرنے کو تیار ہیں۔ان تمام حالات کے مدنظر میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تا کہ میں اپنا گھر بسا سکوں۔ان حالات کے تحت کیا میں دوسری شادی کر سکتی ہوں یا نہیں۔آپ سے درخواست ہے کہ میرے اس مسئلے کا حل بتایا جائے اور اس سلسلے میں ہماری شریعت کیا کہتی ہے، اور شریعت کی ہی رو سے فتویٰ دیا جائے۔(نسیم فاروق،مکان نمبر 586/16فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

خاوند کے لاپتہ (مفقو دالخبر)ہونے کی صورت میں امام ابو حنیفہ کا موقف:

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں کہ:

واذاتم له مأة وعشرون سنة من يوم ولد حكمنا بموته وهذه رواية الحسن عن ابى حنيفة وفي ظاهر المذهب يقدر بموت الاقران وفي المروى عن ابى يوسف بمأة سنة وقدره بعضهم بتسعين والاقيس ان لا يقدر بشئى والارفق ان يقدر بتسعين واذا حكم بموته اعتدت امرأته عدة الوفات من ذالك الوقت وقسم ماله بين ورثة الموجودين۔

ترجمہ:’’امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جب مفقو د(لاپتہ) کی زندگی کے ایک سو بیس سال پورے ہو جائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا اور ظاہر مذہب یہ ہے کہ جب اس کے تمام معاصرین فوت ہو جائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا۔امام ابو

یوسف سے نوے سال کی روایت ہے: بعض مشائخِ حنفیہ نے بھی 90 سال مقرر کئے ہیں، زیادہ قیاس یہ ہے کہ وقت مقرر نہ کیا جائے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ 90 سال مدت مقرر کی جائے اور جب اس کو مردہ قرار دے دیا جائے گا تو اس کی بیوی عدتِ وفات گزارے گی اور اس کا ترکہ وارثوں میں تقسیم کردیا جائے گا، (ہدایہ اولین ص: 598، کتاب المفقود)"۔

امام ابوالحسن لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ لاپتا شخص کا نکاح یقین سے ثابت اور معروف ہے، اور غائب ہوجانا تفریق کو واجب نہیں کرتا اور اس کی موت مشکوک ہے اور یقین شک سے زائل نہیں ہوتا، اس لئے جب تک اتنی مدت نہ گذر جائے، جس میں اس کی موت کا یقین ہوجائے۔ اس وقت تک اس کو مردہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ اور عرف اور عادت میں ایک آدمی ایک سو بیس سال سے زیادہ نہیں رہتا یا اپنے تمام معاصرین کی موت کے بعد زندہ نہیں رہتا، اس لئے اس مدت کے گذرنے کے بعد اس کو مردہ فرض کرلیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام نے تخفیف کرکے اس مدت کو ستّر سال قرار دیا ہے۔

امام ابو حنیفہ اور مشائخ حنفیہ کی عبارات کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس لاپتا شخص کی بیوی کو اس کی عمر کے ایک سو بیس سال یا تمام معاصرین کی موت تک یا ستّر یا نوے سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا اتنا مال اور ترکہ موجود ہو، جس کو اس کی بیوی ستّر یا نوے سال تک بیٹھ کر کھا سکے۔

سنن دار قطنی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امرأة المفقود امرأته حتی یاتیها البیان "لاپتا شخص کی بیوی اس کی بیوی قرار پائے گی جب تک کہ کوئی وضاحت نہ آجائے یا کوئی خبر نہ آجائے"۔ علامہ ابن

ہمام فرماتے ہیں، اس حدیث کی سند میں محمد بن شرجیل ایک ضعیف راوی ہے۔ ابو حاتم نے کہا یہ شخص حضرت مغیرہ کی طرف منکر اور باطل روایات منسوب کرتا ہے۔ ابن قطان نے کہا اس کا ایک راوی سوار بن معصوب متروکین میں مشہور ہے اور اس سلسلہ میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار اور اقاویل متعارض ہیں۔

خاوند کے لاپتا (مفقود الخبر) ہونے کی صورت میں امام مالک کا موقف:

علامہ ابن سحنون مالکی نے امام مالک سے پوچھا آیا مفقود کی بیوی امام مالک کے قول کے مطابق حاکم کی اجازت کے بغیر بھی چار سال عدت گذار سکتی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں! امام مالک نے فرمایا: اگر مفقود کی بیوی بیس سال بھی انتظار کرتی رہے، اس کے بعد حاکم کے پاس اپنا مقدمہ پیش کرے تو حاکم اس میں غور وفکر کرے اور جس جگہ وہ شخص گیا تھا، وہاں اس کی تفتیش کرے اور جب اس کا پتا نہ چل سکے اور وہ مایوس ہو جائے تو پھر اس کو چار سال ٹھہرنے کا حکم دے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ چار سال ٹھہرنے کے بعد چار ماہ دس دن عدت گذارنے کے لئے بھی حاکم کی اجازت ضروری ہے یا وہ یہ مدت از خود بھی گذار سکتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہاں اس کی عدت وفات کے ساتھ حاکم کا کیا تعلق ہے؟ سحنون از ابن القاسم از امام مالک از یحیٰی بن سعید از سعید بن مسیّب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا جس عورت کا شوہر لاپتا ہو جائے، وہ چار سال انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن عدت وفات گذارے اس کے بعد وہ نکاح کے لئے حلال ہو جائے گی۔

۶ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ کو مفتی المالکیہ شیخ الجامع الازہر نے گیارہ معاشرتی مسائل میں امام مالک کے مذہب کی نصوص پر مشتمل ایک فتویٰ جاری کیا، جس کی جامع ازہر کے تمام علماء نے تصدیق کی ہے جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں۔ اس فتویٰ کو مصر کی

وزارتِ اوقاف نے فتاویٰ اسلامیہ میں شائع کیا ہے۔اس فتویٰ سے پہلے علماءِ ازہر نے فقہ حنفی سے اس پر تصریحات پیش کی ہیں کہ ضرورت کے وقت دوسرے مذہب پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صدرالا فاضل علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ "فتاویٰ امجدیہ" کے حاشیے میں، جو یا تو ان کا اپنا املا کرایا ہوا ہے اور یا ان کے تلمیذ رشید اور نائب خصوصی، مفتی اعظم ھند علامہ محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تحریر کردہ ہے: لیکن اگر شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے عورت دوسری شادی پر اتنی مجبور ہو جائے کہ دوسرا کوئی چارۂ کار نہ ہو حالتِ ملجیئہ پیدا ہو جائے تو مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ پر عمل کرنے کی اجازت ہمارے علماء نے بھی دی ہے۔خصوصاً اس دور پرفتن میں ہمارے علماء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس خصوص میں امام مالک رضی اللہ عنہ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، مگر اس خصوص میں چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں، اول یہ کہ مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ یہ نہیں کہ شوہر کے غائب ہونے کے دن سے چار سال گزار کر شوہر کی وفات کا حکم دیا جائے، بلکہ یومِ قضاء (یعنی جس دن قاضی لاپتا شوہر کی موت کا حکم لگائے) سے چار سال انتظار کرنا ضروری ہے، جیسا کہ فتاویٰ رضویہ ج ۵،ص ۵۰۰ پر کتاب مُدَوَّنہ کے حوالے سے مذکور ہے، دوسرے یہ کہ اس کے لئے قضائے قاضی شرط ہے ،درمختار میں ہے: انما یحکم بموتہ بقضاءٍ لانہ امر محتمل فمالم ینضم الیہ القضاء لایکون حجۃ۔

ترجمہ: شوہر کی موت کا حکم قضائے قاضی سے دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو دوسری جہت (زندگی) کا بھی احتمال رکھتا ہے، تو جب تک اس کے ساتھ قاضی کا فیصلہ نہیں ملے گا، یہ حجت نہیں ہوگا، (جلد:۳،ص:۳۳۱، کتاب المفقود ،

نعمانیہ)''۔اس زمانے میں جب کہ یہاں حاکم اسلام نہیں، علمائے بلد، جو مرجع فتویٰ ہوں، اس خصوص میں قاضی کے قائم مقام ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ امجدیہ دوم، ص: 91 مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)''۔

مختصر یہ کہ انتہائی مجبوری کی حالت میں جب عورت کے لئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہو جائے، اسے خدشہ ہو کہ بشری کمزوری کی بناء پر وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گی، تو ایسے موقع پر امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے یا قاضی فیصلہ دے سکتا ہے۔ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات 1095 تا 1120 میں اس مسئلے پر مفصل و مدلّل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ آثارِ صحابہ بھی اس سلسلے میں موجود ہیں اور چونکہ امام اعظم ابو حنیفہ نے اثرِ صحابہ کو اپنی اجتہادی رائے پر ترجیح دی ہے، اس لئے التزاماً مذہبِ حنفی کے مطابق بھی کہا جا سکتا ہے اور جیسا کہ امام مالک کے قول سے ثابت ہے اور صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ وہ عورت جس کا خاوند مفقود الخبر (لاپتا) ہے، جب عدالت سے رجوع کرے گی، تو قاضی اس کی تلاش کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے باوجود لاپتا رہنے پر اس کی وفات کا حکم دے گا اور اس وقت سے وہ عورت چار سال اور عدت وفات گزارنے کے بعد کسی دوسرے شخص سے عقد کر سکے گی۔

علامہ سعیدی نے اس امکانی صورت پر بھی بحث کی ہے کہ اگر ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد عورت کسی شخص سے نکاح کر لیتی ہے اور پھر تقدیرِ الٰہی سے وہ شخص واپس آ موجود ہوتا ہے، تو کیا کیا جائے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''جب مفقود لوٹ آئے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ زندہ ہے اور ابھی دوسرے شخص نے اس سے مقاربت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کو مفقود کے زندہ ہونے کا پہلے علم تھا، تو اب یہ مفقود کی زوجہ ہے، خواہ عقد

نکاح ہو چکا ہو،اور اگر دوسرے شوہر کومفقود کی حیات کا علم تھا تو اس نے مقاربت کی ہو یا نہ کی ہو مفقود کے لوٹ آنے کے بعد وہ مفقود کی بیوی ہوگی ،اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مفقود، دورانِ عدت فوت ہوا ہے یا عدت کے بعد دوسرے نکاح سے پہلے فوت ہوا ہے یا عقد کے بعد مقاربت سے پہلے فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہوسکتی ہے اور اگر مقاربت کے بعد فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہوسکتی ہے اور اگر مقاربت کے بعد فوت ہوا ہے درآں حالیکہ دوسرے شوہر کو اس کی حیات کا علم نہیں تھا تو اب یہ وارث نہیں ہوگی۔(شرح صحیح مسلم جلد ثالث ص: 1107 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)"۔

تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

سوال: 120

میری بیوی اور میرے درمیان کچھ اختلافات ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی ،تقریباً عرصہ دس ماہ گذر جانے کے بعد میں نے کافی اثر ورسوخ استعمال کیا،لیکن کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔اس کے بعد میں وکیل کے پاس چلا گیا، اپنا قصہ سنایا اور پھر اس کو طلاق کا نوٹس تیار کرنے کو کہا۔ وکیل نے تین طلاق کا نوٹس تیار کر دیا اور میں نے طلاق نوٹس کی ایک کاپی سسرال والوں کے پتہ پر بھیج دی۔اور ایک کاپی یونین کونسل کے پتا پر روانہ کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں کاپیاں الگ الگ مجھے مل گئیں، جو وصول نہ ہوئی تھیں، اور نہ ہی ان پر دستخط موجود تھے، اس کے بعد میں نے ایک جرگہ بٹھایا اور پوچھا کہ آپ کو میری طرف سے طلاق کا نوٹس ملا کہ نہیں، جس پر سسرال والوں نے جواب دیا کہ نہیں ملا۔اور میں نے طلاق کا نوٹس مورخہ 26 اپریل 2005ء کو دیا تھا اور ابھی تقریباً چھ ماہ ہو چکے

ہیں۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا طلاق ہوگئی ہے یا نہیں ہوئی؟ مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے، میرے دو بچے ہیں، اور میری بیوی بھی دوبارہ میرے ساتھ بخوشی زندگی گذارنا چاہتی ہے، کیا طلاق مؤثر ہے یا غیرمؤثر؟۔(محمد یعقوب، تحصیل حاصل پور ضلع بہاولپور)۔

جواب:

کتب فتاویٰ میں یہ مسئلہ درج ہے کہ اگر کسی شخص نے کاتب یا وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو اور اس نے لکھ دی تو طلاق واقع ہوجائے گی، جیسا کہ فتاویٰ شامی میں ہے: ولو قال للکاتب: اکتب طلاق امرأتی کان اقرارا بالطلاق وان لم یکتب۔

ترجمہ: ''اور اگر اس (شوہر) نے کاتب سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو تو یہ طلاق کا اقرار ہے، خواہ کاتب نے لکھا نہ ہو (تب بھی طلاق واقع ہوجائے گی)، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج4 ص: 337 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)''۔

چونکہ آپ نے اپنی مرضی سے وثیقہ نویس سے اپنی بیوی کے نام تین طلاقیں لکھوائیں اور اس طلاق نامے پر دستخط کردیے، تو اسی وقت طلاق واقع ہوگئی، طلاق کے مؤثر ہونے کے لئے بیوی کو تحریری طلاق نامے کا ملنا ضروری نہیں ہے، جس وقت طلاق نامے پر دستخط ہوئے، اسی وقت سے عدت بھی شروع ہوگئی، اب آپ کا اپنی بیوی سے کوئی تعلق باقی نہیں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

طلاقِ مغلظہ کے بعد تعلقات

سوال: 121

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ ایک میرے قابلِ احترام بنام مولانا علامہ فتح محمد ولد نظام دین ساکن نئی آبادی کھرالہ تحصیل وضلع جہلم کے رہائشی نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں، دوسری شادی 1982ء کو ہوئی تھی۔اس عورت کو کچہری میں جا کر 50 روپے والے اسٹامپ پیپر پر لفظ طلاق۔طلاق۔طلاق لکھ کر (جس طلاق نامے کی فوٹو کاپی ساتھ ارسالِ خدمت ہے) طلاق دے دی اور بمطابق قانونِ پاکستان ایک طلاق نامہ جو کہ اصل تھا، مطلقہ بیوی کو ارسال کر دی۔اب جس عورت کو طلاق دی گئی ہے، وہ عورت طلاق نامہ وصول کرنے سے انکاری ہے اور محترم طلاق دینے والے بزرگوار ماشاءاللہ دینِ خداوندی پر عبور حاصل ہے دونوں یہ کہتے ہیں کہ طلاق اگر وصول نہ کی جائے تو طلاق نہیں ہوتی اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں اور ایک ہی جگہ پر رہائش پذیر ہیں۔

جناب عالی! اسلام کی روح سے ان قابلِ احترام بزرگوار کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس طلاق شدہ عورت کے بارے میں کیا احکاماتِ خداوند ہیں، جناب فتویٰ صادر فرمایا جائے تاکہ باقی اس گھر میں رہنے والے فریق خدا کے غضب سے بچ سکیں، (شاہد محمود ولد مولانا فتح محمد، نئی آبادی کھرالہ تحصیل وضلع جہلم)۔

جواب:

ہمیں مذکورہ بالا استفتاء کے ساتھ شوہر کا اسٹامپ پیپر تحریری طلاق نامہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی منسلک کر کے ارسال کی گئی ہے جس پر شوہر فتح محمد صاحب اور دو گواہوں محمد ناصر اور حافظ سجاد حیدر کے دستخط بھی ثبت ہیں اور سید صفات احمد شاہ (

اوتھ کمشنر) نے اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ اس کی توثیق کی ہے ،لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ شوہر نے اپنی بیوی کا نام لے کر تین دفعہ طلاق ،طلاق ،طلاق کہہ کر طلاق دے دی ہے، اس لئے طلاق واقع ہوگئی۔ وقوع طلاق کے لئے بیوی کا طلاق نامے کو وصول کرنا ضروری نہیں ہے، بس جس وقت شوہر نے طلاق نامے پر دستخط کئے، طلاق اسی وقت سے مؤثر ہوگئی اور عدت بھی شروع ہوگئی اور طلاق مغلظہ ہونے کی بنا پر ان کا عدت کے اندر یا عدت کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، تاہم یہ مطلّقہ خاتون عدت اسی سابق مُطلِّق شوہر کے مکان میں گذاریں گی ،ایامِ عدت کا نفقہ بھی شوہر کے ذمے ہوگا، لیکن دورانِ عدت بھی اس طلاق دینے والے شوہر اور اس طلاق یافتہ عورت کا آپس میں معاملہ اجنبی والا ہوگا، ستر وحجاب کی پابندی ہوگی ،الگ رہنا ہوگا۔ اس طلاقِ مغلظہ کے بعد ان کا آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے ،زنا کے زمرے میں آئے گا ،انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور اس محلے یا بستی کے لوگوں کو انہیں اس پر متوجہ کرنا چاہئے ،اگر وہ اس کے باوجود باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ (Sociol Boycott) کرنا چاہئے ، البتہ چونکہ مطلّقہ خاتون اسی مُطلِّق شوہر سے صاحب اولاد ہیں ،ان کے پانچ جوان بچے ہیں ،لہٰذا ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اگر وہ یا ان کی اولاد مالی استطاعت رکھتے ہیں تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ الگ مکان میں رہیں ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا ، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، لیکن اگر ان کی اور ان کی اولاد کی اتنی مالی استطاعت نہیں ہے اور سابق طلاق دینے والے شوہر کا مکان اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شرعی ستر وحجاب کی پابندی کو قائم

رکھتے ہوئے اجنبی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور شوہر اپنی اولاد کی ماں ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کی اجازت دیتا ہے تو پھر وہ وہاں اپنی اولاد کے ساتھ رہ سکتی ہیں، لیکن یہ امر واضح رہے کہ شرعاً وہ ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ اجنبی رہیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ثبوتِ طلاق کے طریقے

سوال: 122

میرا نام اسماء بیگم ہے، میرے شوہر محمد حماد نے مختلف مواقع پر مجھے تین طلاقیں دیں ان الفاظ کے ساتھ ''میں نے تمہیں طلاق دی'' اور طلاق کا کوئی گواہ نہیں ہے، اب میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہتا ہے، اس بارے میں مجھے آپ اپنے فیصلے سے نوازیں، (اسماء بنت محمد امین شیخ ، L-505 سیکٹر 5/B-2 نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو جو تین طلاقیں دی ہیں، وہ مؤثر ہیں اور دیانۃً طلاق اسی وقت سے واقع ہوگئی اور آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر نے جو تین طلاقیں دی ہیں تو اس پر کوئی گواہ نہیں ہے، عنداللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی ، لازم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

دے دے،تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کرسکتی ہے)، (البقرۃ:230)"۔ وقوع طلاق کے بعد آپ کے شوہر کا آپ کو تحلیل شرعی کے بغیر رکھنے کا ارادہ، گناہ پر جسارت ہے اور ایک گونہ اس پر اپنے قلبی اطمینان کا اظہار ہے۔

لیکن قضاء یعنی دنیوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق طلاق کی مُدّعیہ ہے مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

عن عمرو بن شعیب، عن ابیه، عن جده: ان النبی ﷺ قال فی خطبته:

"البیّنه علی المُدّعی والیمین علی المدعی علیه"۔

ترجمہ: "عمرابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1339)"۔

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی

بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ گنہگار رہے،اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا،اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

طلاق غیر مدخولہ

سوال: 123

میرا نکاح ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء میں فرقان احمد خان کے ساتھ ہوا تھا،میرا نام عائشہ حیدر خان ہے فرقان احمد خان جو کہ میرے شوہر تھے،انہوں نے اپنی والدہ کے دباؤ میں آکر مجھے طلاق کا نوٹس بھجوادیا ہے،جس میں تین بار طلاق کا لکھا ہوا ہے،اور ان کے دستخط ہیں،میری رخصتی نہیں ہوئی تھی،میں اپنے گھر میں ہی ہوں اور وہ اپنے گھر میں اب آپ مجھے اس کا فتویٰ دے دیجئے کہ آیا میرا نکاح فرقان احمد خان سے دوبارہ ہوسکتا ہے؟اور اس کی کیا مدت ہے؟اور پرانا نکاح ابھی تک برقرار ہے یا نہیں؟اور میں نے اپنے نکاح کا مہر بھی نہیں لیا ہے،اس صورت میں کیا طریقہ ہے؟قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیجئے،(عائشہ حیدر،R-770/16 ایف بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:اذا طلق الرجل امراتہ ثلاثا قبل الدخول بھا وقعن علیھا فان فرق الطلاق بانت بالاولیٰ ولم تقع الثانیۃ و الثالثۃ۔

ترجمہ:”اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہوجاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاق بائن ہوجائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی،(عالمگیری جلداول

ص:373)"۔

صورت مسئولہ میں برتقدیرِ صدقِ سائلہ چونکہ ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی اور خلوت صحیحہ (دونوں میاں بیوی کا تنہائی میں جمع ہونا) بھی نہیں پایا گیا اور شوہر نے تین طلاق (منسلکہ طلاق نامہ میں) علیحدہ علیحدہ دی ہیں بالہذا پہلی طلاق سے ہی نکاح ختم ہوگیا اور دوسری دوطلاقیں واقع نہیں ہوں گی،اس لئے کہ غیرمدخولہ (جس کے ساتھ مباشرت نہ کی گئی ہو) کوطلاقِ رجعی نہیں ہوتی بلکہ ایک طلاق دینے سے بھی بائن ہوجاتی ہےاورطلاق بائن دینے کےبعدوہ عورت محلِ طلاق نہیں رہتی،اس لئے طلاق کے دوسرے الفاظ لغوہوجاتے ہیں،اس صورت میں یہ شوہر دوبارہ نکاح کرسکتا ہے، عدت اور تحلیلِ شرعی کی ضرورت نہیں۔اللہ تعالیٰ کاقرآن مجید میں ارشادہے:یاایھا الذین امنوا اذانکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن فمالکم علیھن من عدۃ تعتدّونھا ج

ترجمہ:"اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو،پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو،تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں،جسے تم شمار کرو،(الاحزاب: 49)"۔

مگر پہلے والے نکاح میں جومہر مقرر ہوا تھا،شوہر پر واجب ہے کہ آدھامہر عورت کوادا کرے،اللہ تعالیٰ کاقرآن مجید میں ارشادہے:

وان طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن وقد فرضتم لھن فریضۃ فنصف مافرضتم۔

ترجمہ:"اوراگرتم نےعورتوں کوچھونے سے پہلے طلاق دے دی،اورتم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے،تو جومقرر ہوا تھا،اس کا آدھا (واجب) ہے،(البقرۃ:237)"۔

تحلیلِ شرعی کے لئے شخصِ غیر کی قید

سوال : 124

میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے میں پھر اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور حلالہ کرنا چاہتا ہوں حلالہ غیر مرد کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا میں اس وقت اس کے لئے غیر مرد ہوں کیا یہ کام میں خود کرسکتا ہوں؟۔(انیس محمد،لیاقت آباد،کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ:”پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دی،تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے،تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں،(البقرۃ:230)“۔

تحلیلِ شرعی کے لئے آیت میں”غیرہ“ ”ہٗ“ ضمیر مذکر ہے،جس سے مراد زوجِ اوّل کے علاوہ دوسرا شخص ہے،آپ حلالے کے متعلق نہ سوچیں۔

حدیث مبارک میں ہے:عن عبداللہ بن مسعود قال: لعن رسول اللہ ﷺ المحلّل والمحلّل لہ۔

ترجمہ:”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر(بشرطِ تحلیل) رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ،(سنن ترمذی رقم الحدیث:1120)“۔

طلاق ہوئی یا نہیں؟

سوال : 125

میرا میری بیوی سے جھگڑا ہو رہا تھا اس دوران اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے طلاق دے دو، میں نے جواب میں کہا کہ ''تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا''۔میں حلفیہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے یہی الفاظ کہے تھے،اور میں نے آئندہ کے لئے کہا تھا فی الحال میں نے طلاق نہیں دی، جبکہ میری بیوی کہتی ہے کہ اس نے مجھے طلاق دی ہے۔آیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟ ،(عبدالرحیم ،گلستانِ جوہر بلاک 13 کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل شوہر کے الفاظ ''تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا،طلاق دوں گا'' سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔چونکہ آپ کے ادا کردہ تمام الفاظ ارادۂ طلاق کو ظاہر کرتے ہیں اور ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔لہٰذا ان تمام الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں،ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں،اور اگر عورت طلاق کی مُدّعیہ ہے،مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:عن عمرو بن شعیب ، عن ابیہ، عن جدہ: ان النبی ﷺ قال فی خطبتہ : "البیّنہ علی المُدّعی والیمین علی المدعی علیہ"۔

ترجمہ:''عمر بن شعیب اپنے والد سے،وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)"۔ یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

جبری طلاق کی ایک صورت

سوال: 126

ہم نے اپنی بہن کا نکاح ایک جگہ کیا اور سوچا کہ رخصتی کچھ عرصے بعد کریں گے اس رشتے سے ہمارے اور لڑکے کے گھر والے سب خوش تھے، لیکن ہمارے کچھ رشتے دار جنہوں نے اس نکاح سے پہلے ہم سے بہن کا رشتہ مانگا تھا جو ہم نے کسی وجہ سے قبول نہ کیا ان لوگوں کو اس نکاح پر اعتراض تھا انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ نکاح ٹوٹ جائے لڑکی کو اغوا کرنے کی دھمکی بھی دی اور یہ بھی کہا کہ لڑکے کو قتل کردیں گے۔ ان لوگوں نے دس بارہ افراد کا ایک گروپ بنا کر لڑکے کو گھیر لیا اس وقت ان کے پاس ہتھیار بھی تھے جس کے دم پر انہوں نے لڑکے سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروالیا اور کہا کہ اب منہ سے بھی بولو کہ میں نے طلاق دی لڑکے نے انکار کردیا جس پر

انہوں نے مار پیٹ شروع کردی آخر کار لڑکے کے منہ سے بھی بلوالیا، طلاق کے الفاظ یہ تھے، (میں نے علی کوہرو گن کی بیٹی شازیہ کو طلاق، طلاق، طلاق دی)۔ کیونکہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ نہ کہتا تو اسے واقعی قتل کردیا جاتا۔ اب اس طلاق کو نہ تو لڑکا قبول کررہا ہے اور نہ ہی لڑکی، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟۔(وقار احمد وگن، D-33 پی ٹی سی ایل کالونی جناح ہسپتال)۔

جواب:

اصولی طور پر فقہ حنفی میں ''طلاق مکرَہ'' (یعنی جس سے جبراً طلاق دلائی گئی ہو) معتبر ہے، البتہ اگر ''اکراہ تام'' یا ''اکراہ مُلجی'' ہو، یعنی ایسی ضرب شدید جس میں جان یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ ہو، جیسے آج کل بندوق کی نوک (Gun Point) پر دھمکی دی جاتی ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دھمکی پر عمل کرلے گا تو اسے ''اکراہ مُلجی'' یا ''اکراہِ تام'' کہتے ہیں۔ ایسے ''اکراہِ ملجی'' کی صورت میں ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر جبر کرکے تحریراً طلاق لے لی جائے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی، لیکن اگر جبر کرکے زبانی طلاق دلوادی جائے تو وہ مؤثر ہوجائے گی۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی "البحر "أن المراد الاكراه علی التلفظ بالطلاق ، فلو أكره علی أن يكتبَ طلاق امرأته فكتب لا تُطلّق ، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا ، كذا فی "الخانية" ولو أقر بالطلاق كاذباً أو هازلاً وقع قضاءً لا ديانة ۔

ترجمہ: ''اور ''البحر الرائق'' میں ہے کہ ''اکراہ'' سے مراد یہ ہے کہ لفظاً طلاق دینے پر مجبور کردیا گیا ہو، اگر (شوہر) کو مجبور کردیا گیا ہو کہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ دے، پھر اس

نے (بامرمجبوری) لکھ دیا،تو طلاق واقع نہیں ہوگی ، کیونکہ تحریر اس وقت طلاق لفظی کے قائم مقام ہوتی ہے،جب اس کی حاجت ہو اور یہاں اسے حاجت نہیں ہے، (کیوں کہ وہ خود اپنی مرضی سے طلاق نہیں دینا چاہتا)،"خانیہ" میں اسی طرح ہے،اور اگر شوہر نے (اپنی بیوی کو) جھوٹ کے طور پر یا بطورِ مذاق طلاق دینے کا اقرار کیا،تو طلاق قضاءً واقع ہو جائے گی (یعنی اگر معاملہ عدالت میں گیا تو عدالت وقوع طلاق کا فیصلہ دے گی ،کیوں کہ عدالتوں میں معاملات کا فیصلہ ظاہری قرائن وشواہد پر ہوتا ہے،نیتوں پر نہیں ہوتا، جب کہ عنداللہ نیت کا اعتبار ہوگا)، (مگر) دیانۃً نہیں ہوگی ،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد: 4،ص: 324 داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: کہ ایک شخص نے کسی کے جبر وظلم سے محض ناچار و مجبور ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاقنامہ لکھ دیا تو اس صورت میں طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

آپ نے جواب میں لکھا کہ: طلاق بخوشی دی جائے خواہ بجبر ، واقع ہو جائے گی ۔نکاح شیشہ ہے اور طلاق سنگ ،شیشہ پر پتھر خوشی سے پھینکے یا جبر سے یا خود ہاتھ سے چھوٹ پڑے شیشہ ہر طرح ٹوٹ جائے گا،مگر یہ زبان سے الفاظ کہنے میں ہے، اگر کسی کے جبر و اکراہ سے عورت کو خطرہ میں طلاق لکھی یا طلاق نامہ لکھ دیا اور زبان سے الفاظِ طلاق نہ کہے تو طلاق نہ پڑے گی۔تنویر الابصار میں ہے: ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرَھا او مُخطئا وفی ردالمحتار عن البحر ان المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق، فلو أُکرہ علی أن یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق، لأن الکتابۃ أقیمت مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا۔

ترجمہ:"ہر عاقل بالغ خاوند کی طلاق نافذ ہو جائے گی اگر چہ اسے مجبور کیا گیا ہو یا غلطی

سے طلاق دے دی، اور ردالمحتار میں بحر سے منقول ہے کہ جبر سے مراد لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو، اور اگر اس کو اپنی بیوی کو طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا تو اس نے مجبور ہو کر لکھ دی تو طلاق نہ ہوگی، کیونکہ کتابت کو تلفظ کے قائم مقام محض حاجت کی بناء پر کیا گیا ہے اور یہاں خاوند کو حاجت نہیں ہے"۔ مگر یہ سب اس صورت میں جبکہ اکراہ شرعی ہو کہ اسے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو اور وہ ایذا پر قادر ہو، صرف اس قدر کہ اس (مُکرِہ) نے اپنے سخت اصرار سے مجبور کر دیا اور اس کے لحاظ پاس سے اسے لکھتے بنی ، اکراہ کے لئے کافی نہیں، یوں لکھے گا تو طلاق ہو جائے گی، کما لا یخفی (جیسا کہ ظاہر ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد: 12، ص: 385، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

صورتِ مسئولہ میں اگر شوہر نے جبر کی بنا پر صرف تحریری طلاق پر اکتفا کی ہوتی تو طلاق واقع نہ ہوتی اور ان کا نکاح بدستور قائم رہتا، لیکن چونکہ لفظاً بھی طلاق دے دی ہے، لہٰذا فقہ حنفی کی رو سے طلاق واقع ہو گئی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا طلق الرجلُ امرأتَه ثلاثا قبل الدخول بها وقعن عليها فان فرق الطلاق بانت بالاولى ولم تقع الثانية والثالثة۔

ترجمہ: "اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاقِ بائن ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی، (عالمگیری جلد اول ص: 373)"۔

صورتِ مسئولہ میں منسلکہ تحریری "طلاق نامہ" کے مطابق تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں ، اور زوجین میں حرمتِ مغلظہ قائم ہو چکی ہے اور رجعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور چونکہ رخصتی نہیں ہوئی اور زوجین میں خلوتِ صحیحہ نہیں ہوئی، اس لئے مطلقہ پر کوئی عدت

نہیں ہے، وہ طلاق کے وقت سے ہی کہیں بھی نکاح کرنے کے لئے آزاد ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: یاایھا الذین امنوا اذانکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن فمالکم علیھن من عدة تعتدّونھا۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو۔ (الاحزاب: 49)''۔

اور مطلقہ اپنے سابق شوہر سے نصف مقررہ مہر کی بھی حقدار ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن وقد فرضتم لھن فریضة فنصف مافرضتم۔

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرة: 237)''۔

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (1)

سوال: 127

میرے لڑکے ذیشان مسعود ولد محمد مسعود نے اپنی بیوی طاہرہ ولد محمود کو طلاق کا نوٹس بھیجا جو کہ اس نے وصول کیا، نوٹس کے الفاظ یہ تھے:

''فریق اول (ذیشان مسعود ولد محمد مسعود) نے تین طلاقیں دو گواہوں کی موجودگی میں 27، اپریل 2006ء کو دی''۔

دونوں کا صرف نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی ذیشان مسعود سسرال جاتے تھے تنہائی میں بھی بیٹھتے تھے مگر کوئی ملاپ یا ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے، کھلے کمرے میں

بیٹھتے تھے جس میں گھر والوں کا گزر ہوتا تھا مہر کی رقم پچیس ہزار روپے ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے آیا حق مہر ادا کیا جائے گا یا نہیں ؟، (محمد مسعود، B.10/38 جوہر اسکوائر گلستان جوہر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ برصدق بیان سائل چونکہ شوہر نے ایک لفظ میں تین طلاقیں دی ہیں لہذا تین طلاق واقع ہو گئیں اور بغیر تحلیل شرعی کے دوبارہ ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ سائل کے بیان کے مطابق چونکہ دونوں کے درمیان نہ تو ازدواجی تعلقات استوار ہوئے اور نہ ہی خلوت صحیحہ ہوئی لہذا شوہر پر نصف مہر کی ادائیگی لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وان طلقتموهن من قبل ان تمسّوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف مافرضتم

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ: 237)''۔

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (2)

سوال : 128

میرا نام کنول رانی ہے، میرا نکاح شیخ ہمایوں سے 3، اپریل 2002ء کو ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی اور ہمارے درمیان کسی قسم کے ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے۔ ایک بار ہمایوں نے غصے میں ہم سے کہا کہ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جس سے

جا ہو شادی کر لو اور میرے والدین بھی میرے لئے لڑکیاں تلاش کر رہے ہیں اور جب

ہم نے کہا کہ یہ لکھ کر دیں تو وہ مکر گئے اور کہنے لگے کہ چاہے کچھ بھی کر لو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا، تب ہم نے اپنے مسئلے کے حل کے لئے کورٹ سے رجوع کیا، کورٹ نے 16 جولائی 2004ء کو خلع کے آرڈر جاری کر دیئے، کورٹ سے جو خلع لی گئی ہے وہ کتنی مؤثر ہے؟۔ (کنول رانی، دستگیر، کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو قال تزوجی ونوی الطلاق أو الثلاث صح وان لم ینو شیئاً لم یقع کذا فی العتابیۃ۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو نکاح کر لے، ایک طلاق کی نیت سے یا تین طلاق کی نیت سے، تو صحیح یہ ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاوٰی عالمگیری جلد 1 ص: 376 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائلہ شوہر کے الفاظ ''چاہے کچھ بھی کر لو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا'' سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ بہ نیتِ طلاق نہیں کہے گئے، لہٰذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قاضیٔ مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ ''طلاقِ بائن'' کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ''فسخِ نکاح'' کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یایھا الذین امنوا اذانکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن

فمالکم علیھن من عدۃ تعتدّونھا ج

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب 49:)''۔

ادائیگی مہر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وان طلقتموھن من قبل ان تمسّوھن وقد فرضتم لھن فریضۃ فنصف مافرضتم۔

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ: 237)''۔

خلع کورٹ کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے، جس میں بیوی اپنے مطالبہ مہر کے حق سے دستبردار ہو کر کہے کہ تم مجھے اس کے عوض طلاق دے دو اور شوہر اس کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تمہیں خلع دیا، یہ خلع ہے اور طلاق بائن کے حکم میں ہے۔

عدالتی نکاح دراصل حاکم مجاز کی جانب سے فسخ نکاح ہے، اس کے لئے وجوہ شرعیہ کا ہونا ضروری ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو اور اسے مکمل حقوق کی ادائیگی کے ساتھ رکھے بھی نہیں، نان نفقہ نہ دے، ظلماً مارے پیٹے، حقوق زوجیت ادا نہ کرے اور معلق (Hung) رکھے، وغیرہ۔ لہٰذا عدالتی طلاق کے موثر ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس سلسلے میں جج نے حدود شرعیہ اور احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھا یا نہیں، صرف اتنی بات خلع کے جواز کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت یہ کہے کہ: میں اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

امام شافعی کے نزدیک تین طلاق کا حکم

سوال: 129

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے شوہر نے مجھے ٹیلی فون پر تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ "میں نے تمہیں طلاق دی"، یہ الفاظ تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہے اب وہ اس بات پر مصر ہے کہ ہم رجوع کرسکتے ہیں۔ کیا اس کا رجوع کرنا صحیح ہے؟۔ واضح رہے کہ میرے شوہر کا مسلک شافعی ہے اور میں اہلسنت وجماعت سے تعلق رکھتی ہوں، برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں، (میرا، M-C703 گرین ٹاؤن شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: "پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کرسکتی ہے)۔ (البقرۃ:230)"۔ اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے۔

علامہ یحیٰ بن شرف الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأته انت طالق ثلثا فقال الشافعی و مالك

وابو حنیفة احمد و جماھیر العلماء من السلف و الخلف یقع الثلاث۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)،تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے،امام شافعی،امام مالک،امام اعظم ابوحنفیہ اور امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ اجمعین اور جمہور علماء سلف وخلف کا رحمھم اللہ اجمعین کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی ،(شرح صحیح مسلم للنووی جلد 1 ص 478 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدق بیان سائلہ اس کے شوہر نے تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ''میں نے تمہیں طلاق دی''،تین بار کی ادائیگی سے طلاق مغلظہ واقع ہوگئیں اور باقی طلاقیں لغو ہوگئیں،بغیر تحلیل شرعی کے دونوں کا میاں بیوی کے حیثیت سے رہنا ناجائز وحرام ہے،اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی تین طلاق سے عورت حرام ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل شرعی کے ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

انکارِ طلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے

سوال: 130

میرا نام افشاں انجم بنت سید رحمت علی ہے،میری شادی 20 سال قبل زبیر احمد بن قاضی معزالدین سے ہوئی میرے تین بیٹے ہیں،میں پانچ سال سے لاہور میں مقیم ہوں اور میرے شوہر راولپنڈی میں ہوتے ہیں میں پانچ سال سے اپنے شوہر سے الگ رہ رہی ہوں اور بچے میرے ساتھ ہی لاہور میں ہیں جہاں وہ اپنی تعلیم مکمل کررہے ہیں اور شوہر کوئی نان ونفقہ نہیں دے رہے ہیں ہمارے درمیان مستقل لڑائی جھگڑے رہتے تھے اور میرے شوہر ان جھگڑوں کے دوران طلاق کے الفاظ ادا کرتے

رہتے تھے کبھی ایک بار اور کبھی دو بار بھی ادا کرتے کہ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" اور پھر ایک دو دن کے اندر رجوع کر لیتے اور جب میں اعتراض کرتی کہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے تو قرآن پاک اٹھا کر کہتے کہ میں نے ایسا نہیں کہا اور ایک بار میرے شوہر نے مسجد کے امام صاحب کے سامنے قرآن پاک اٹھا کر کہا کہ میں نے طلاق کے الفاظ ادا نہیں کیے بلکہ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دے دوں گا اور میرے پاس کوئی گواہ نہ ہوتے جو میری بات کی تصدیق کرتے اسی وجہ سے کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ اب جبکہ مجھے اپنے شوہر سے الگ رہتے پانچ سال ہو رہے ہیں کبھی کبھی ان سے فون پر بات ہوتی ہے، ایک بار میں اور میرے بچے ان کو لینے گئے تھے تو شوہر نے ہم سے جھگڑا شروع کیا اور وہاں پر موجود ایک مرد اور ایک عورت کے سامنے انہوں نے کہا کہ میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی اور میرا نام لیکر انہوں نے یہ الفاظ ادا کیے تھے مگر جب ان سے پوچھا تو قسمیں کھانے لگے کہ وہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ پھر ہم یعنی میں اور بچے واپس لاہور آگئے۔ اب آپ مجھے بتایئے کہ کیا مجھے طلاق ہوگئی ہے اور اگر ہوگئی ہے تو مجھے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا مجھے اپنے مسئلے کیلئے فتویٰ چاہئے تاکہ میرے پاس ثبوت ہو اور اگر طلاق نہیں ہوئی ہے تو اس 5 سال کی علیحدگی کے بارے میں کیا حکم ہے، وہ کوئی خرچہ نہیں دیتے ہیں، اب بھی فون پر کبھی کبھی بات چیت ہوتی ہے، ان حالات میں مجھے کیا کرنے چاہئے برائے مہربانی مجھے تحریری طور پر جواب دے دیں، (افشاں انجم، نیو کالونی مصطفیٰ آباد، لاہور)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائلہ شوہر نے کئی مرتبہ طلاق کے یہ الفاظ

ادا کیے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اور تین مرتبہ ادا کیے جا چکے ہوں تو تین طلاقِ مغلظہ ہو جائیں گی اور رجوع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، رجوع یا تجدیدِ نکاح کا اختیار صرف دو طلاق تک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف او تسريح باحسان ط

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)''۔

تیسری طلاق دینے کے بعد بغیر تحلیلِ شرعی کے دونوں کا شوہر بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کرسکتی ہے)، (البقرۃ:230)''۔

قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت

طلاق کی مُدَّعیہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: عن عمرو بن شعیب، عن ابیہ، عن جدہ: ان النبی ﷺ قال فی خطبتہ: "البینہ علی المُدّعی والیمین علی المدعی علیہ"۔

ترجمہ: ''عمرابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعٰی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)''۔

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ دو عادل مرد بطور گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعٰی علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اسے قسم دی جائے گی، شوہر کی قسم کے بعد فیصلہ ہوگا اور اس طرح قضاءً نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہو جائیگی، پھر اگر شوہر نفی کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائیگا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر

حاکم شرعی کے سامنے حلف سے انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائیگی، (فتاوی رضویہ جلد: 12 صفحہ 453، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)'' ۔اگر شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہو جاتا ہے اور طلاق کے وقت کوئی گواہ موجود نہیں تھے اور اس کے بعد بدستور اسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے، خالق کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا ۔مذکورہ صورت میں سائلہ تین طلاق کی مدعیہ ہے اور شوہر اس سے منکر ہے اور بربیانِ مدعیہ اس کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے دو عادل مرد گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے لیکن اس کے پاس مذکورہ نصاب مکمل نہیں ،ایسی صورت میں بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو،اور وہ تین طلاق جو آپ زبانی دے کر منکر ہو گئے ہیں، ان کا اقرار کرلیں اور لکھ کردے دیں ،اگر انہیں خوفِ خدا آجائے تو شریعت پر عمل کریں ۔اور اگر خدانخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو ان کے انکار اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا، اگر چہ دیانۃً اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں جوابدہی کے اعتبار سے وہ نکاح باقی نہیں ہے، دنیا میں احکامِ شرعی کا اطلاق ظاہرِ حال ،قرائن اور شہادتوں یا اقرار وانکار پر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقتِ حال کے مطابق فیصلے ہوں گے، یعنی ظاہر حال کے مطابق دنیوی عدالتوں سے جو فیصلے جاری ہوتے ہیں اور نافذ ہو جاتے ہیں، وہ حقیقت حال کو تبدیل نہیں کرتے ۔

اگر آپ کو کامل یقین ہے کہ شوہر آپ کو تین طلاق دے چکا ہے تو ان حالات میں آپ کے لئے جائز شرعی اور قانونی راستہ یہ ہے کہ آپ عدالت سے رجوع کریں اور

عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کرائیں، چونکہ جائز شرعی وجوہ موجود ہیں، اس لئے یہ فسخ نکاح شرعاً وقانوناً معتبر ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

طلاقِ مدہوش

سوال: 131

میرا نام ریحان حسین خان ہے میری بیوی کا نام شازیہ ہے ہماری شادی کو بارہ سال ہوگئے ہیں اور ہماری 3 بیٹیاں ہیں، پچھلے کئی سالوں سے مجھے دماغ کی ایک بیماری ہے جس کو ڈاکٹرز Panic Disorder کہتے ہیں اور ان دوروں (Attacks) کے درمیان مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مر رہا ہوں اور یہ اٹیک ایک جنون کی طرح ہوتا ہے اور جتنی دیر اٹیک رہتا ہے، مجھے کچھ یاد نہیں رہتا اور مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں نے کیا کیا، یا کیا کہا ہے جب بھی ہوتا ہے میرے گھر والے مجھے بتاتے ہیں کہ تم نے ایسا ایسا کیا تھا، پہلے یہ دورے زیادہ ہوتے تھے، لیکن علاج ہوتے رہنے کی وجہ سے ان میں کچھ کمی آئی ہے۔ میرا مستقل علاج آغا خان ہسپتال، کراچی میں ہورہا ہے۔ 18، جون 2006ء اتوار کو میرے بھائی کے گھر رہنے گئیں ان کے ساتھ والدہ بھی تھیں رات کو مجھے بھی وہیں رکنے جانا تھا رات کو جب میں وہاں گیا تو میرا اپنی بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا اور میں وہاں سے اپنے گھر آگیا ڈاکٹرز نے مجھے ٹینشن لینے سے منع کیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اٹیک بڑھ جاتے ہیں، بہر حال جب میں گھر آگیا تو مجھے پھر اٹیک ہوا اس وقت میں اپنی بیوی کو فون کر رہا تھا اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں کیا ہوا! میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور میرے چاروں طرف میری الٹیاں (قے) تھیں، صبح جب میں بیوی بچوں کو لینے گیا تو میری بیوی نے بتایا رات کو آپ نے فون کیا تھا اور فون پر مجھے طلاق دی، مگر مجھے کچھ بھی یاد نہیں، ہاں صرف اتنا

یاد ہے کہ میں اپنی بیوی سے لڑ کر آیا تھا۔ اب ہم سب پریشان ہیں کہ اس کا شرعی مسئلہ کیا ہوگا؟۔(ریحان حسین خان فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر طلاق دینے والے کی طلاق دیتے وقت وہی کیفیت تھی جیسا کہ سائل نے بیان کی ہے کہ وہ اس وقت دورے (Attack) کی حالت میں تھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ شرعاً درستگیٔ عقل شرط طلاق ہے اور اختلالِ عقل مانع طلاق ہے۔ ہدایہ میں ہے: ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم لقوله علیه السلام کل طلاق جائز الّا طلاق الصبی والمجنون ولان الاهلیة بالعقل الممیّز وهما عدیما العقل والنائم عدیم الاختیار۔

ترجمہ: ''اور بچے کی اور مجنوں (جنون والے) کی، اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا قول ہے کہ ہر (طلاق دینے والے شخص کی) طلاق جائز (واقع) ہے مگر بچے کی اور مجنوں کی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ دونوں عقل سے تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دونوں میں عقل کا عنصر نہیں پایا جاتا اور سویا ہوا شخص (چونکہ) اختیار نہیں رکھتا، (ہدایہ اولین جلد 2 ص: 338 مطبوعہ محمد علی کارخانہ اسلامی کتب کراچی)''۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیه والمدهوش هکذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ: '' اور بچے (نابالغ) کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ عقل رکھتا ہو اور مجنوں کی اور سوئے ہوئے شخص کی، ذات الجنب (برسام) کے مریض کی طلاق، مغمی (بیمار

جس پر بے ہوشی طاری ہو) مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوگی، فتح القدیر میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 353 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

اگر صورت مندرجہ بالا صحیح اور واقعی ہے اور سائل پر بوقت طلاق دورہ (Panic Attack) پڑا تھا اور اس نے اس حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو وہ طلاق شرعاً لغو وباطل قرار دی جائے گی، یہ جواب صحت سوال وبیان مذکور پر مبنی ہے اور اگر سوال وبیان صحیح نہ ہوں تو جواب بھی یہ نہیں ہوگا۔

فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤدبانہ گذارشات

آج کل بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ماضی کے مقابلے میں طلاق کی شرح ویسے بھی زیادہ ہو چکی ہے، اسی تناسب سے ''عدالتی فسخِ نکاح'' کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے، جسے عرف عام میں ''خلع'' کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ شرعی ''خُلع'' نہیں ہے۔ شرعی خلع یہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فان خفتم الا یقیما حدود اللہ لا فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ ط تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا ج ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظلمون O

ترجمہ ''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں (زوجین) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت نے جو بدلِ خلع دیا ہے (شوہر کے اسے لینے میں) تم دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے، یہ اللہ کی حدود ہیں، سو تم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اور جنہوں نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا، تو وہی لوگ ظالم ہیں، (البقرہ: 229)''۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کی رو سے ''خلع'' یہ ہے کہ میاں بیوی اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ ''حقوقِ زوجین'' کی بابت اللہ تعالیٰ کی مقرّرہ حدود کو قائم نہ رکھ پائیں گے، باہمی اعتماد نہ رہا یا نفرت پیدا ہوگئی یا کوئی اور داخلی یا خارجی سبب بن گیا اور شوہر یک طرفہ طور پر طلاق دینے پر آمادہ نہیں

ہے ،تو پھر بیوی نے نکاح کے موقع پر جو ''حقِ مہر'' لیا ہے، وہ شوہر کو واپس کردے اور شوہر اس کے عوض اسے طلاق دے دے، یہ ''طلاق بائن'' ہوتی ہے، اس کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ رجوع کا حق نہیں رہتا، البتہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں، بشرطیکہ ایک ہی طلاق دی ہو۔ ''خلع'' قاضی کے یک طرفہ حکم سے نافذ نہیں ہوتا، اس پر زوجین کی رضامندی ضروری ہے اور قاضی کو چاہئے کہ ترغیب یا ترہیب (جس میں وہ تعزیراً حوالات میں بھی رکھ سکتا ہے) سے شوہر کو آمادہ کرے۔ فیملی کورٹس کے جج صاحبان عام طور پر شرعی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے، بس صرف قانونی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ضابطۂ کار (Procedural Law) کو اور آسان بنا دیا گیا ہے اور بعض جج صاحبان چیمبر میں ہی بیٹھ کر نکاح کو فسخ (Dissolve) کردیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تیز رفتاری سے حکومت جدید روشن خیالی (Enlightened Moderation) اور آزاد خیالی (Liberalism) لانا چاہتی ہے، ہمارا معاشرہ اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا۔ اس لئے آئے دن لوگ عدالت سے ''فسخِ نکاح'' کی ڈگری (Decree) لے کر دارالافتاء میں آتے ہیں کہ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟، نہ صرف یہ کہ مفتی کے لئے ہر فیصلے کی تائید و توثیق دشوار ہوتی ہے، بلکہ ''عدالتی ڈگری'' کے باوجود اسے معاشرہ بھی آنکھیں بند کرکے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور معاشرتی اخلاقی اقدار (Social Ehtical values) اور معاشرتی مزاحمت (Social Resistance) کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بیشتر فیصلے ''قضا علی الغائب'' (IN ABSENTIA) ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے جج بھی ماشاءاللہ مسلمان ہیں اور انہیں یہ معلوم ہے کہ مجرّد دعویٰ ثبوت مقدمہ کے

لیئے کافی نہیں ہوتا بلکہ ہر مقدے میں مُدّعی سے اس کے دعوے کے حق میں ثبوت مانگا جاتا ہے، ''مُدّعیٰ علیہ'' (Respondent) کو اپنی صفائی اور وضاحت کا موقع دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اعتراف جرم (Confession) کرے اور یا اپنی براءت پیش کرے۔آج کل بالعموم یہ ہورہا ہے کہ ''مُدّعیٰ علیہ'' نہ تو اصالتاً (Personally) عدالت میں حاضر ہوتا ہے اور نہ ہی وکالتاً (Through Attorney)، اس کو عدالت کی جانب سے رسمی طور پر طلبی کا نوٹس (Summon) بھیج دیا جاتا ہے،بیلف چلا جاتا ہے، اس کے دروازے پر نوٹس چسپاں کرآتا ہے یا اخبارات میں اشتہار ''اطلاع عام بابت طلبی بہ عدالت فلاں'' دیدیا جاتا ہے۔جج، وکلاء اور عام لوگ کب اطلاع عام کے ان روزہ مرّہ اشتہاروں کو پڑھتے ہیں یا وہ اخباران کی دسترس میں ہوتا ہے۔جج کے منصب کو اتھارٹی اور قوت مملکت اور سربراہ مملکت کی طرف سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جج پر لازم ہے کہ وہ حکومت یعنی پولیس کو پابند بنائے کہ وہ ''مُدّعیٰ علیہ'' کو عدالت میں پیش کرے، کیونکہ یہ محض دادرسی اور حق طلبی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حلال وحرام کا بھی مسئلہ ہے۔حالانکہ جب ہم معلوم کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ عام طور پر ''مُدّعیٰ علیہ'' اسی شہر یا ملک میں موجود ہوتا ہے، اس کا صحیح پتا بھی فریق مخالف کو معلوم ہوتا ہے۔یہ استثنا صرف ان مقدمات میں معتبر ہوسکتا ہے، جہاں ''مُدّعیٰ علیہ'' یا تو بالکل لاپتا (مفقود الخبر) ہوتا ہے یا ملک سے باہر ہوتا ہے، تاہم وہاں بھی ممکنہ طور پر پاکستانی سفارت خانے کی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔نیز جج کو اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ ان وجوہ کو باقاعدہ قلمبند کرے، جن کی رو سے اس کے اطمینان اور شرح صدر اور پیش کردہ ثبوت وشواہد (Proof & Evidence) کے مطابق عورت کے لئے عملاً ممکن نہیں رہا کہ وہ شرعی حدود کو قائم رکھتے ہوئے رشتۂ

ازدواج کو قائم رکھ سکے یا اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ہم ان میں سے بعض وجوہ کا تذکرہ آگے چل کر کریں گے۔یہیں سے ''فسخِ نکاح'' (Dissoution) اور خُلع کے معاملات کو الگ کردینا چاہئے۔''فسخِ نکاح'' کے مقدّمے میں صرف اتنی بات کافی نہیں کہ عورت کہے کہ میں شوہر کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی، جب کہ اس کی معقول وجوہ موجود نہ ہوں ۔اگر خدانخواستہ قانون میں سقم ہے تو جج صاحبان کو پھر بھی شریعت کی رعایت، شرعی حدود وقیود، خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حلال وحرام کی نزاکت اور حساسیّت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔بعض حضرات ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ قاضی (Judge) کو معقول وجوہ واسباب کے بغیر بھی ''فسخِ نکاح'' کا اختیار حاصل ہے، چنانچہ ارشادِ رسول اللہ ﷺ ہے:

عن ابن عباس: انّ امرأۃ ثابت بن قیس اتت النبی ﷺ فقالت: یارسول اللّٰہ، ثابت بن قیس، ماأعیبُ علیہ فی خُلق ولا دین، ولکنی اکرہ الکفر فی الاسلام، فقال رسول اللّٰہ ﷺ: اتردّین علیہ حدیقتہ قالت: نعم، قال رسول اللّٰہ ﷺ: اقبل الحدیقۃ وطلقھا تطلیقۃ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ثابت کے دین اور اخلاق کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، مگر یہ کہ میں اسلام میں رہتے ہوئے کفر (ناشکری اور شوہر کی نافرمانی) سے ڈرتی ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کا وہ باغ (جو ثابت نے نکاح کے وقت مہر میں دیا تھا) واپس کردوگی، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں: چنانچہ انہوں نے (مہر میں لیا ہوا) وہ (باغ) شوہر کو واپس کردیا، رسول اللہ ﷺ نے (ثابت سے) فرمایا: باغ قبول کرلو

اور اسے ایک طلاق دے دو، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5273)"۔
صحیح بخاری میں اس سے اگلی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے (ثابت کو) طلاق کا حکم فرمایا اور ثابت نے طلاق دے دی، اس سے آگے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ثابت کو حکم فرمایا تو انہوں نے بیوی سے (بذریعہ طلاق) علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ حدیث "فسخِ نکاح" سے متعلق نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود بحیثیت حاکم و قاضی نکاح فسخ فرمایا بلکہ آپ نے بیوی کو مہر واپس کرنے اور شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ فرمایا اور یہی خلع ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ ہمارے فیملی کورٹس کے جج فسخِ نکاح (Dissolution of Marriage) کو آخری اور ناگزیر امکانی صورت (Option) کے طور پر اختیار کریں۔ جج کی پہلی ترجیح مصالحت (Reconcilliation) ہونی چاہئے، دوسری ترجیح شوہر کو رضاکارانہ طلاق پر آمادہ کرنا اور تیسری دونوں کو خلع پر آمادہ کرنا ہونی چاہئے، کیونکہ اگرچہ شریعت نے انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں زوجین میں طلاق یا تفریق کی گنجائش رکھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حلال امور میں یہ سب سے زیادہ اس کے غضب کا باعث ہے، امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابغض الحلال الی اللہ عز وجلّ الطلاق، ترجمہ: "یعنی حلال امور میں اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 2171)"۔ بابل کے مقام پر دو فرشتے ھاروت و ماروت بنی اسرائیل کو بطورِ آزمائش جادو سکھاتے تھے اور قرآن مجید میں ان کے جادو سیکھنے کا جو سب سے مذموم پہلو بتایا، وہ یہ ہے کہ فیتعلّمون منهما مایفرّقون بین المرء وزوجه ط ،

ترجمہ: ''یعنی وہ لوگ دونوں فرشتوں سے اس (جادو) کو سیکھتے تھے، جس کے ذریعے مرد اور عورت میں علیحدگی کرادیں، (البقرہ: 102)''۔اس لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا، فیملی کورٹس کے جج صاحبان کو زوجین میں علیحدگی (Separation) کا عدالتی اختیار انتہائی ناگواری کے ساتھ آخری ناگزیر وناپسندیدہ ترجیح (Option) کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ذات کا تعلق ہے، آپ کو ویسے بھی مومنوں پر ولایتِ تامّہ اور مکمل تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے زیادہ جتنا کسی عام حاکم یا قاضی کو یا کسی ذی لی اقرب کو حاصل ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم۔ ترجمہ: ''نبی کو مومنوں پر اس سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے، جتنا خود ان کو اپنی ذات پر ہے، (الاحزاب: 6)''۔اس لئے رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہے اور آپ ﷺ وجوہ کو بتانے کے پابند نہیں ہیں، جبکہ عام جج، قاضی اور حاکم کی ولایت شرعی حدود وقیود کے ساتھ مشروط ہے۔فقہِ حنفی میں ''عدالتی فسخِ نکاح'' کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور یہ تقریباً ناممکن العمل ہے، احتیاط میں یہ شدّت اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، تاہم دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بعض حدود وقیود کے ساتھ اس کی گنجائش موجود ہے۔ اور فقہِ حنفی میں بھی یہ اصول مُسَلَّم ومختار ہے کہ ضرورت شدیدہ کی بنا پر فسخِ نکاح کے لئے دوسرے ائمہ کرام کے قول پر فیصلہ دیا جا سکتا ہے، ان میں سے چند صورتیں یہ ہیں:

(1) شوہر بے انتہا مار پیٹ کرتا ہے، جسمانی وذہنی اذیّت (Physical & Mental Torturing) میں مبتلا رکھتا ہے، نہ حقوق ادا کرتا ہے نہ طلاق دے کر گلوخلاصی کرتا ہے، بس اسے معلّق (Hung) رکھنا چاہتا ہے، تو ایسی صورت میں جج

ثبوت وشواہد اور قرائنِ قطعیہ کی بنا پر ''فسخِ نکاح'' کا فیصلہ دے سکتا ہے، لیکن اسے وجوہ ریکارڈ پر لانی چاہئیں۔

(2) شوہر نان نفقہ نہیں دیتا اور بیوی کے پاس کفالت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: (الف) یہ کہ شوہر مالدار ہے مگر ظلماً نہیں دیتا، اگر اس کا مال ظاہر ہو تو جج حکومت کے ذریعے جبراً شوہر سے نان نفقہ یعنی مصارفِ ضروریہ دلائے یا اسے قید کردے جب تک وہ خود رضاکارانہ طور پر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ (ب) اور اگر شوہر مفلس اور نادار ہے اور بظاہر اس بات کے آثار بھی نہیں ہیں کہ وہ جلد بیوی کا نفقہ دینے کے قابل ہوجائے گا اور بیوی کے لئے کوئی متبادل ذریعہ بھی دستیاب نہیں ہے، نہ ہی کوئی اور کفیل ہے اور نفقہ سے عجز کی بنا پر بیوی کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں جج نکاح فسخ کرسکتا ہے اور اسے تفصیلی وجوہ فیصلے میں درج کرنی چاہئیں۔

(3) شوہر کسی مُوذِی مرض میں مبتلا ہے، جیسے برص وجذام یا کینسر وغیرہ اور نکاح کے وقت بیوی کو معلوم نہیں تھا، اسے دھوکے میں رکھا گیا تھا، بعد میں اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی، اگر وہ اس کے باوجود رشتۂ ازدواج کو قائم رکھنا چاہے تو یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں اجر پائے گی، لیکن اگر وہ کسی طور پر بھی آمادہ نہ ہو تو جج نکاح فسخ کرسکتا ہے اور تفصیلی وجوہ اپنے فیصلے میں درج کرے۔

(4) شوہر کو خدانخواستہ طویل قید (جیسے پندرہ سال یا عمر قید) ہوگئی ہے اور بیوی جواں عمر ہے، اس کے لئے اپنے فطری جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے حدودِ شرع میں رہنا ممکن نہیں ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے یا کوئی اس کا کفیل نہیں ہے اور وہ عدالت سے فسخِ نکاح کا مطالبہ کرتی ہے تو جج فسخِ نکاح کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

(5) شوہر بلا سبب و بلا عذر مرض وغیرہ مسلسل طویل عرصے تک حقوق زوجیت ادا نہیں کرتا تو جج تنبیہہ کے بعد اور تنبیہہ کے غیر موثر ہونے کے بعد نکاح فسخ کرسکتا ہے۔

(6) شوہر مجنون ہوگیا، مناسب وقت گزرنے پر بھی علاج سے صحت یاب نہ ہوسکا، اس کے جنون سے بیوی کے جسم وجاں کو خطرہ لاحق ہے یا وہ اب حقوق زوجیت کی ادائیگی اور بیوی کی کفالت کا اہل ہی نہیں رہا تو جج نکاح فسخ کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی خدا ترس ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ شوہر کی یہ کیفیت عارضی ہے اور مناسب وقت میں اسے افاقہ ہوجائے گا تو ''فسخِ نکاح'' سے پہلے مناسب مہلت دینی چاہئے۔

(7) عنین (Impotent) شوہر اور مفقود الخبر یعنی لاپتا شوہر کے فسخِ نکاح کے مسائل تفصیل طلب ہیں، اس لئے ان پر کسی مناسب موقع پر الگ تفصیل سے بات ہوگی۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث (صفحات: 1094 تا 1121) میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مسلک کو اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کون کون سے مواقع ہیں جہاں دوسرے ائمہ کے قول پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں ''مجلس قضائے شرعیہ'' بہار، اکابر علماءِ اہلسنت نے قائم کی تھی اور انہوں نے ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں کچھ اصول متفقہ طور پر طے کئے تھے، جن میں سے ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں بعض متفقہ وجوہ کا تذکرہ مفتی عبدالواجد قادری نے ''فتاویٰ یورپ'' میں کیا ہے۔

آخر میں میری دردمندانہ گذارش ہے کہ اگر کوئی عورت خدانخواستہ خوفِ خدا سے عاری ہے، اس پر نفسانی خواہشات یا ہوسِ زر کا غلبہ ہے یا عشرتوں کی دلدادہ ہے اور کسی بھی

جائز سبب کے بغیر شوہر کے ساتھ بہر صورت رہنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو ایسی صورتِ حال میں شوہروں کو چاہئے کہ وہ رضا کارانہ طور پر خُلع پر آمادہ ہو جائیں یا یک طرفہ طور پر طلاق دے دیں، اس پر وہ عنداللہ اجر پائیں گے اور عورت فتنہ اور گناہ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گی۔ اور اگر شوہر رضا کارانہ طور پر اس پر آمادہ نہ ہو تو عدالت مناسب دباؤ ڈال کر اس سے طلاق دلوائے۔

ماں کا حقِ نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں

سوال: 132

منکہ مسمی شعیب یونس ولد محمد یونس کی شادی مسماۃ فارینہ بنت امان اللہ سے 11 اگست 2001ء کو ہوئی تھی۔ اس سے میرا ایک ساڑھے چار سالہ بیٹا محمد مصطفی ہے۔ اس تمام عرصے میں میری بیوی کا رویہ مجھ سے کبھی محبت کا نہیں رہا اور اکثر اوقات وہ میکے میں رہنے کی خواہشمند رہتی جس پر کبھی کبھی ناراضی بھی ہوتی تھی ایک دن اچانک مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا اور اس روز میں نے اسے ایک ایسے موبائل فون پر کسی لڑکے کو SMS کرتے ہوئے پکڑا جو میں نے اسے نہیں دلایا تھا اور مجھ سے خفیہ رکھا ہوا تھا، رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ اس کے تعلقات دوسرے لڑکوں سے ہیں۔ اس موبائل پر تقریباً SMS750 آئے اور تقریباً 500 گئے، جس کی تفصیل پرنٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد میری غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ ایسی عورت کو اپنے ساتھ رکھوں مگر پھر بھی میں نے ہوش میں رہتے ہوئے اس کے والدین کو بلایا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی اور ایک طلاق دے کر ان کے ساتھ بھیج دیا اس پر اس کے والدین نے نہ کسی شرمندگی کا اظہار کیا اور نہ ہی معافی مانگی اور میرے بچے کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ میرا

تعلق ایک دین دار گھرانے سے ہے، میں نے اس وقت ممتا کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کے خیال سے بچے کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی مگر اس کی بے راہ روی اور غیر اخلاقی حرکات کو دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچے کو ساتھ رکھوں اور اس کی پرورش دینی ماحول میں کروں۔

محترم مفتی صاحب ان حالات میں آپ کا مشورہ اور فتویٰ درکار ہے تا کہ میں اپنے بچے کو اس گندے ماحول سے نکال کر اپنے پاس رکھوں اور اس کی تربیت دینی ماحول میں کرسکوں، جب وہ میرے پاس تھا تو اسکول بھی جاتا تھا لیکن اس کی ماں نے چار ماہ سے اسے اسکول نہیں بھیجا، بچے کا مستقبل خراب ہو رہا ہے۔ برائے مہربانی بچے کی کفالت اور حصول کے لئے شرعی اور قانونی رہنمائی فرمائیں تا کہ بچے کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ ایک دین دار انسان بن سکے، (محمد شعیب، C-205، پرنس ایونیو، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

شرعاً بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ایسے اسباب پائے جائیں جو اس کے حق کو ساقط کر دیں، تو بچے کو اس کی پرورش میں نہیں دیا جائے گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الا م الا ان تكون مرتدة أو فاجرة غير مامونة كذا في الكافي۔

ترجمہ: ''نکاح قائم رہے یا (بذریعۂ طلاق) تفریق ہو جائے، (دونوں صورتوں میں) بچے کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کی ماں کو حاصل ہے، لیکن اگر وہ مرتدہ ہو جائے یا (فسق و) فجور میں مبتلا ہو جائے، بچے کی صحیح نگہداشت نہ کرے تو (پھر اس

کا حق ساقط ہو جاتا ہے)''کافی ''میں بھی اسی طرح ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں

:و کذا لو کانت سارقة أو مغنية أو نائحة فلا حق لها ھکذا فی النھر الفائق

۔

ترجمہ:''اوراسی طرح اگر وہ (ماں) چور یا گانے والی یا نوحہ خوانی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہے،تو اس کے لئے حقِ پرورش نہیں ہے،''النھر الفائق''میں اسی طرح مذکور ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد:1،ص:541،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

''تربیت الولد(تثبت للام)النسبیة (ولو بعد الفرقة الا أن تکون مرتدة أو فاجرة)فجوراً یضیع الولد به، کزنا وغناء وسرقة ونیاحة، کما فی "البحر" و"النھر" بحثاً۔قال المصنف :والذی یظھر العمل باطلاقھم کما ھو مذھب الشافعی أن الفاسقة بترك الصلاة لا حضانة لها ۔ وفی "القنیة ":الأم أحق بالولد ولو سیئة السیرة معروفة بالفجور مالم یعقل ذلك (أو غیر مأمونة) ذکرہ فی "المجتبیٰ "بأن تخرج کل وقت وتترك الولد ضائعاً۔

ترجمہ:''بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے،اگر چہ زوجین کے درمیان جدائی واقع ہوگئی ہو،لیکن اگر وہ (ماں)مرتدہ ہوگئی ہے یا فاجرہ ہے اور فسق ایسا ہے،جس سے بچے کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو،مثلاً زنا ،،گانا بجانا ، چوری ، اور نوحہ کرنا جیسا کہ ''البحرالرائق''اور''النھر الفائق'' کی بحث میں کہا گیا ہے مصنف کہتا ہے: بظاہر اس قول کے اطلاق پر عمل کریں گے جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے کہ اگر فاسقہ ماں نماز کی تارکہ ہے،تو اسے بھی بچے کی پرورش کا حق نہیں رہتا،اور''قنیة''میں ہے: ماں

بچے کی پرورش کی زیادہ حق دار ہے اگر چہ وہ اپنی سیرت وکردار میں برائی کے حوالے سے جانی جاتی ہو، بچہ اس وقت تک ماں کی پرورش میں رہے گا جب تک اسے اچھائی برائی کی تمیز نہ ہو (جب وہ باشعور ہو جائے تو اسے ماں سے علیحدہ کرلیں تاکہ ماں کو دیکھ کر اس کا کردار خراب نہ ہو) ایسے ہی اس عورت کی پرورش میں بھی نہیں دیا جائے گا ،جس کے پاس بچہ غیر محفوظ ہو یعنی وہ ہر وقت بچے کو چھوڑ کر آزادانہ گھومتی پھرتی رہے ،"المجتبیٰ" میں اسی طرح ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"والحاصل أنّ الحاضنة ان كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها، والا فهي أحق به الى أن يعقل فينزع كالكتابية۔

ترجمہ:"اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ پرورش کرنے والی (ماں) اگر فاسقہ ہے اور اس کے پاس رہنے سے بچے کے ضائع ہونے (یا اس کی عادات واطوار بگڑنے) کا اندیشہ ہے تو اس (ماں) کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا، اور اگر فاسق نہ ہو تو بچے کے باشعور ہونے تک زیادہ حق دار وہی ہے،اس کے بعد اس سے لے لیا جائے گا، جیسے "کتابیہ" ماں کا حکم ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص:204,205 داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

آپ نے سوال میں جو صورت درج کی ہے، اس کی رو سے ایسی ماں کی سرپرستی اور نگہداشت میں بچے کے کردار کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور اس نے بچے کو اسکول سے بھی روک دیا ہے،لہٰذا آپ اس سے بچے کا مطالبہ کریں ،اگر حوالے نہ کرے تو پنچائیت یا عدالت کے ذریعے حاصل کریں۔

بچوں کی کفالت

سوال: 133

میرا بیٹا اختر محمود 15 نومبر 2006ء کو قضائے الٰہی سے انتقال کر گیا ہے، لواحقین میں درج ذیل افراد ہیں:

(1) بیوہ اختر محمود عمر 25 سال (2) ایک بیٹی عمر 4 سال

(3) ایک بیٹا عمر 2 سال (4) والد (محمود احمد) عمر 60 سال

۱۔ وراثت کی تقسیم میں شرعی احکامات کی رُو سے ہر ایک کو کس قدر حصہ ملے گا؟

۲۔ مرحوم پر جو قرض ہے اس کی ادائیگی کے متعلق بھی شرعی فیصلے سے مطلع فرمائیں؟

۳۔ بیوہ اگر نکاحِ ثانی کرتی ہے تو کیا ان دونوں کمسن بچوں کی کفالت ان کے دادا کے ذمے ہوگی؟، (محمود احمد لطفی، 502- سیکٹر B-5 سرجانی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں: (1) ترکے سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ متوفی اختر محمود کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ 72 حصوں میں منقسم ہوگی، متوفی کے والد (محمود احمد) کو 12 حصے، بیوہ کو 9 حصے، بیٹے کو 34 حصے،

بیٹی کو 17 حصے ملیں گے۔ جہاں تک بچوں کفالت اور حق حضانت (گود لینے اور پرورش) کا تعلق ہے، شرعاً اس کے استحقاق کی ترتیب درج ذیل ہے:

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

تربیت الولد (تثبت للام) النسبیۃ (ثم) أی بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبی (أم الأم وان علت) عند عدم أهلیة القربیٰ (ثم أم الأب وان علت) بالشرط المذکور، وأما أم ابی الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة أیضاً۔

ترجمہ: "بچے کی پرورش کا حق نسبی ماں کو حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ترجمہ: "ماں فوت ہو جائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کر لے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو، پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا، پھر نانا کی ماں، دادی بلکہ خالہ سے بھی موخر ہے۔

مزید لکھتے ہیں: والحاضنة أما أو غیرها (أحق به) أی بالغلام حتی یستغنی عن النساء وقدر بسبع وبه یفتی لأنه الغالب

ترجمہ: "پرورش کرنے والی عورت خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہو جائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

(والأم والجدة) لأم أو لأب (احق بها)بالصغيرة (حتى تحيض وغيرهما احق بها حتىٰ تشتهى) وقدر بتسع وبه يفتى ۔

ترجمہ:''ماں اور نانی اور دادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشتہاۃ (قریب البلوغ)ہونے تک ہے اور اس کی مدت کا اندازہ 9 سال لگایا گیا ہے،اور اسی پر فتویٰ ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 5 ص: 210 تا 216 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

صورتِ مسئولہ میں دونوں بچے مذکورہ بالا عمر تک ماں کے پاس رہیں گے بشرطیکہ ماں کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح نہ کرے جو بچے کے لئے اجنبی ہے،اس کے بعد دادا کو ان کی کفالت کا حق حاصل ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو ماں سے اس طرح جدا کر دیا جائے کہ اس سے ملنے تک نہ دیں یہ حرام اور سخت حرام ہے۔حدیث مبارک میں ہے : عن ابی موسیٰ قال لعن رسول اللہ ﷺ من فرق بین الوالدۃ وولدھا،وبین الاخی وبین اخیہ۔

ترجمہ:''ابی موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی کہ جو ماں اور اس کے بچے میں جدائی پیدا کرے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے جدا کرے،(سنن ابن ماجہ:رقم الحدیث:2250)''۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب العدت﴾

عدت

سوال: 134

کیا عورت کو جو مہینہ آتا ہے وہ تین بار آجائے تو کیا عدت پوری ہوجاتی ہے؟، (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروءٍ۔

ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ: 228)''۔

سوال: 135

میری بیوی حلالے کے بعد بچوں کی وجہ سے عدت کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ بچوں کو اسکول اور مدرسے چھوڑنا، گھر کا سامان لانا، بچوں کی بیماری اور گھر کے دیگر بہت سارے کام ہوتے ہیں اور یہ کام کرنے والا کوئی نہیں ہے، میرے چھ بچے ہیں کیا اس صورت میں عدت لازم ہے مہربانی فرما کر میری مشکل آسان فرمادیں، (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

عدت کا پورا کرنا لازمی ہے اور دوران عدت اس کا اور بچوں کا نفقہ ادا کرنا آپ کے ذمے لازم ہے اور جو عذر آپ نے پیش کیے ہیں وہ شرعاً نا قابل قبول

ہیں۔اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ۔

ترجمہ: ”جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو،تو ان کی عدت کے وقت (سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو، (الطلاق: 1)“۔

کیا میں دورانِ عدتِ طلاق گھر سے باہر جاسکتی ہوں؟

سوال: 136

مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کے چار ماہ بعد میں بہت بیمار ہوگئی اور اپنی والدہ کے گھر آگئی تھی ،اس دوران میرا میرے شوہر سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا خرچہ دیا میرے والدین نے سارا خرچا اٹھایا اب میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے تو جناب عدت کے بارے میں فرمایئے کہ میری عدت ہوگی، کتنے دن کی ہوگی؟ ،میں چونکہ ڈپریشن کی مریضہ بن گئی تھی تو ڈاکٹر نے مصروف رہنے کا کہا تھا اور پونے دو سال علاج بھی ہوا میں نے ابھی تین ماہ قبل ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔کیا میں عدت کے دوران اسکول جاسکتی ہوں یا نہیں ؟اسکول میں پڑھانے سے میری دماغی حالت میں کافی بہتری آئی ہے ہم دونوں پونے دو سال سے جدا تھے ،اولاد کا سلسلہ بھی کوئی نہیں ہوا ،(فردوس جبیں ،بلاک 1فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو،اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں،قرآن مجید میں ہے:

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثہ قروء۔

ترجمہ:''اورطلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں،(البقرۃ:228)''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:لاتخرجوھن من م بیوتھن ولا یخرجن۔

ترجمہ:تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں،(الطلاق:1)''۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:وفی الجامع الصغیر المطلقۃ تعتد فی بیت کانت قبل الفرقۃ فیہ ولا تخرج لیلاً ولا نہاراًفی العدۃ۔

ترجمہ:جامع صغیر میں ہے مطلقہ عورت اپنے گھر میں عدت گذارے گی،دورانِ عدت رات ودن میں کسی وقت گھر سے نہیں نکلے گی،(جلد ثانی ص:119 مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ،کوئٹہ)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا تخرج لیلاً ولا نہاراً سواہ کا ن الطلاق ثلاثاً أو بائنا أو رجعیاً۔

ترجمہ:'' رات ودن میں کسی بھی وقت (معتدہ) اس مکان سے جہاں وہ طلاق سے پہلے رہائش پذیر تھی نہیں نکلے گی،خواہ اسے تین طلاق دی گئی ہوں یا طلاق بائن یا طلاقِ رجعی،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:534 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

صورتِ مذکورہ میں چونکہ آپ اپنے والد کی کفالت میں ہیں اور کوئی معاشی ضرورت یا مجبوری درپیش نہیں ہے اور ملازمت کرنا آپ کی معاشی مجبوری نہیں ہے،لہٰذا عدت کے ایام میں گھر سے نہ نکلیں،ڈپریشن وغیرہ کا عذر مسموع نہیں ہے۔

عدتِ وفات

سوال: 137

میرے شوہر محمد الطاف کا انتقال ۴ر فروری ۲۰۰۶ء کو ہوا ہے اور میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سب سے بڑی بیٹی ۱۷ر سال کی، دوسری بیٹی ۱۵ر سال کی، بیٹا ۱۱ر سال کا اور دو چھوٹے جڑواں ڈیڑھ سال کے بچے ہیں۔ میرے شوہر کا جڑی بوٹیوں کا سپلائی کا کام ہے، اوران کا تمام پیسہ کاروبار میں لگا ہوا ہے، میرے والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور میرا کوئی سگا بھائی بھی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں، اس لئے مجھے آپ سے یہ فتوی چاہئے کہ میں پردے میں رہ کر اپنے شوہر کے کاروبار کو چلا سکتی ہوں اور دکان پر کاروباری لوگوں سے بات چیت کر سکتی ہوں، فی الحال میرے ماموں زاد بھائی کاروبار کو سنبھال رہے ہیں، مگر وہ اس کاروبار کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہیں جبکہ میں اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کئی مرتبہ کاروبار سنبھال چکی ہوں اور کاروبار کی تمام باریکیوں سے واقف ہوں، اس لئے اگر اشد ضرورت پڑے تو پردے میں گھر میں یا باہر جا کر کاروبار سنبھال سکتی ہوں، کیونکہ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری جوان بیٹی کاروبار کے سلسلے میں غیر مردوں کے سامنے جائے، آپ اس سلسلے میں فتوی دے کر میری رہنمائی کریں، (شہناز الطاف، D-120/A گلی نمبر ۱، موسیٰ کالونی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالی کا حکم ہے: والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربصن بانفسهنّ اربعة اشهرٍ وّعشراً فاذا بلغن اجلهنّ

فلا جناح عليكم فيما فعلن فی انفسهنّ بالمعروف ط ترجمہ:اور جولوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں، (البقرہ: 234)۔

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا یا نقصان پہنچے گا تو اس ضرورت سے اسکے لئے جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

درمختار میں علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ومعتدة موت تخرج فی الجديدين، وتبيت) اكثر الليل (فی منزلها) لان نفقتها عليها، فتحتاج للخروج۔

ترجمہ: ''اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے، لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے، اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے، (درمختار جلد 5 صفحہ 180، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں: و أما المتوفى عنها زوجها فلا تخرج ليلاً و لا باس بان تخرج نهاراً فی حوائجها لانها تحتاج الی الخروج بالنهار لاكتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليها فتحتاج الی الخروج لتحصيل النفقة۔

ترجمہ: ''پس وفات پا گیا ہو جس عورت کا شوہر وہ رات میں نہ نکلے ،اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299 ،مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات ہند)''۔

صورت مسئولہ میں فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق یہ واضح ہوتا ہے کہ معتدہ وفات اپنے اخراجات اور روزگار کے لئے دن کے وقت باپردہ باہر نکل سکتی ہے۔لہٰذا آپ کے لئے باپردہ ہوکر شوہر کے کام کی دیکھ بھال کے سلسلے میں نکلنا جائز ہے۔

مدتِ عدت

سوال: 138

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ: ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ عورت حاملہ ہے،تو اس کی عدت کتنی ہوگی؟، نیز عدتِ طلاق اور عدتِ وفات کی مدت کتنی ہے؟، آیا عدت کے دوران عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے؟، (زاہد اللہ، کراچی)۔

جواب :

عِدَّت (عین کی زیر کے ساتھ) کے لفظی معنیٰ ہیں: گنتی کرنا اور عُدت (عین کے پیش کے ساتھ) کے معنیٰ ہیں: کسی معاملے کی تیاری کرنا۔اور اصطلاحی معنیٰ ہیں: نکاح ختم ہونے کے بعد ایک خاص مدّت تک عورت کا (عقدِ ثانی سے) رکے رہنا۔ اگر عورت کو شوہر نے طلاق دے دی ہے اور وہ طلاقِ مُغلَّظہ ہے، یا طلاق رجعی ہے، مگر عدت کے اندر رجوع نہیں کیا، تو اس مطلّقہ (طلاق یافتہ)عورت کو اگر حیض

(Menses) آتا ہےتو اس کی عدت تین حیض ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وعلی المطلقٰت یتربصن بانفسھن ثلٰثة قروء ۔ ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتوں پر لازم ہے کہ وہ (کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے) اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں (البقرہ: 228)''۔

حیض اور طہر (پاکی کے ایام) کا دورانیہ ہر عورت کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبّی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوگئی ہیں، جب کہ فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہوجاتا ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: والّٰئی یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتھن ثلٰثة اشھر والّٰئی لم یحضن ۔ ترجمہ: ''اور تمہاری جو عورتیں حیض سے ناامید ہوچکی ہوں یا انہیں سرے سے حیض آتا ہی نہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، (الطلاق: 4)''۔

جو عورت طلاق کے وقت حالتِ حمل میں ہو تو اس کی عدت وضعِ حمل (Delivery of the child) یعنی بچہ پیدا ہونے تک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واُلات الاحمال اجلُھن ان یضعن حملھن ۔ ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے، (الطلاق: 4)''۔

جن عورتوں کے شوہر وفات پا جائیں اور بیوہ رہ جائیں تو ان کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یُتوَفّون منکم ویَذَرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا۔ ترجمہ: ''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں (عقدِ ثانی سے پہلے) اپنے آپ کو چار ماہ دس دن

تک روکے رکھیں،(البقرۃ:234)"۔اگر عورت بیوہ ہوگئی ہے اور وہ حاملہ ہے،تو اس صورت میں اس کی عدت وضع حمل تک ہی رہے گی،چنانچہ عِدّتِ وفات کے تحت علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(و)العدۃ(للموت اربعۃ اشھروعشر مطلقا)وطئت اولا ولو صغیرۃاو کتابیۃ تحت مسلم الا الحامل۔

ترجمہ:"یعنی عِدّتِ وفات جو چار ماہ دس دن ہے یہ مطلقاً سب کے لئے ہے،خواہ اس سے شوہر نے مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو،خواہ نابالغہ ہو یا کوئی اہلِ کتاب عورت ہو جو کسی مسلمان کے نکاح میں تھی،سوائے حاملہ کے(کہ اس کی عِدّت شوہر کی وفات کی صورت میں وضعِ حمل ہی رہے گی)،ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد:5،ص:150،داراحیاء التراث العربی،بیروت)"۔

عدت کی اصل حکمت"استبراءِ رحم"یعنی اس امر کا یقین کہ عورت حاملہ نہیں ہے،اس کے لئے مدت کا تعین وحیِ ربانی سے ہوا ہے،اسی لیئے مطلّقہ حاملہ کی عدت وضعِ حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔البتہ شوہر کی وفات کی صورت میں ایک طرح سے سوگ بھی ہو جاتا ہے۔اگر کسی عورت کا نکاح ہوگیا ہے،لیکن باقاعدہ رخصتی نہیں ہوئی یا میاں بیوی میں خَلوتِ صحیحہ قائم نہیں ہوئی،(خَلوتِ صحیحہ سے مراد دونوں کا تنہائی میں اس طرح سے جمع ہونا کہ ازدواجی تعلق میں کوئی طبعی مانع حائل نہ ہو)تو طلاق کی صورت میں اس عورت پر بالکل عدت نہیں ہے۔اوروہ طلاق کے فوراً بعد کسی بھی شخص کے ساتھ اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ازدواجی تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے

سوال: 139

تقریباً 11 سال پہلے میرے گھر لڑکے کی ولادت کے بعد سے میرے شوہر میرے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے سے محروم ہیں، اس وجہ انہوں نے 15 دن قبل مجھے طلاق دے دی ہے، تین مرتبہ انہوں نے کہا کہ "میں نے تم کو طلاق دی" تحریری طور پر بھی دینے کو تیار ہیں۔ کیا میں فوری طور پر نکاحِ ثانی کرسکتی ہوں؟ یا مجھے عدت گذارنا ہوگی اگر عدت گذارنی ہے تو کتنے دن ؟،(شاہدہ رشید ،R-1947/2 عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو، اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثه قروء۔

ترجمہ:"اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں،(البقرۃ:228)"۔

صورتِ مسئولہ میں عدت پوری کیے بغیر نکاح ثانی ہرگز نہیں کیا جاسکتا اور عدت طلاق دینے کے فوراً بعد شروع ہوجاتی ہے اور اس کی مدت تین حیض کا گزرنا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

دورانِ عدت جنازے میں شرکت

سوال: 140

میری والدہ عدت میں ہیں ان کی عمر 53 سال ہے ان کی عدت کے دوران میری چچی کے والد کی وفات ہوگئی اور بغیر کسی بڑے کے پوچھے تمام بہن بھائیوں کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلی گئیں۔مگر وہ پورے پردے میں تھیں برقع پہن کر نقاب لگا کر گئی تھیں اور رات دس بجے واپس لوٹی تھیں۔لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں میت کے بعد دس قدم بھی نہیں نکالے،اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟اور اگر امی سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے تو اس کا اگر کوئی کفارہ ہے تو بتادیں اور یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ عدت شوہر کے لئے تحفہ ہے اسمیں کیا صداقت ہے؟اور عدت میں کیا شرعی کام کرنے چاہئیں؟،(عارفہ عباسی،دستگیر سوسائٹی F.B ایریا،کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:لاتخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن الا ان ياتين بفاحشة مبينة۔

ترجمہ:تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں۔(الطلاق:1)

عورت کے لئے عدت اسی مکان میں واجب ہے،جہاں وہ شوہر کی وفات کے وقت رہتی تھی۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(طلقت) أو مات وهي زائرة (في غير مسكنها عادت اليه فوراً) لوجوبه عليها (وتعتدان) أى معتدة طلاق وموت (في بيت وجبت فيه) ولا يخرجان منه (الّا أن تخرج، أو ينهدم المنزل أو تخاف) انهدامه، أو (تلف

مالها،أو لاتجد كراء البيت)ونحو ذالك من الضرورات،فتخرج لأقرب موضع اليه۔

ترجمہ:''عورت کوطلاق دی گئی یااس کاشوہر وفات پاگیااوروہ اپنے گھر کےعلاوہ کہیں اورگئی ہوئی تھی تو اسے چاہئے کہ فوراًاپنے گھر لوٹ آئے ،کیونکہ یہ اس پر واجب ہے،عورت عدتِ طلاق گزاررہی ہو یاعدتِ وفات،ان دونوں کوچاہئے کہ اسی گھر میں عدت گزاریں جہاں پرعدت گزارنا،ان پر واجب ہوا ہے،سوائے اس کے کہ انہیں (اس گھر سے)نکال دیا جائے یا مکان گر جائے یااس کے گرنے کا خدشہ ہویا اس کا مال تلف ہونے کا خطرہ ہویا(مکان کرائے کا ہونے کی صورت میں کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو)ان جیسی صورتوں (یامجبوریوں) کی بناء پراس کے لئے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کراس سے قریب ترین جگہ پرعدت گزارے،(ردالمحتارعلی الدرالمختارجلد 5ص:180 داراحیاءالتراث العربی بیروت)۔''عورت کوزمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے ،ہاں !اگرعدتِ وفات ہواوراس کے پاس کھانے کونہ ہو،گھر سے نکلےبغیر گذراوقات مشکل ہو،تووہ دن دن میں ان ناگزیرضرورتوں کے لئےنکل سکتی ہے،اوررات اسی گھرمیں گزارےاوربغیرضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

علامہ علاؤالدین ابی بکربن مسعودلکھتے ہیں:

وأماالمتوفى عنها زوجها فلا تخرج ليلاً، ولا باس بان تخرج نهاراًفي حوائجها لانهاتحتاج الى الخروج بالنهار لاكتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليهافتحتاج الى الخروج لتحصيل النفقة۔

ترجمہ:''ایسی عورت جوعدتِ وفات میں ہے،تو وہ رات کوگھر سے(ہرگز) نہ نکلے

،البتہ دن کے وقت اپنی ضروریات کے لئے نکل سکتی ہے ،اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات ہند)''۔

صورتِ مسئولہ میں نہ تو آپ کی والدہ نفقہ اور دیگر ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہیں اور نہ ہی دورانِ عدت جنازے میں جانا ضرورتِ شرعی ہے،اور ضرورت وہ ہوا کرتی ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا گیا۔عدت حکمِ شرعی ہے جس کی پابندی ضروری ہے،شرعی کام صرف عدت ہی میں نہیں بلکہ تمام زندگی کرنے چاہئیں ،اور اس کے لئے ضروریاتِ دین کو سیکھئے اور مستند کتب کا مطالعہ کیجئے ،واللہ اعلم بالصواب۔

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿کتاب الفرائض﴾

ترکہ کی تقسیم

میرے چند سوالات کا اسلامی شریعت اور حدیثوں کے حوالے سے تحریری جواب عنایت فرمائیں۔

اگر کوئی شادی شدہ عورت جو کہ تین بچوں کی ماں ہو، اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے گھر میں کسی غیر مرد سے ناجائز تعلقات کی مرتکب ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس عورت کو طلاق دے کر اس کو گھر سے نکال دیا۔

سوال: 141

1۔کیا اس عورت کے والد اس کو اپنی جائداد سے خارج کر سکتے ہیں؟۔

2۔کیا اس عورت کے والد اپنی زندگی میں اس عورت کو اپنی جائداد میں سے کچھ حصہ دے سکتے ہیں، صلہ رحمی کے طور پر؟۔

3۔والد صاحب کے پاس ایک عدد گھر اور ایک عدد فلیٹ بھی ہے، انہوں نے جب والدہ حیات تھیں تو باقاعدہ یہ کہہ دیا تھا کہ گھر بیٹے کا ہے اور فلیٹ بیٹی کا ہے اور گھر بیٹے کے نام کیے ہوئے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔کیا ایسی صورت میں والد صاحب بیٹے کو گھر اور بیٹی کو فلیٹ دے سکتے ہیں، جبکہ دونوں کی قیمت میں دس گنا کا فرق ہے۔اب والد صاحب کا مطالبہ ہے کہ جو گھر میں نے تم کو دیا تھا وہ مجھے واپس کر دو، (محمد فاروق عمران، A-10، کے ڈی اے سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

ہر عاقل و بالغ شخص اپنے ہر قول و فعل کا ذمہ دار ہے۔شریعت کی رو سے بھی اور قانون کی نظر میں بھی، لہٰذا کسی شخص پر اپنی بالغ اولاد کے کسی فعل یا لین دین کی ذمہ

داری عائد نہیں ہوتی۔ جہاں تک اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا سوال ہے تو اس کا اختیار شرعاً والدین کو نہیں ہے، کیونکہ وراثت یا ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مر جاتا ہے۔اس متروکہ مال میں مرنے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال پر وصیت کے ذریعے تصرف کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ وفات سے پہلے اپنی زندگی میں ایسی وصیت کر چکا ہو، لیکن وصیت میں بھی یہ شرط ہے کہ وارث کے حق میں وہ معتبر و مؤثر نہیں ہوتی۔ باقی متروکہ مال پر وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں ردو بدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، کسی ایک وارث کے حق میں بھی وصیت کو اس لئے ناقابل اعتبار اور غیر مؤثر قرار دیا گیا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مقررہ نظام وراثت میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذي حقّ حقّه فلا وصية لوارث"

ترجمہ: "ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسۃ الریان، بیروت)"۔

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تاکہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك؛ قال: قال رسول الله ﷺ: "من فرّ من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة"۔

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

اولاد میں سے کسی کو اپنے ماں باپ سے ان کی زندگی میں یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اپنے مال یا جائیداد یا وراثت میں سے ہمیں حصہ دو۔ ہر عاقل و بالغ زندہ شخص کو اپنے مال پر شرعی حدود میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اور جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کا مال اس کی ملکیت ہے، ترکہ یا وراثت نہیں ہے کہ کوئی وارث بن کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ "ھبہ" کہلائے گا اور "ھبہ" میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

حدثنی النعمان بن بشیر انّ امّہٗ بنتَ رواحۃَ سالَت اباہ بعضَ الموھوبۃ من مالہ لابنھا، فالتویٰ بھا سنۃً، ثمّ بدا لہ۔ فقالت: لا ارضٰی حتّٰی تُشھدَ رسول اللہ ﷺ علیٰ ماوھبتَ لابنی، فاخذ ابی بیدی، وانا یومئذٍ غلام، فاتیٰ رسول اللہ ﷺ فقال: یارسول اللہ ﷺ! انّ اُمّ ھذا، بنتَ رواحۃَ، اَعجبھا ان اُشھِدکَ علی الذی وَھبتُ لابنھا، فقال رسولُ اللہ ﷺ: "یا

بشيرًا أ لكَ ولدٌ سوى هذا؟" قال: نعم، فقال: اكلّهم وهبت له مثل هذا؟ قال: لا ـ قال: فلا تشهدني إذن، فانّي لا اشهدُ علىٰ جورٍ".

ترجمہ:"نعمان بن بشیر رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (حضرت نعمان) کو ھبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انھیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ھبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔ اس وقت میں نو عمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا! یا رسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کرلوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ھبہ کیا ہے؟، انھوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا"۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4104، جلد: 7، مطبوعہ نزار مصطفیٰ الباز الریاض، مکۃ المکرّمۃ)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ھبہ کرے تو تمام اولاد کے درمیان مساوات کو روا رکھے، لیکن اگر کوئی خاص شرعی وجہ موجود ہو تو اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ بھی دے سکتا ہے مثلاً زیادہ فرماں بردار ہے یا معذور ہے تو دیگر ورثاء کی رضامندی سے اسے زیادہ دے سکتا ہے۔ تاہم باپ کی زندگی میں اولاد کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی وراثت تقسیم

کردیں، کیونکہ ابھی تو ماشاء اللہ وہ حیات ہیں، اور ان کا مال ترکہ تو ان کے انتقال پر بنے گا، اُس وقت جو شرعی ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسبِ احکامِ شریعت اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے کو حدیث پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) العائد فی هبته کالعائد فی قیئه۔ "ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۶۲)"۔

(۲) مثل الذی رجع فی صدقته کمثل الکلب یقیئ ثم یعود فی قیئه فیاکله۔ "جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۵۸)"۔

ایک یا دو اشخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہو جانا

سوال: 142

عرض یہ ہے کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے والد کا فیڈرل بی ایریا میں ڈبل اسٹوری مکان ہے، جس میں اوپر نیچے دو بھائی رہتے ہیں، ہم کل آٹھ بہن بھائی (تین بھائی اور پانچ بہنیں) ہیں، باقی بھائی بہنوں کی خواہش ہے کہ انہیں ان کا حصہ دے دیا جائے جب بڑے بھائی سے میں نے کہا کہ تم ماں باپ کے مرنے کے بعد اس مکان میں ناجائز رہ رہے ہو اس میں سب کا حق ہے تو اس نے کہا کہ فتویٰ لے آؤ، آپ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دے دیں، (ارشد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین و تدفین، ادائی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترتیب کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ "للذکر مثل حظ الانثیین" (ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت تقسیم ہوگا۔ یہ درست ہے کہ ترکہ تمام ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق جلد تقسیم ہو جانا چاہیے تھا اور اس ترکے میں تمام ورثاء کا حصہ ہے، کسی بھی وارث کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ متوفی کے ترکے کے گیارہ حصے ہوں گے، ہر بھائی کو دو حصے اور ہر بہن کو ایک حصہ ملے گا۔ جب تمام ورثاء اپنے حصے کے طلبگار ہوں، تو کسی ایک یا دو ورثاء کا زبردستی دوسروں کے حصے پر غاصب و قابض بن کر رہنا درست نہیں ہے۔

لاوصیۃ لوارث

سوال: 143

ایک سروے زمین جس کے سروے نمبر: 522,99,96,94 ہیں، جو تقریباً 22 ایکڑ رقبے پر واقع دیہہ ملھ تپودر سانو چھنو مرادمیمن گوٹھ ضلع ملیر کراچی میں واقع ہیں۔ جس کا اصل مالک مرحوم حاجی روزو ولدیت حاجی انگارو مرحوم ہیں، حاجی روزو کے انتقال کے بعد تین بیٹے بنام، عبد، الیاس، یوسف اور چار بیٹیاں (بشمول حاجیانی مریم) ہیں۔ گورنمنٹ سندھ (ریوینیو ڈپارٹمنٹ) کے مطابق پوری زمین صرف تین بیٹوں کے نام کر دی گئی ہے اور بیٹیوں کو اپنے حق سے محروم رکھا گیا ہے اور

ریکارڈ میں یہ لکھا گیا ہے کہ حاجی روزو نے اپنی زندگی میں پوری زمین صرف اپنے بیٹوں کے نام کردی ہے۔اس کا ریکارڈ میں نہ کوئی گواہ ہے نہ ہی شہادت۔ہمیں اس بات کا خدشہ ہے کہ ریکارڈ میں غلط اندراج کیا گیا ہے۔شرعی نقطہ نظر سے حاجیانی مریم جو حاجی روزو مرحوم کی حقیقی وارث ہے اس کا مندرجہ بالا سروے نمبر میں اس صورتِ حال میں حق بنتا ہے کہ نہیں؟۔(عبداللہ میمن، 814 , بلاک 16 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 10 حصوں میں منقسم ہوگا۔تین بیٹوں کو 6 حصے (ہر ایک کو 2 حصے) چار بیٹیوں کو 4 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے ،گورنمنٹ سندھ (ریوینیو ڈپارٹمنٹ) کے مطابق کاغذات میں جن بیٹوں کو نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں اور اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں بیٹوں کے نام کیا ہو تو شرعاً جائز نہیں اور اگر وصیت بھی کی ہو تو وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذي حقّ حقّه فلا وصية لوارث"۔

ترجمہ:''ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے تو

(اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسۃ الریان بیروت)"۔

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کا کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہو جائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك؛قال:قال رسول اللهﷺ: "من فرّ من ميراث وارثه،قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة" .

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

بہر حال صورتِ مسئولہ میں مرحوم روزو خان کا ترکہ اس کے تمام ورثاء میں اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ میں مقدم کون؟

سوال: 144

چوہدری سردار خان کا انتقال 1939ء میں ہوا، ان کی اولاد اور پسماندگان میں متعدد ورثاء تھے، جن کو ایک نقشے کی صورت میں ہم نے ان سب کی تواریخ وفات کے ساتھ مرتب کر کے اس استفتاء کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ان کے پوتے وحید اسلم کا 1986ء میں انتقال ہوا، متوفی وحید اسلم کے ورثاء میں ان کے تین حقیقی چچا، دو حقیقی پھوپھیاں اور چار سوتیلے چچا اور دو سوتیلی پھوپھیاں ہیں۔لیکن وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے تینوں حقیقی چچا اور ایک حقیقی پھوپھی وفات پا چکی تھیں، ان کی وفات کے وقت ان کی چار سوتیلے (علاتی) چچا اور ایک حقیقی اور دو سوتیلی

پھوپھیاں حیات تھیں ۔ اسکے علاوہ حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی چچازاد) کی اولاد بھی مو
جود تھی ۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے والد کے نکاح میں دو بیویا
ں تھیں، وحید اسلم کی حقیقی والدہ ان سے پہلے 1948ء میں وفات پا چکی تھیں جبکہ ان
کی سوتیلی والدہ رحیم جان نے وحید اسلم کے بعد 1989ء میں وفات پائی ۔ ہم نے
چوہدری سردار خان کے ورثاء کا مفصل نقشہ بھی منسلک کر دیا ہے، کتاب وسنت اور فقہ
حنفی کی روشنی میں بتائیں کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وراثت کے حقدار کون کون
ہیں، اور کون سے ورثاء محروم رہیں گے؟۔ (محمد امجد ریٹائرڈ سیشن جج، ماڈل ٹاؤن، بہا
ول پور)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے، اور متوفی وحید اسلم کے ورثاء وہی ہیں، جو
سوال میں مذکور ہیں، اور وہ لاولد ہے، تو از روئے شرع سب سے پہلے اس کے ترکے
سے اسکی تکفین وتدفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے ذمہ
اگر کسی کا کوئی قرضہ تھا تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو
گی تو بقیہ ترکے کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حد تک وہ نافذ العمل ہو گی ۔ بعد ازاں جو
ترکہ بچے گا، شریعت کے قانون وراثت کے مطابق اس کے شرعی وارثوں میں تقسیم ہو
گا، اس کا ترکہ چار حصوں پر منقسم ہو گا اور اس کے سوتیلے چچاؤں میں سے ہر ایک کو
ایک ایک حصہ ملے گا (یعنی فی کس 1/4 حصہ)۔

ہمیں استفتاء میں چوہدری سردار خان کے ورثاء کا مفصل نقشہ فراہم کیا گیا ہے، لیکن اس
میں جو

جواب مطلوب ہے، وہ چوہدری سردار خان مرحوم کے پوتے وحید اسلم ولد محمد اسلم خان

متوفی 1986ء کے ترکے سے متعلق ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے حصہ میں جو موروثی مال آیا ہے وہ اس کے والد محمد اسلم خان ولد چوہدری محمد سردار خان متوفی 1984ء کا ترکہ ہے، ممکن ہے اس کا اپنا کوئی کمایا ہوا مال بھی ہو، تو وہ بھی اس کے مجموعی ترکے میں شامل ہوگا، البتہ محمد اسلم خان ولد چوہدری سردار خان کا جو ترکہ وحید اسلم کو منتقل ہوگا، اس میں سے ایک 1/8 حصہ محمد اسلم خان کی بیوہ رحیم جان متوفی 1989ء (جو کہ وحید اسلم کی سوتیلی والدہ ہیں) کو ملے گا، جو محمد اسلم کی وفات کے وقت حیات تھیں، چونکہ بعد میں یہ 1989ء میں وفات پا گئیں، اس لئے ان کا ترکہ ان کے اُن شرعی ورثاء کو منتقل ہوگا، جو اِن کی وفات کے وقت موجود تھے۔ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت ان کے حقیقی چچا وفات پا چکے تھے، البتہ انکے چار سوتیلے چچا زندہ تھے، اور ان کی ایک حقیقی پھوپھی اور دو سوتیلی پھوپھیاں زندہ تھیں حقیقی چچا اس لئے محروم ہو گئے کہ جو وارث مورِث (جس کی وراثت تقسیم ہو رہی ہے) کی وفات سے پہلے فوت ہو گیا ہو، وہ اسکا وارث نہیں بنتا، حق وراثت ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے جو مورِث (وفات یافتہ شخص) کی وفات کے وقت زندہ ہوں، وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت اس کی حقیقی پھوپھی جنت بی بی متوفی 1991ء، سوتیلی پھوپھی متوفی 2003ء اور شفیقہ بیگم (بدستور حیات) زندہ تھیں، لیکن یہ سب وراثت سے محروم رہیں گی، کیونکہ یہ پھوپھیاں ذوی الارحام بنتی ہیں اور چار سوتیلے چچا عصبات، اور اسلام کے قانون وراثت کا شرعی اصول یہ ہے کہ عصبات ورثاء کی موجودگی میں ذوی الارحام ورثاء ترکے سے محروم رہیں گے، اسی طرح وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے وفات یافتہ حقیقی چچاؤں کی اولاد بھی جو کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت بقید حیات تھے، ان کے ترکے سے محروم رہیں

گے، کیونکہ اسلامی قانون وراثت کا مسلمہ اصول ہے کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے، اور یہاں سوتیلے چچا ایک قرابت کے حامل ہونے کے باوجود حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی ابنائے اعمام) کے ذوقرابتین ہونے کے باوجود ان کے قریب سے ہیں لہٰذا سارا ترکہ سوتیلے چچاؤں کو ملے گا اور حقیقی چچازاد محروم رہیں گے۔ یہاں تک ہم نے مسئلے کا خلاصہ آسان الفاظ میں لکھ دیا ہے، اب سطور ذیل میں فنی بنیاد پر دلائل کے

ساتھ جواب ملاحظہ فرمالیجئے:

"برتقدیر صدق بیانِ سائل صورۃ مستفسرہ میں مرحوم وحید اسلم کی وراثت چاروں سوتیلے چچاؤں کو ملے گی۔ اور بعد ادائے حقوق مترتبہ متقدمہ، تکفین وتجہیز اور ادائے قرض اور مال کے تیسرے حصہ سے تنفیذ وصیت، کل جائیداد کے چار حصے کیے جائیں گے اور ہر ایک سوتیلے چچا کو ایک ایک حصہ آئے گا۔ حقیقی چچاؤں کی اولاد، حقیقی پھوپھی اور سوتیلی پھوپھیاں جو کہ مرحوم کے وفات کے وقت زندہ تھیں حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد تو اس لئے محروم ہوگی کہ عصبات اقرب اگرچہ اضعف ہو، ابعد کو محروم کردیتا ہے اور یہاں اگرچہ سوتیلے چچا ذوات قرابتین نہیں اور حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد ذوات قرابتین ہیں لیکن سوتیلے چچے میت سے اقرب ہونے کی وجہ سے حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد کو محروم کردیں گے اور مرحوم کی حقیقی اور سوتیلی پھوپھیاں اور حقیقی چچاؤں کی مؤنث اولاد ذوی الارحام میں سے ہیں اور عصبات کے ہوتے ہوئے ذوی الارحام محروم ہوتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

ثم جزء جدہ العم لابوین ثم لاب ثم ابنہ لابوین ثم لاب۔

ترجمہ: میت کے دادا کی جز یعنی چچا حقیقی پھر سوتیلا چچا پھر حقیقی چچا کا بیٹا پھر سوتیلے چچا کا بیٹا (ص: 547 مکتبہ ماجدیہ)

معلوم ہوا اگر حقیقی چچا ورثاء میں موجود نہ ہو تو سوتیلا چچا وارث ہوتا ہے اور حقیقی چچا کا بیٹا اس وقت وارث ہو گا جب سوتیلا چچا ورثاء میں موجود نہ ہوں یہ عبارت بعینہ صورت مسئولہ کا جواب ہے۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق کے متن میں ہے:

ثم الا عمام ثم اعمام الاب ثم اعمام الجد علی الترتیب۔

ترجمہ: پھر متوفی کے چچا پھر متوفی کے باپ کے چچا پھر دادا کے چچا ترتیب پر۔

شارح علیہ الرحمہ نے فرمایا: (قولہ علی الترتیب) ای علی الترتیب الذی ذکرنا فی الاخوۃ وھو ان یقدم العم لاب وام علی العم لاب ثم العم لاب علی ولد العم لاب وام کذا یعمل فی اعمام الاب یقدم منھم ذو قرابتین عند الاستواء فی الدرجۃ وعند التفاوۃ فی الدرجۃ یقدم الاعلیٰ۔

ترجمہ: ''(ماتن کا قول علی الترتیب) یعنی چچاؤں میں ترجیحات اسی ترتیب پر ہونگی ،جس ترتیب کو ہم نے بھائیوں میں ذکر کیا، وہ یہ کہ حقیقی چچا سوتیلے چچا، سے مقدم ہوگا ،پھر سوتیلا چچا حقیقی چچا کی اولاد سے مقدم ہوگا، اسی طرح باپ کے چچاؤں میں ان میں سے دو قرابت والوں کو مقدم رکھا جائے گا جبکہ درجے میں مساوی ہوں اور درجے میں تفاوت کی صورت میں اقرب (Nearest) کو مقدم کیا جائے گا، (تبیین الحقائق جلد 6 ص: 632، بحر الرائق شرح کنز الدقائق جلد 4 ص: 498 مکتبہ سعید ایچ ،ایم کمپنی)''۔

نیز م البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے: واذا استوی ابنا ن فی درجۃ من

االعصبات وفی احدھما قرابۃ زائدۃ فھی اولیٰ ،الا ان یکون الاخ اقرب الی المیت ،مثال القرابۃ الزائدۃ اخ لاب وام واخ لاب،فالاخ من الاب والام اولیٰ،ومثال السبق اخ لاب وابن اخ لاب وام، فالاخ اولیٰ لانہ اسبق الی المیت ۔

ترجمہ:''اگر عصبات میں دو بیٹے درجے میں مساوی ہوں،اوران میں سےایک میں زائد قرابت ہو،تو زائد قرابت والا اولیٰ ہوگا،مگر یہ کہ بھائی میت کے زیادہ قریب ہو، قرابت زائدہ کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک حقیقی بھائی ہے اور ایک علاتی (باپ شریک)بھائی ہے،تو حقیقی بھائی ،علاتی بھائی سے زیادہ قریب ہے،اور سبقت کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک علاتی بھائی ہے اور ایک حقیقی بھتیجا ہے،''تو علاتی بھائی حقیقی بھتیجے کی بہ نسبت میت سے زیادہ سبقت رکھتا ہے''،(ص:98جلد 4)۔

درمختار کی عبارت:''ثم لاب ثم ابنـــــہ لابـو یـن''اور''تبیین الحقائق''اور ''البحرالرائق'':''ثم العم لاب علی ولد العم لاب وام'' ۔

صورت مسئولہ کے جواب میں اصل ہے ،لہٰذا مرحوم وحید اسلم کی جائیداد چاروں سوتیلے چچاؤں میں برابر برابر تقسیم ہوگی اور باقی افراد محروم ہونگے ،واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ اور برٹش لاء

سوال:145

برائے مہربانی قرآن اور حدیث کی روشنی میں فتویٰ عنایت فرمائیں۔ایک شخص چوہدری سردار خان ،جس کا انتقال 1939ء میں ہوا۔اس کے سات بیٹے، چار بیٹیاں اور دو بیوہ تھیں۔جائیداد کا انتقال ان کی وفات کے بعد بیٹوں کے نام ہوگیا ،اوراس جائیداد کو پچھلے ماہ 2006ء میں فروخت کیا گیا۔بیٹے کہتے ہیں کہ چونکہ

اس وقت برٹش لاء تھا اور بیٹیوں اور بیوگان کو جائیداد میں حصہ نہیں ملتا تھا، اس لئے ان کا اس رقم میں کوئی حصہ نہیں بنتا۔ جبکہ ہماری گذارش ہے کہ قرآن اور حدیث کا قانون جو سورۂ نساء میں ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے، برائے مہربانی آپ اس کے بارے میں فتویٰ عنایت فرمائیں اور جو اس پر عمل نہیں کرے گا آخرت میں اس کی کیا سزا ہوگی؟، (ندیم الحق، اسٹاف آفیسر ٹو چیئر مین PIA، اسلام آباد)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفیٰ شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کیے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ برٹش لاء سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا مقررہ قانون وراثت منسوخ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا قانون سب پر غالب ہے اور مسلمانوں کو احکام الٰہی پر عمل کرنا چاہئے نہ کہ برٹش لاء پر، اگرچہ برطانوی دور میں ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء نافذ تھا، اور اسلام کا قانون وراثت قانوناً نافذ العمل تھا، لہٰذا یہ موقف سراسر باطل ہے۔

صورت مسئولہ میں متوفیٰ چوہدری سردار خان کا ترکہ کل 144 حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے دو بیوگان کو 18 حصے (یعنی فی کس 9/144 حصے)، سات بیٹوں کو 98 حصے (یعنی فی کس 14 / 144 حصے)، چار بیٹیوں کو 28 حصے (یعنی فی کس

7/144 حصے)ملیں گے۔اگر کوئی کسی شخص کا حق غصب کرے گا،اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وعید ہے:"من اقتطع شبراً من الارض ظلماً، طوّقه الله ايّاه يوم القيامة من سبع أرضين "۔

ترجمہ:''جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:4055)''۔اس کے بعد ان میں سے جو افراد وفات پا چکے ہیں تو ان کا حصۂ وراثت ان کے وارثوں کو منتقل ہو جائے گا،تا آنکہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچ گا،تقسیم وراثت کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی مورث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) کے انتقال کے فوراً بعد اس کی وراثت تقسیم نہ کی گئی ہو اور پھر اس پر کافی عرصہ گزر چکا ہو، یہاں تک کہ اس دوران کچھ ورثاء وفات پا چکے ہوں تو انہیں زندہ فرض کر کے ان کا حصۂ وراثت ان کے نام پر منتقل ہو گا،اور پھر وہی حصہ مرحلہ بہ مرحلہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچ جائے گا،فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

لاولد چچا کے ترکے میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حقِ وراثت

سوال: 146

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ش کی کوئی اولاد نہیں تھی ،زوجہ کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور نہ ہی کوئی بھائی یا بہن ہے۔انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے دو بھتیجوں کو کاروبار میں 50% کا حصہ دار قرار دیا۔ش کا انتقال ہو چکا ہے اور دونوں بھتیجے دوسرے حصہ دار سے معاملات طے کر کے کاربار کو ختم کر رہے ہیں۔اور دونوں بھائی ان کی جائیداد میں سے حصہ لے رہے ہیں جبکہ ان بھتیجوں کی 4 بہنیں بھی ہیں۔ان بھتیجوں اور بھتیجیوں کی شادی بھی چچا نے کی ہے۔کیا چچا کی اس

وراثت میں بھتیجیاں حصہ لینے کی حقدار ہیں یا نہیں ؟۔ براہِ کرم تفصیل سے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں، (کوثر پروین،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفیٰ شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایسا مُورِث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) جو لاولد ہو، اس کے ماں باپ بھی اس سے پہلے وفات پاچکے ہوں، بیوی نہ ہو یا وفات پاچکی ہو، اسے قرآن کی اصطلاح میں ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ اس کی وراثت کے احکام ''سورۃ النساء'' میں بیان کئے گئے ہیں۔ صورتِ مسئولہ میں اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو چونکہ متوفی کے ورثاء میں اس کے دو بھتیجے اور چار بھتیجیاں ہیں اور ذوی الفروض میں کوئی قرابت دار موجود نہیں، لہٰذا دونوں بھتیجے عصبہ بنیں گے اور کل ترکہ انہیں ملے گا، بھتیجیاں محروم رہیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الحقوا الفرائض بأھلھا فما بقی فھو لاولیٰ رجل ذکر۔

ترجمہ: ''ذوی الفروض (یعنی وہ ورثاء جن کے حصے قرآن میں مقرر ہیں) کو ان کے

مقررہ حصے دے دو، سو جو کچھ ان سے بچ رہے تو وہ قریب ترین مرد وارث کے لئے ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6735)"۔

علامہ ابن عابدین شامی بحوالہ "سراجی" لکھتے ہیں:

لا فرض لها من الاناث واخوها عصبة لا تصير عصبة بأخيها كالعم والعمة المال كله للعم دون العمة۔

ترجمہ: "وہ عورتیں جن کا کوئی فرض حصہ مقرر نہیں اور ان کا بھائی عصبہ ہے تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ عصبہ نہیں بنیں گی، جیسا چچا اور پھوپھی کہ کل ترکہ چچا کو ملے گا نہ کہ پھوپھی کو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 10، ص: 429، داراحیاء التراث العربی ،بیروت)"۔

اس کی شرح میں مفتی یار محمد قادری لکھتے ہیں: كذالك ابن العم يرث دون بنت العم و ابن الاخ يرث دون بنت الاخ۔

ترجمہ: "اور اسی طرح چچا کا بیٹا وارث بنے گا نہ کہ چچا کی بیٹی اور اسی طرح بھتیجا عصبہ بنے گا نہ کہ بھتیجی، (مشکوۃ الحواشی فی شرح السراجی، ص:60)"۔

لاولد پھوپھی کے ترکے میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے

سوال: 147

ایک شخص فضل دین کا انتقال ہوا اور اس کی دو بیویاں تھیں ان دونوں کا انتقال فضل دین سے پہلے ہو چکا تھا۔ ایک بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی دوسری بیوی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ دوسری بیوی سے جو ایک بیٹی سید خانم ہیں ان کے شوہر کا انتقال پہلے ہو چکا تھا وہ لاولد تھیں۔ میں سید خانم کا سگا بھتیجا ہوں، اور اپنے والدین

کا اکلوتا بیٹا ہوں، میری پھوپھی سید خانم کے سگے بھائی اور دو سوتیلے بھائیوں اور سوتیلی بہن کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا۔سید خانم کے سوتیلے بہن بھائیوں کی اولاد حیات ہے۔اب سوال یہ ہے کہ سید خانم کا ترکہ صرف مجھے (حقیقی بھتیجے) کو ملے گا یا ان کے سوتیلے بھتیجوں اور بھتیجیوں کو بھی ملے گا، (محمد یوسف، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں (1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کیے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو ، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثا ء میں تقسیم ہوتا ہے۔فضل دین کا ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا،اس میں سے ان کے تین بیٹوں کو 6 حصے (فی کس 2 حصے) اور 2 بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس ایک حصہ) ملے گا،لہٰذا آپ کی پھوپھی سید خانم کا اپنے والد کے ترکے میں سے 1/8 حصہ بنے گا۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کی پھوپھی لاولد تھیں آپ کے بیان کے مطابق ان کے شوہر کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا اور آپ اپنی پھوپھی کے صرف ایک ہی حقیقی بھتیجے ہیں اور باقی ان کے سوتیلے (یعنی علاتی) بھتیجے بھانجیاں ہیں ،لہٰذا آپ ان کے عصبہ وارث بنیں گے اور مرحومہ سید خانم کا پورا ترکہ آپ کو ملے گا،سراجی میں ہے: وابن الاخ لاب وام اولیٰ من ابن الاخ لاب۔ ترجمہ:’’یعنی حقیقی بھتیجا، علاتی (صرف باپ شریک) بھتیجے سے ترکہ پانے میں مقدم ہے‘‘۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

سوال: 148

ایک شخص نے ایک کتابیہ (عیسائی) عورت سے شادی کی ،اس سے اس کی اولاد ہوئی ۔پھر اس (شوہر) کا انتقال ہوگیا ،دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(1) کیا وہ عیسائی عورت اپنے شوہر کی وارث بنے گی؟۔

(2) اور اس کی اولاد نے اگر عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے تو کیا وہ وارث بن پائیں گے؟۔

(3) اگر بچے نابالغ ہیں تو کیا وہ وارث بنیں گے؟،(ایم،عتیق الرحمٰن سیال)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:عن اسامة بن زید ان النبی ﷺ قال:

لا یرث المسلم الکافر ولا یرث الکافر المسلم:

ترجمہ:"حضرت اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے،نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے،(صحیح مسلم رقم الحدیث:4028،ابی داؤد رقم الحدیث:2901)"۔

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور جمہور صحابہ اور فقہاء،تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا،(شرح مسلم للنووی،جلد 2ص:34،نور محمد اصح المطابع)"۔

میراث سے محروم کرنے والے چار اسباب ہیں،ایک سبب دین کا اختلاف ہے،یعنی میت اور وارث کا دین ایک دوسرے سے مختلف ہو۔

عن عمروبن شعیب ، عن ابیہ ، عن جدہ عبداللہ بن عمروقال: قال رسول اللہ ﷺ: لایتوارث اھل ملتین شتیٰ۔

ترجمہ: ''حضرت عمروبن شعیب اپنے والد اوردادا عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دومختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے۔(سنن ابی داؤدرقم الحدیث:2903)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدین ایضا یمنع الارث والمرادبہ الاختلاف بین الاسلام والکفرواما اختلاف ملل الکفار کالنصرانیۃ والیھودیۃ والمجوسیۃ وعبدۃ الوثن فلا یمنع الارث حتی یجری التوارث بین الیھودی والنصرانی والمجوسی واختلاف الدارین یمنع الارث کذا فی التبیین۔ولکن ھذا الحکم فی حق اھل الکفرلافی حق المسلمین۔

ترجمہ: ''اوردین کا اختلاف بھی مانع ارث ہے، اوراس سے مراد اسلام اور کفر کے درمیان اختلاف ہے اورجب اختلاف کفارقوموں کے درمیان ہو، جیسا کہ نصرانی اور یہودی اورمجوسی اوربت پرست،توپھروہ وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں)۔یہاں تک کہ یہودی اورنصرانی اورمجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اوردار کا مختلف ہونا (یعنی دارالاسلام ودارالحرب) مانعِ وراثت ہے، جیسا کہ تبیین میں بیان کیا گیا ہے اوریہ حکم اہل کفرکے حق میں ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں، (عالمگیری جلد6 ص:454 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(واختلاف الدین)واسلاماً و کفراً۔

ترجمہ: ''(اور دین کا مختلف ہونا) مانِع وراثت ہے یعنی کہ اسلام اور کفر کا اختلاف''۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قید به لأنّ الکفار یتوارثون فیما بینهم وان اختلف مللهم عندنا،لأنّ الکفر کله ملة واحدة۔

ترجمہ: ''یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں اگر چہ انکا تعلق مختلف ملتوں سے ہو،اس لئے کہ تمام کفر ملّتِ واحدہ ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 10 ص : 418،مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس مسلّمہ شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت (خواہ نصرانی ہو یا یہودی) اپنے متوفّی مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔ مسلمان شوہر اور کتابیہ عورت کی اولاد اگر نابالغ ہے تو وہ دین میں ''خیرالابوین'' کے تابع ہے،یعنی انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے ان کے مسلمان باپ کی وراثت میں حصہ دیا جائے اور اگر وہ بالغ ہیں تو مسلمان ہونے کی صورت اپنے باپ کے وارث بنیں گے،لیکن اگر خدانخواستہ بالغ ہونے کے بعد وہ نصرانی یا یہودی بن گئے ہیں،تو مسلمان باپ کی وراثت سے محروم رہیں گے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والولد یتبع خیر الأبوین دیناً)ان اتحدت الدار ولو حکماً، بان کان الصغیر فی دارنا والأب ثمة،

ترجمہ: ''اور اولاد دین میں خیرالابوین (یعنی ماں باپ میں سے جس کا دین بہتر ہو،جیسے ایک یہودی یا نصرانی ہے اور دوسرا مسلم،تو نابالغ اولاد مسلم متصور ہوگی، اگر ایک نصرانی ہے اور دوسرا مجوسی یا مشرک،تو نابالغ اولاد نصرانی متصور ہوگی) کے

تابع ہوتی ہے، اگر دار ایک ہی ہو، خواہ حکماً ہی سہی، جیسے نابالغ اولاد دارالاسلام میں ہے اور باپ بھی وہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 4 ص: 276 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

تقسیمِ وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت

ہمیں روزنامہ ایکسپریس کی معرفت ترکے اور وراثت کے متعدد سوالات موصول ہوئے ہیں۔سوالات کا براہ راست جواب دینے سے پہلے ہم چند امور کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، اور ہر ترکے کی تقسیم سے پہلے ان کا نفاذ ضروری ہے، ہم نے یہ وضاحت اس لئے مناسب سمجھی تاکہ وراثت کے ہر سوال کے جواب میں ان کا بار بار تکرار نہ ہو، وہ امور یہ ہیں: (1) کوئی شخص زندگی میں اپنا مال اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو یہ تقسیم وراثت یا تقسیم ترکہ نہیں کہلائے گی بلکہ ھبہ (Gift) کہلائے گا، یہ ایک رضا کارانہ عمل ہے، اس لئے اس شخص کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ کتنا مال تقسیم کرے اور کتنا اپنے لئے پس انداز کرے۔ (2) بیوی شوہر کو یا شوہر بیوی کو جتنا مال ھبہ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔(3) اولاد کو ھبہ کرنا ہو تو مستحسن اور مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے، امتیاز نہ برتا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔(4)(الف) اگر اولاد میں سے کسی کو اس کی غیر معمولی خدمات کا لحاظ کر کے یا اس کی کسی ذہنی یا جسمانی پسماندگی کی بنا پر یا نسبتاً زیادہ ضرورت مند ہونے کے سبب یا دینی فضیلت کی بنا پر نسبتاً زیادہ دینے کا ارادہ ہو تو دوسروں کو اعتماد میں لے لیا جائے، تو بہتر ہے۔(ب) اگر اولاد میں سے کوئی آوارہ وبدکردار ہے، حرام کاری اور عیاشیوں میں مبتلا ہے، تو اسے ھبہ کے وقت محروم رکھا جا سکتا ہے یا اس کے حصے میں کمی کی جا سکتی

ہے۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ: ایک شخص کی اولاد ایک لڑکے اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے،لڑکا بدچلن اور بد وضع ہے، اپنی بہنوں اور باپ کو نہایت اذیت اور تکلیف دیتا ہے، زید اسے عاق کرنا چاہتا ہے کہ وہ ترکے میں سے حصہ نہ پائے۔آپ نے جواب دیا: "عاق کرنا شرع میں کوئی چیز نہیں، نہ وہ اس کے سبب ترکے سے محروم ہوسکتے ہیں، ہاں اگر واقعی فاسق وآوارہ ہے تو یہ جائز ہے کہ اپنا سب مال بذریعہ وقف علی الاولاد یا بذریعہ بیع نامہ جدا جدا تقسیم کرکے قبضہ دے کر بذریعہ ھبہ نامہ اپنی بیٹیوں کے نام کردے، یوں بیٹے کو آپ ہی کچھ نہ پہنچے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص: 364، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔ (5) اولاد کو ماں باپ کی زندگی میں تقسیم وراثت کے مطالبے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ "ترکہ" یا "وراثت" اسے کہتے ہیں، جو مال کوئی شخص اپنی موت کے بعد پیچھے چھوڑ جائے۔ (6) میت کے ترکے میں سب سے پہلے تین قسم کے مصارف ترجیح ذیل کے مطابق وضع کئے جانے لازمی ہیں: (الف) میت کی تکفین وتدفین کے مصارف، اگر کوئی ایک وارث رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ (ب) اس کے بعد اگر میت کے ذمہ کسی کا کوئی قرضہ ہے تو وہ ادا کیا جائے گا۔ (ج) اگر وفات یافتہ شخص نے بیوی کا حق مہر اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا، نہ ہی بیوی نے اپنا مہر معاف کیا ہے تو ترکہ میں سے بیوی کا دینِ مہر قرض کے طور پر ہی وضع کیا جائے گا۔ (د) قرض کی منہائی کے بعد، اگر میت نے کوئی وصیت (امورِ خیر، صدقۂ جاریہ وغیرہ سے متعلق) کی ہے تو اسے ترکے میں سے پورا کیا جائے گا، لیکن وصیت کی تنفیذ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک ہوگی، اس سے زائد باطل (Invalid) قرار پائے گی۔ البتہ اگر کوئی ایک یا بعض یا سب ورثاء بالغ ہیں اور وہ رضاکارانہ اپنے متوفی باپ/ماں

WWW.NAFSEISLAM.COM

یا عزیز کی پوری وصیت نافذ کرنا چاہتے ہیں، جو تہائی ترکے سے زائد ہے، تو وہ ایسا کرسکتے ہیں اور اس پر یقیناً انہیں بھی اجر ملے گا۔ (7) جہاں تک میت کے لئے ایصالِ ثواب کے مصارف کا تعلق ہے، تو اگر اس نے اپنی وفات سے پہلے ایسی کوئی وصیت کی ہے، تو وہ زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک نافذ العمل ہوگی۔ (8) اگر وصیت نہیں کی تو بالغ ورثاء اپنی طرف سے یا ترکے میں سے اپنے حصے سے کرنا چاہیں تو رضاکارانہ طور پر کرسکتے ہیں، انہیں بھی اس کا اجر ملے گا، کوئی وارث اس پر رضامند نہ ہو تو اس کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کیے جاسکیں گے۔ (9) نابالغ ورثاء کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کیے جاسکیں گے۔

شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیمِ ترکہ

سوال: 149

ایک پلاٹ جو بیوی اور شوہر نے مشترکہ طور پر خریدا یعنی بیوی بھی فیکٹری میں کام کرتی تھی اور شوہر بھی۔ دونوں کی کمائی سے پلاٹ خریدا گیا اور شوہر نے وہ پلاٹ اپنی بیوی کے نام سے خریدا۔ بیوی کے انتقال کے بعد پلاٹ کا مالک کون ہوگا؟ جبکہ ورثاء میں اس کا شوہر اور ایک آٹھ سالہ بیٹا بھی ہے کیا بیوی کے والدین اور بھائی حصے دار یا دعوے دار بن سکتے ہیں، جھگڑا کر کے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کرسکتے ہیں؟۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو وفات یافتہ خاتون کا ترکہ 12 حصوں میں منقسم ہوگا، جس میں اس کے والد کو 2/12 حصے، والدہ

کو 2/12 حصے، شوہر کو 3/12 حصے اور بقیہ 5/12 حصے بیٹے کو ملیں گے، اس کے بھائی محروم رہیں گے۔ پلاٹ کی خرید میں بیوی اور شوہر کے حصے کا تناسب وہی ہوگا، جو پلاٹ کی قیمت میں ان کے حصے کا تناسب تھا، اگر یہ پلاٹ شراکت کی نیت سے خریدا تھا۔ اور اگر شوہر نے اپنا حصہ بیوی کو ھبہ کردیا تھا تو پھر پورے پلاٹ کی وہی مالکہ ہوگی اور اب وہ اس کے ترکے میں شامل ہوگا۔ بیوی کے والدین اس کے شرعی وارث ہیں، اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے بھائی محروم رہیں گے، کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کے لئے بڑی وعید آئی ہے حدیث پاک میں ہے:

"من اقتطع شبراً من الارض ظلماً، طوّقه الله ایاه یوم القیامة من سبع أرضین"۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)''۔

بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟

سوال: 150

کسی شخص کی بیوی کے انتقال کے بعد اس کی بیوی پر واجب الادا قرض کی ادائی کون کرے گا۔ کیا شوہر اپنی جائیداد مکان وغیرہ فروخت کرکے بیوی کا قرضہ ادا کرے گا؟ ان سوالات کے تفصیلی جواب ایکسپریس میں عنایت فرمائیں، بڑی نوازش ہوگی، (محمد فاروق، ملت ٹاؤن، ملیر کراچی)۔

جواب:

متوفیہ کے ترکے سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، اگر شوہر نے اس کی زندگی

میں اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو وہ شوہر کے ذمہ اس کا قرض ہے، وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہو جائے گا۔ اسے بھی اس کا قرض ادا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، اگر متوفیہ کا ترکہ اس کے قرض کی ادائی کے لئے ناکافی ہو تو اس کے شوہر اور دیگر ورثاء اگر تبرّع واحسان کر کے اس کا قرض ادا کر دیں تو آخرت کے مواخذے سے اُسے نجات مل جائے گی اور ان لوگوں کو اس کا اجر بھی ملے گا، ورنہ قرض خواہوں سے درخواست کی جائے کہ رضاء الٰہی کے لئے اس کے ذمہ اپنا قرض معاف کر دیں یا کوئی اور صاحب خیر یہ قرض ادا کر دے، ورنہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ھریرۃ انّ رسول اللہ ﷺ قال اتدرون ماالمفلس قالوا المفلس فینا من لا درھم لہ ولا متاع فقال انّ المفلس من امتی یأتی یوم القیامۃ بصلٰوۃ وصیام وزکوٰۃ ویأتی قد شتم ھذا وقذف ھذا واکل مال ھذا وسفك دم ھذا وضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ فان فنت حسناتہٗ قبل ان یقضی ماعلیہ اخذ من خطایا ھم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے کہا: ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس درہم ہو نہ کوئی متاع ہو، آپ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا اور اس شخص نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی تھی، کسی کو تہمت لگائی تھی، کسی کا مال کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا، کسی کو مارا تھا، پھر اسے اس کی نیکیاں مل جائیں گی اور اس سے اس کی نیکیاں جائیں گی اور اگر ان کے حقوق پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو ان کے

گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6457)"۔

زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

سوال: 151

میرے سات بچے (چار بیٹے، تین بیٹیاں) ہیں، بڑے بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادی کردی ہے۔میرے پاس جائیداد کی صورت میں ایک مکان ہے شوہر بھی حیات ہیں۔شرعی طور پر جائیداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (ثریا ناز، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

زندگی میں جائیداد کی تقسیم بطور ترکہ ومیراث نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ دیا جاتا ہے وہ ھبہ کہلاتا ہے اور مستحسن ومستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے شوہر کو اپنی صوابدید پر جتنا چاہیں دی سکتی ہیں، اپنے لئے جو پس انداز کرنا چاہیں، یہ ان کا حق ہے، آپ کی وفات کے بعد یہ ترکہ شریعت کے مطابق تمام وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

کیا سوتیلا بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے

سوال: 152

میرے والد صاحب نے پہلی شادی کی تو اس سے ہم تین بہنیں پیدا ہوئیں ہماری والدہ زندہ تھیں کہ والد صاحب نے دوسری شادی کرلی۔دوسری بیوی کا ایک لڑکا تھا، جو اس کے پہلے خاوند سے تھا وہ بھی ہمارے والد صاحب نے ساتھ ہی لے لیا

۔بعد میں ہماری دوسری والدہ کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں ۔اس طرح ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

ہمارے والد صاحب کے لئے تقسیم جائیداد کا طریقہ کیا ہے؟۔

اگر اولاد میں جائیداد کی تقسیم نہ کی جائے تو اس کے کیا احکام ہیں؟۔

کیا اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم کیا جا سکتا ہے؟۔

کیا کسی ایک شخص کو پندرہ سال پہلے ساری جائیداد کا وارث بنایا جا سکتا ہے؟ کہ وہ اکیلا استعمال کرتا رہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں مکمل وضاحت فرمائیں ،(م ۔ا،نارووال،پنجاب)''۔

جواب:

آپ نے سوال میں اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ آپ کے والد صاحب حیات ہیں یا وہ وفات پا چکے ہیں،اگر وہ بدستور حیات ہیں تو زندگی میں ان کا ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔اسی طرح یہ بھی واضح نہیں کہ آپ کی دوسری والدہ بدستور حیات ہیں یا نہیں؟۔کسی شخص پر لازم نہیں ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اپنی اولاد پر تقسیم کرے، یہ اس کی اپنی صوابدید ہے، چاہے تو اولاد کو ھبہ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔البتہ اولاد کے درمیان ھبہ میں رسول اللہ ﷺ نے مساوات کی ہدایت فرمائی ہے۔کسی شخص کی وفات کے بعد اس کا ترکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے،اس میں مرنے والے کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا، نہ ہی وہ کسی کو وراثت سے محروم کرسکتا ہے۔کسی شخص کی بیوی کا وہ بیٹا جو کسی سابق شوہر سے ہے، اس کا وارث نہیں بن سکتا، نہ منہ بولا بیٹا وارث بن سکتا ہے، البتہ وہ اپنی ماں کا وارث ہوگا۔سوال میں درج پانچ بیٹیوں کو والد کی وفات کی صورت میں ترکے کا 2/3 حصہ

ملے گا، جس میں ہر ایک کا حصہ برابر برابر ہوگا، باقی دیگر ورثاء کا ہوگا۔ اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تا کہ دوسرے ورثا محروم ہو جائیں، ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: عن أنس بن مالك،قال:قال رسول اللهﷺ:"من فرّ من ميراث وارثه،قطع اللّٰهُ ميراثه من الجنة يوم القيامة"۔ ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو (حقِ) میراث پانے سے فرار (کی صورتیں) اختیار کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی میراث منقطع فرما دے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:2703 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق

سوال:153

ہمارے والد صاحب مرحوم نے دو شادیاں کیں، دوسری شادی پہلی زوجہ کے انتقال کے بعد کی۔ پہلی زوجہ سے والد صاحب کا ایک بیٹا تھا۔ دوسری زوجہ کا انتقال والد صاحب کے انتقال کے بعد ہوا، دوسری زوجہ سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں، لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ:

۱۔ والد صاحب کے مکان کی شرعی تقسیم کس طرح ہوگی۔

۲۔ مکان کی کون سی قیمت معتبر ہوگی، والد صاحب کے انتقال کے وقت کی یا حالیہ قیمت؟۔

مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں، (عامر عارفین شمسی، 1425/14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

جواب :

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، مرحوم کی پہلی زوجہ کے بیٹے کو 10 حصے، دوسری بیوی کے بیٹے کو 12 حصے اور تین بیٹیوں کو 18 حصے (ہر ایک کو 6 حصے) ملیں گے، مکان چونکہ اب فروخت کیا جائے گا لہٰذا جو قیمت مکان کی اب حاصل ہوگی اسے ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

غیر وارث کو ترکے سے حصہ

سوال: 154

میرے والد صاحب شیخ محمد الیاس کا انتقال 28 جولائی 2006ء کو ہوگیا ہے۔ان کے ورثاء جو حیات ہیں وہ ایک بیٹا شیخ عبدالخالق، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ ہیں، جبکہ دو بیٹوں (محمد یونس اور عبدالمالک) اور ایک بیٹی نفیسہ کا انتقال 13 سے 20 سال پہلے ہوچکا ہے۔مہربانی فرما کر تحریر فرمائیں کہ شرعی طور پر کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جس اولاد کا والد کی زندگی میں انتقال ہوگیا ہے شرعی طور پر ان کے بیٹے یا بیٹیوں کا کوئی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟۔(عبدالخالق، F-153 بلاک 5 اسکیم 5 کلفٹن، کراچی)۔

جواب :

از روئے شرع کسی بھی شخص کی وفات کے بعد جو ترکہ وہ چھوڑ جاتا ہے، اس

میں تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کیے جاتے ہیں:
(1) مصارف تکفین وتدفین (2) اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض باقی ہے تو اس کو ادا کرنا (3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ادائے قرض کے بعد جو ترکہ بچ رہے گا، اسکی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد، بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔متوفی شیخ محمد الیاس کا ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ (محمد الیاس) کو 5 حصے، ایک بیٹا عبدالخالق کو 14 حصے، تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔
صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور متوفّٰی یا متوفاۃ کی براہ راست اپنی اولاد بیٹے اور بیٹیاں بوقت وفات زندہ ہیں، تو ان کی اُس بیٹے یا بیٹی کی اولاد (پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں)، جو مُورِث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والے اپنے ماں یا باپ) کی وفات سے پہلے وفات پاچکی ہے، وراثت سے محروم رہے گی، کیونکہ تقسیمِ وراثت کا ایک مسلّمہ اصول ہے کہ: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے''، اسے ''اصولِ حَجب'' بھی کہتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کی وفات کے وقت اس کے والد بھی زندہ ہیں اور دادا بھی، تو والد کا رشتہ چونکہ میت سے قریب ترین ہے، اس لئے والد کو ترکے سے حصہ ملے گا اور دادا محروم رہے گا، البتہ اگر ایسی صورت ہوجائے کہ کسی شخص کی وفات کے وقت اس کا دادا تو زندہ ہے لیکن والد پہلے وفات پاچکا ہے، اب ترکے کا جو حصہ بصورتِ حیات والد کو ملنا چاہئے تھا، وہ دادا کو ملے گا۔یہی صورتِ حال میت کے بیٹے، بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واذا حضر القسمة اولوا القربیٰ والیتٰمی والمسٰکین فارزقوھم منه وقولوا لھم قولا معروفاo

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے) تو انہیں بھی (رضاکارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء: 8)''۔

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت مقاصد خیر کے لئے سفارش اور مشاورت کی ہے، لہٰذا جتنا حصہ ان یتیم نواسے نواسیوں کی والدہ کے حیات ہونے کی صورت میں انہیں ملنا چاہئے تھا، اگر تمام ورثاء اتفاق رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم تبرّعاً اور استحساناً رضاکارانہ طور پر تقسیم ترکہ سے پہلے ان بچوں کو بطور ہبہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوگا، اور اس کا اجر انہیں ملے گا۔ قرآن مجید حکیمانہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے: **ولیخش** الذین لو ترکوا من خلفھم ذرّیّة ضعٰفاً خافوا علیھم فلیتّقوا اللہ ولیقولوا قولاً سدیداً o ترجمہ: ''اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (اپنی وفات) کے بعد (خدانخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے تو انہیں ان کے (رُلنے اور بے یارومددگار ہونے کا کتنا) خوف ہوتا، تو انہیں چاہئے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء: 9)''۔ تو قرآن نے بتایا کہ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کرکے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کرلیا کرو۔

تقسیم ترکہ

سوال: 155

میرے شوہر کا تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور ان کے ورثاء میں ایک بیوہ (یعنی میں) چار بیٹے، تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کے ترکے میں ایک دکان ہے اور ایک مکان جس میں ہم رہائش پذیر ہیں یہ مکان مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل میرے والد سے میرے ہی نام پر خرید کر مجھے ہبہ کر دیا تھا اور اس کے کاغذات میرے نام سے میرے پاس موجود ہیں اور اس مکان پر میرا قبضہ بھی ہے۔ دکان جو کہ میرے شوہر کے نام ہے اور اب بیٹے اس میں کاروبار کرتے ہیں۔ میرے بیٹوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں مکان اور دکان دونوں میں سے حصے دیئے جائیں۔ برائے مہربانی ہر ایک کے حصوں کی وضاحت فرمائیں۔ (توفیقاً، 958/14 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر صدقِ بیان سائلہ چونکہ مکان ان کے شوہر نے انہیں ہبہ کر دیا تھا اور بعد ہبہ اس پر قبضہ بھی پایا گیا چونکہ ہبہ مکمل ہو گیا لہٰذا وہ مکان مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگا۔ اور جب میراث تقسیم کی جائے گی تو اس ہبہ کئے ہوئے مکان کو چھوڑ کر جتنا مال وفات کے وقت ان کی ملکیت میں ہوگا، وہی تقسیم کیا جائے گا۔ اور جو ورثاء ان کی وفات کے وقت موجود ہوں گے، وہ اس کے حق دار ہیں، ہر ایک وارث کو قانونِ وراثت کے شرعی اصول کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اور جو کچھ مرحوم اپنی زندگی میں دے چکے ہیں، اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔ اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور مرحوم کے شرعی ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں تو

تقسیمِ وراثت سے قبل جو امور ضروری ہیں (یعنی مصارفِ تدفین، ادائیگی قرض (اگر کوئی ہو) ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذِ وصیت (اگر کی ہو)، ان کی تنفیذ کے بعد بقیہ ترکہ 88 حصوں میں تقسیم ہوگا۔ بیوہ کو 11 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

Inheritance

Q:156 **Dear Mufti Saheb!**

This is to request you to answer the following question for submission to a court outside Pakistan:

Question:Mr S.K.S.Hassan died last year leaving behind him wife,a son and a daughter and no other legal heirs.What will be the share (in percentage)of his wife,son and daughter in his movable and immovable proparties according to shariah?.

K.M.Zubair,Supplements Editor,Dawn.

Ans:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

In the name of Allah,the Beneficent,the Merciful

WWW.NAFSEISLAM.COM

Answer to question

If S.K.S.Hassan's legal--Islamic law (shariah)--heirs are the same as mentioned in the question, then before division of the assets it as important to meet funeral expenses,pay loan, if any, and execute will, if any, to the extent of one-third.There after the remaining assets will be shared by the heirs in the following proportion,according to shariah:

Widow....................3/24..................12.5 0 percent

Son.....................14/24..................58.33 percent

Daughter ....7/24....................29.17 percent

ترکے میں سوتیلی اولاد کا حصہ نہیں

سوال: 157

میرے والد صاحب نے میری والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی،میری سوتیلی والدہ کے پہلے شوہر سے چار بچے (دولڑکے،دولڑکیاں) ہیں،اوران سب کی شادیاں ہم نے کیں سوتیلی والدہ کا انتقال 1982ء میں ہوا،میری والدہ سے پانچ بیٹے،اورچار بیٹیاں ہیں۔میرے والد کا انتقال 1992ء میں ہو

ا،والد کے انتقال کے بعد کیا ان چاروں کا میرے والد صاحب کے ترکے میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟،(معراج الدین،68/10لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدق بیان سائل تنفیذ مقدمہ علی الارث مرحومین کا ترکہ ان کی اولا د کے درمیان اصول وراثت کے قوانین کے تحت تقسیم ہوگا،کل ترکہ 14،حصوں میں منقسم ہوگا۔ "للذکر مثل حظ الانثیین" (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے،النساء:11) کے تحت پانچ بیٹوں کو دس حصے (فی کس دو حصے) چار بیٹیوں کو چار حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے۔دوسری والدہ کی جواولا دان کے پہلے شوہر سے ہے اسے آپ کے والد کے ترکے میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

پنشن ترکے میں شامل نہیں

سوال: 158

ایک شخص نے کل وراثت میں ایک مکمل مکان جس کی بالائی منزل پر دوکمرے ایک کچن اور غسل خانہ بھی تعمیر ہے،اس کے علاوہ ایک ماہانہ آمدنی کی پنشن چھوڑی ہے،وارثوں میں ایک بیٹا اور سات بیٹیاں ہیں ۔مرحوم کی وصیت میں تحریر ہے کہ اوپر کی منزل جسے بیٹے نے مکمل طور پر اپنے خرچ پر تعمیر کروایا ہے،اسی وصیت میں بڑی بیٹی جس کی شادی نہیں ہوئی ہے اسکو مکان کا آدھا حصہ دینے کی وصیت کی ہے ایک اور تحریر جو صرف بیٹے کو دی اور بیٹا اسکے اصل ہونے کا حلف اٹھا رہا ہے اسکے مطابق اوپر کی منزل کی قیمت بیٹے کو ملنی چاہیئے اور نیچے کی منزل کی آدھی قیمت اس طرح تقسیم کی جائے کہ دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو دیا جائے ، ماسوائے اس بیٹی کے جس کو نیچے

کی منزل کا آدھا حصہ دیا جارہا ہے اسکے علاوہ باپ کی جو ماہانہ پنشن آتی ہے وہ بڑی بیٹی پہلے ہی اکیلے وصول کرتی ہے اور کوئی حصہ کسی بھائی یا بہن کو نہیں دیتی مکان کی قیمت اس وقت ایک کروڑ روپے ہے۔جس وقت تحریر لکھی گئی مکان کی قیمت پندرہ لاکھ روپے تھی جس کی تقسیم مرحوم نے اس طرح کی کہ بیٹے کواوپر کی منزل کے دولاکھ ملنے چاہئیں ایک لاکھ ٹیکس، بل وغیرہ کی قیمت میں رکھے جائیں ۶ لاکھ روپے بڑی بیٹی کو دیے جائیں باقی ۶ لاکھ روپے کے آٹھ حصے کیے جائیں دو حصے بیٹے کو یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے اور ایک ایک حصہ چھ بیٹیوں کو یعنی ۷۵ ہزار روپے ہر بیٹی کو دیا جائے ۔اب مکان کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے،بہنوں کا اصرار ہے کہ بیٹے کواس قیمت کی تبدیلی کے حساب سے اوپر کی منزل کے پیسے نہ دیے جائیں،مگر بڑی بیٹی کو موجودہ قیمت کے حساب سے مکان کا آدھا حصہ ضرور دیا جائے ۔براہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں وراثت کی تقسیم واضح فرمایئے،(سید حسن ندیم،1E/10/10 ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جوسوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حدتک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کسی صدقہ جاریہ یا غیر وارث کیلئے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 9 حصوں میں منقسم ہوگا۔"للذکر مثل حظ الانثیین" (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت ایک بیٹے کو دو حصے اور سات بیٹیوں کو سات حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے، جیسا کہ مرحوم کے تحریر کردہ وصیت نا

مہ اور سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم نے وصیت نامہ میں اپنے ورثاء کو اپنی جائیداد کے مختلف حصوں میں نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں بن جاتے اور ورثاء کے حق میں وہ وصیت معتبر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ یقول: انّ الله قد أعطی کل ذی حقّ حقّه فلا وصیة لوارث"

ترجمہ:"ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے،تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے،(سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ،مؤسسۃ الریان،بیروت)"۔

پنشن حکومت کی طرف سے تبرع ہے، یہ ترکہ نہیں ہے لہٰذا حکومت اپنے قواعد وضوابط اور قانون کے مطابق ورثاء میں سے جسے چاہے دے سکتی ہے۔ بیٹے کا مکان کی بالائی منزل پر جو خرچ ہوا ہے۔ وہ اس کا حق ہے۔ اگر والد نے دو لاکھ روپے اس کیلئے طے کر دیئے تھے تو وہ ان کا حق دار ہے باقی ترکہ سب ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا، جس کی تفصیل اوپر درج کر دی ہے،البتہ تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے غیر شادی شدہ بہن کو تقسیم وراثت سے قبل مجموعی ترکے سے کچھ رقم نکال کر دینا چاہیں،تو اب وہ ایسا کر سکتے ہیں،فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے

سوال: 159

میرے ایک دوست نوید جنہیں 22 جنوری 2006ء کو شہید کر دیا

گیا، میں نے ان سے ایک لاکھ روپیہ بطور قرضہ لیا تھا منافع ہوا تو چند ماہ انہیں منافع سے حصہ بھی دیا مگر بعدہٗ منافع کا سلسلہ بند کردیا، میرے دوست نوید نے مجھ سے رقم کی واپسی کا تقاضہ کیا تھا اور یہ کہ مجھے اپنی رہائش کے لئے فلیٹ خریدنا ہے رقم تیار رکھنا میں نے کسی وقت بھی وہ رقم تم سے واپس لینی ہے، وہ مع اپنی بیوی اور ایک ڈیڑھ سالہ بیٹی کے کرایہ کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اسکے علاوہ ان کے ہمراہ اور کوئی نہ رہتا تھا، خیر اب وہ اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں فلیٹ بھی نہ خرید سکے اور نہ ہی میں ایک لاکھ کی رقم واپس کرسکا۔ میں ایک لاکھ کی رقم واپس کرنے کو تیار ہوں طریقہ کار کیا ہونا چاہیے، مرحوم کے ورثاء میں بیوہ، ایک بیٹی، ایک بیٹا (جو مرحوم کی شہادت کے تین ماہ بعد پیدا ہوا) مرحوم کی والدہ، 5 بھائی اور 5 بہنیں ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مرحوم کے سسر مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کررہے ہیں کہ میں نے نوید مرحوم کو ایک لاکھ روپے بطور قرضہ دیئے تھے کہ اپنی سہولت کے مطابق جب چاہو واپس کردینا انہوں نے مجھے اس قرضے کا ثبوت بھی دکھایا بینک سے ایک لاکھ روپے کا چیک نوید کے نام پر تھا بیوہ بھی اس قرضہ کی تائید کررہی ہے۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا یا سب سے افضل طریقہ میرے لئے کیا ہوگا؟ یہ بھی واضح رہے کہ بیوہ کی عدت پوری ہوچکی ہے اور بیوہ نے اپنے والدین کے گھر ہی عدت کے ایام پورے کئے اب مستقلاً وہیں رہ رہی ہیں، (محمد رحمت، دستگیر کراچی)۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

جواب:

صورتِ مسئولہ مذکورہ میں مذکورہ قرض کی ایک لاکھ رقم مرحوم کے مجموعی ترکے میں شامل کی جائے گی، امور، متقدمہ علی الارث (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو)

شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد ترکے کے تہائی حصہ سے مرحوم کا قرض ادا کیا جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی قرض باقی رہے تو دیگر ورثا ءبطور فضل واحسان رضا مندی سے اگر اپنے حصوں سے دست بردار ہوں تو انکے حصوں سے ادا کیا جائے گا، ترکہ کی تقسیم درج ذیل طریقے پر ہوگی۔

ادائیگی قرض کے بعد کل ترکے کے 24 حصے ہوں گے، مرحوم کی والدہ کو 6 حصے، بیوہ کو 3 حصے، ایک بیٹے کو 10 حصے اور بیٹی کو 5 حصے ملیں گے، مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

قتلِ خطا

سوال: 160

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ماں حالتِ خواب میں اپنے شیر خوار بچے کے اوپر آجائے جس کے دم گھٹنے سے بچہ مرجائے کیا ماں پر دیت وکفارہ ہے کیا یہ قتل قائم مقام خطا ہے۔نیز یہ قتل قائم مقام خطا ہے تو کیا یہ نوع صرف احناف کے مذہب میں ہے یا جمہور کا مسلک ہے اوراس کے دلائل قرآن وحدیث یا اجماع وقیاس سے کیا ہے؟۔(ماجد خان،ضلع راولاکوٹ تحصیل عباس پور)۔

جواب :

آپ نے استفتاء میں جوصورت بیان کی ہے،احناف کے نزدیک یہ "قتل قائم مقام خطا" کی صورت بنتی ہے اور جمہور کے نزدیک یہ قتلِ خطا ہے،لیکن اس پر جو حکم مرتب ہوتا ہے،وہ ایک ہی ہے۔ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:القتل الخطاء کما عرفنا:ھو أن لا یقصد بہ الضرب ولاالقتل،مثل لو سقط شخص علی غیرہ فقتلہ،أورمی صیدا فاصاب انسانا،فھو نوع واحد عندالجمھور ونوعان عندالحنفیہ؛ لانھم یعتبرون حالۃ سقوط النائم علی غیرہ،مماجری مجری الخطأ۔

ترجمہ:"قتلِ خطا جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ ہے کہ نہ تو کسی شخص کو مارنے پیٹنے (Beating) کا ارادہ کیا جائے اور نہ جان سے مارڈالنے کا،اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص (غیرارادی طورپر)دوسرے شخص پر گر پڑا اوراس طرح اس کی جان لے لی،

یا ایک شکار کونشانہ بنا کر تیر چلایا (یا گولی چلائی) اور وہ (اچانک) کسی انسان کو جا لگا (اور اس طرح اس کی جان چلی گئی) تو یہ جمہور فقہاء کے نزدیک ایک ہی قسم ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک قتلِ خطا کی دو قسمیں ہیں: (ایک خطاء فی القصد اور دوسری خطاء فی الفعل) کیونکہ وہ اسے اس صورت پر قیاس کرتے ہیں، جیسے ایک سویا ہوا شخص نیند کی حالت میں دوسرے شخص پر گر جاتا ہے (اور اس طرح اس کی موت واقع ہو جاتی ہے) یہ قائم مقام خطا کی قسم سے ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد: 6، ص: 328، مطبوعہ: دارالفکر، دمشق)"۔

علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: "علامہ ابو بکر رازی کی تعریف کے مطابق قتل قائم مقام خطا یہ ہے کہ مثلاً نیند میں کوئی شخص کسی پر گر پڑے اور اس کو قتل کر دے یہ عمد ہے نہ خطا کیونکہ سونے والے شخص کا قصد (ارادہ) متصور نہیں ہے، لیکن اس کا کروٹ بدل کر کسی شخص پر گرنا اس شخص کی ہلاکت کا موجب ہے، اس کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہوگا، اور اگر وہ مقتول کا وارث تھا تو اس کی وراثت سے بھی محروم ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا وہ نیند میں نہ ہو اور اس نے جلد میراث حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہو، (المبسوط، جلد: 26، ص: 68، مطبوعہ: دارالمعرفۃ، بیروت، بحوالہ شرح صحیح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی، ج: 4، ص: 676 فرید بک اسٹال، لاہور)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: و أما ما جری مجری الخطا فھو مثل النائم ینقلب علی رجل فیقتلہ فلیس ھذا بعمد و لا خطا کذا فی الکافی ۔ و کمن سقط من سطح علی انسان فقتلہ أو سقط من یدہ لبنۃ أو خشبۃ و أصابت انساناً وقتلتہ أو کان علی دابۃ فوطئت دابتہ انساناً ھکذا فی المحیط ۔ وحکمہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

حکم المخطا من سقوط القصاص ووجوب الدیة والکفارة وحرمان المیراث کذافی الجوھرة النیرہ ۔

ترجمہ: ''اور ''قتل قائم مقام خطا'' مثال اس کی یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی شخص گرا، جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہوگیا پس نہ یہ قتل عمد ہے اور نہ ہی قتلِ خطا، ''کافی ''میں بھی اسی طرح ہے۔اسی طرح چھت سے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کردیا ،یا ایک انسان کے ہاتھ سے اینٹ یا لکڑی گرگئی، اور وہ دوسرے شخص پر آگئی اور اس کی ہلاکت واقع ہوگئی ،یا وہ سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا، ''محیط'' میں بھی اسی طرح سے ہے۔اور اس کا حکم بھی قتلِ خطا کے حکم کی طرح ہے، کہ قصاص ساقط ہوجائے گا اور دیت اور کفارہ واجب ہوگا ،اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا، ''جوہرۃالنیرہ'' میں اسی طرح مذکور ہے،(فتاویٰ عالمگیری ،جلد 6،ص:3،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

مفتی وقارالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا :قتل کی اقسام میں سے یہ قسم ''قائم مقام خطا'' ہے اس کی مثال یہ ہے کہ سوئے ہوئے شخص پر کوئی گرے اور وہ سونے والا مرجائے ،تو اس کا حکم یہ ہے کہ قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت اور قاتل میراث سے بھی محروم ہوتا ہے۔قتل کا گناہ نہیں ہوتا ہے۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ماں کو کفارہ دینا ہوگا اور وہ یہی ہے کہ دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے ،(وقارالفتاویٰ ،جلد سوم،ص: 338،مطبوعہ بزمِ وقارالدین ،کراچی)''۔

قتل خطا میں قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت لازم ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمنا الا خطأً ج ومن قتل مؤمنا خطأً فتحریر رقبۃ مؤمنۃ ودیۃ مسلمۃ الی اھلہ الا ان یصدقوا ط

ترجمہ: ''اور کسی مؤمن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاء (یہ فعل سرزد ہو جائے)، (تو اس کا کفارہ) ایک مؤمن غلام کا آزاد کرنا ہے، (اور مزید یہ کہ) اس کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہے ،سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں، (النساء: 92)''۔

آیت کے اختتام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین توبۃ من اللہ ۔

ترجمہ: ''یعنی جو شخص (بطورِ کفارہ آزاد کرنے کے لئے غلام) نہ پائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیتِ توبہ کے لئے دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے''

قتلِ شبہ عمد

سوال: 161

مسمی محمد فاروق نے کسی بات پر تنازع کرتے ہوئے غصہ میں آکر حاکم ولد محمد یوسف (مرحوم) کو ڈنڈے مار کر قتل کردیا ،اس کے بعد یہ مقدمہ عدالت میں پہنچا لیکن اس دوران قاتل اور مقتول کے ورثاء میں صلح ہوگئی اور مقتول کے ورثاء نے قاتل کو خون معاف کردیا۔ اب سوال یہ ہے کہ مقتول کا خون معاف کرنے کا کس وارث کو حق حاصل ہے۔

یاد رہے کہ مقتول غیر شادی شدہ تھا اور مقتول کا والد پہلے ہی انتقال کرچکا ہے اس وقت صرف مقتول کی ماں اور پانچ بھائی ہیں جو موجود ہیں کیا قاتل کو مقتول کی ماں خون معاف کرسکتی ہے یا نہیں؟ ۔برائے مہربانی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں،

(جھاڑو، ولد یوسف خان کوٹھ گڈاب ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ سوال میں جو صورت قتل کی بیان کی گئی ہے اسے قتل شبہ عمد کہا جاتا ہے۔

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

واما شبہ العمد فھو ماتعمد ت ضربہ بالعصااو السوط او الحجر او لید۔

ترجمہ: "شبہ عمد وہ قتل ہے جس میں لاٹھی، کوڑے، پتھر یا ہاتھ سے ضرب لگانے کا قصد کیا جائے۔(المبسوط جلد: 26 ص: 60 مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت)"۔

قتل شبہ عمد میں قاتل گناہ گار ہوگا اور اس پر کفارہ واجب ہے ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اس کے بعد عاقلہ (عصبات) پر دیت مغلظہ یعنی سو اونٹ واجب ہے جس کو وہ تین سال میں ادا کریں گے۔ عاقلہ عصبات کو کہتے ہیں یعنی باپ کی طرف سے رشتے دار جو قاتل کی جانب سے مقتول کی دیت ادا کرتے ہیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

و شبہ العمد أن یتعمد الضرب بمالیس بسلاح و لا ماجری مجری السلاح عند أبی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ وقال أبو یوسف و محمد رحمھما اللہ تعالیٰ اذا ضربہ بحجر عظیم أو خشبۃ عظیمۃ فھو عمد و شبہ العمد أن یتعمد ضربہ بما لا یقتل بہ غالبا و الصحیح قول أبی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کذا فی المضمرات ☆ و موجبہ علی القولین الا ثم و الکفارۃ و کفارتہ تحریر رقبۃ مؤمنۃ فان لم یجد فصیام شھرین متتابعین و دیۃ مغلظۃ علی

العاقلة كذافي الكافي۔

ترجمہ: "اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جو اسلحہ (برائے قتل) نہ ہو اور نہ ہی اسلحہ کے قائم مقام ہو، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی بڑے پتھر کے ساتھ یا کسی بڑی لکڑی کے ساتھ مارے تو وہ بھی قتل عمد ہے اور ان کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ وہ کسی ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جس سے عام طور پر قتل نہ کیا جاتا ہو، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہی صحیح ہے، جیسا کہ مضمرات میں ہے۔ اور دونوں اقوال کے مطابق "قتلِ شبہ عمد" کے مرتکب پر گناہ اور کفارہ لازم آتا ہے اور اس قتل شبہ عمد کا کفارہ ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے پس اگر وہ نہ پائے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے اور قاتل کے عصبات پر دیت مغلظہ (سو اونٹ) واجب ہے، کافی میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیر جلد:6 ص:2.3 مکتبہ رُشیدیہ کوئٹہ)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

عفو الولی عن القاتل افضل من الصلح، والصلح افضل من القصاص و کذا عفو المجروح۔ لاتصح توبة القاتل حتی یسلم نفسه للقود۔

ترجمہ: "ولی مقتول کا قاتل کو معاف کر دینا صلح سے افضل ہے، صلح قصاص سے افضل ہے اور اسی طرح مجروح کا معاف کر دینا افضل ہے اور قاتل کی توبہ (عند اللہ) تب صحیح ہوگی جب وہ خود کو (ورثاء کے پاس) قصاص کے لئے پیش کرے، (ورنہ عند اللہ توبہ معتبر نہیں ہے)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله (عفو الولی عن القاتل افضل) ویبرأ القاتل فی الدنیا عن الدیة و القود

لانهما حق الوارث ۔یبری ۔قوله:(لاتصح توبة القاتل حتی یسلم نفسه للقود)أی لاتکفیه التوبة وحدها ۔قال فی "تبیین المحارم واعلم ان توبة القاتل لاتکون بالاستغفار والندامة فقط بل یتوقف علی ارضاء اولیاء المقتول ،فان کان القتل عمدا لابدّ أن یمکنهم من القصاص منه ،فان شاؤ قتلوه وان شاؤ عفوا عنه مجانا،فان عفوا عنه کفته التوبه۔ اه ملخصا۔

ترجمہ: ’’(ولی کا قاتل کو معاف کردینا افضل ہے)اور قاتل دنیا میں دیت اور قصاص سے بری ہو جائے گا کیونکہ یہ دونوں (دیت اور قصاص)وارث کا حق ہے ،علامہ علاؤالدین حصکفی کا یہ قول کہ:(قاتل کی توبہ اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ وہ خود کو قصاص کے لئے پیش نہ کرے)یعنی صرف اس کا توبہ کرلینا کافی نہیں ہے ۔’’تبیین المحارم‘‘میں فرمایا:جاننا چاہئے کہ قاتل کی توبہ فقط اس کی ندامت اور طلب مغفرت سے (مکمل)نہیں ہوگی ،بلکہ یہ مقتول کے ورثاء کی رضامندی پر موقوف رہے گی ،پس اگر اس نے قتل عمد کیا ہوتو (قبولیت توبہ کے لئے)ضروری ہے کہ اس مقتول کے ورثاء کو اپنے اوپر قصاص کی قدرت دے کہ اگر چاہیں تو اسے (قصاص میں)قتل کردیں اور اگر وہ چاہیں تو اسے معاف کردیں ،پس اگر وہ اس کو معاف کردیں تو اس کے لئے توبہ کافی ہے ،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد:10ص:151 مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی ،بیروت)‘‘۔

ولایت کے چار اسباب ہیں:

قرابت ،ملک ،ولا،امامت ۔قرابت کی وجہ سے ولایت عصبہ بنفسہ کے لئے ہے یعنی وہ مرد جس کو اس سے قرابت کسی عورت کی وساطت سے نہ ہو یا وارث کے ذوی الفروض کے بعد جوترکہ بچے ،وہ سب لے لے ،اور اگر ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا

مال یہی لے لے، ایسی قرابت والا ولی ہے، یہاں بھی وہی ترتیب ملحوظ ہے جو وراثت میں معتبر ہے یعنی سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، پھر پر پوتا اگر کوئی پشت کا فاصلہ ہو یہ نہ ہوں تو پھر باپ، دادا و غیرھم اگر چہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی۔

شرعاً قاتل کو معاف کرنے کا حق اولیاءِ مقتول کا ہے اور صورتِ مسئولہ میں یہ حق اس کے بھائیوں کو حاصل ہے، یہ "قتلِ شبہ عمد" کا کیس ہے، اور ورثاء کی جانب سے معافی کے باوجود اس (قاتل) پر دو ماہ کے روزوں کا کفارہ ہے، اور معاف کرنے کے بعد قاتل سے دنیا میں مطالبہ نہیں ہو سکتا نہ قصاص لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی دیت لی جا سکتی ہے، لیکن مواخذۂ اخروی سے بری نہیں ہو سکتا کیونکہ قتل ناحق میں تین حق اس کے ساتھ متعلق ہیں ایک حق اللہ، دوسرا حق مقتول، تیسرا حق ولی، ولیٔ مقتول کو اپنا حق معاف کرنے کا اختیار تھا سو اس نے معاف کر دیا مگر حق اللہ اور حق مقتول بدستور باقی ہیں، ولی کے معاف کرنے سے وہ معاف نہیں ہوئے۔

غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا

سوال: 162

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک اسلامی حکومت میں کسی غیر مسلم (ہندو) کو چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) مقرر کرنا جائز ہے؟

،(محمد شمیم خان فیڈرل بی ایریا شوکت صدیقی، منور احمد نعیمی، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں، ایک خالص دستوری اور قانونی اور دوسری خالص اسلامی جہاں تک مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے دستور کا تعلق ہے، تو اسکی رو سے نظام مملکت میں صرف دو مناصب کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، ایک صدر کا منصب اور

WWW.NAFSEISLAM.COM

دوسرا وزیرِ اعظم کا عہدہ، کیونکہ ان دونوں عہدوں کے حلف نامے میں، جو دستور پاکستان کے شیڈول میں دیا گیا ہے، مسلمان ہونا اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا اقرار شامل ہے ۔ان کے علاوہ کسی اور عہدے کے لئے (خواہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج ہوں یا چیف جسٹس ہوں، مسلح افواج کے سربراہان ہوں یا گورنر، وزراءِ اعلیٰ اور وفاقی وصوبائی وزراء ہوں) مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا دستورِ پاکستان کی رُو سے کسی غیر مسلم کے چیف جسٹس آف پاکستان یا اس کا قائم مقام بننے کی گنجائش ہے، ماضی میں بھی جسٹس اے آر کارنیلیس، جو مذہباً عیسائی تھے، چیف جسٹس آف پاکستان رہ چکے ہیں۔اگرچہ ہماری رائے میں یہ دستور کی روح کے منافی ہے، کیونکہ دستورِ پاکستان کی رُو سے کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بن سکتا اور کسی بھی قانون کو اس حوالے سے پاکستان کی سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے اور اس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی تعبیر وتشریح حتمی اور قطعی متصور ہوگی، اب جج یا چیف جسٹس خود غیر مسلم ہے اور از روئے عقیدہ اس کا قرآن وسنت کی حقانیت پر یقین ہی نہیں ہے (کیونکہ اگر قرآن وسنت کی حقانیت پر اس کا یقین ہوتا تو اسلام قبول کرلیتا)، لہٰذا صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ اسے قرآن وسنت سے آگاہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَن يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ: ''اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں کے خلاف (غلبہ کی) ہرگز کوئی سبیل نہیں بنائے گا، (النسآء:141)''۔

اس آیت سے فقہاءِ احناف نے جو مسائل اخذ کئے ہیں ان میں دو اہم باتیں یہ ہیں کہ:

(1) کافر کو مسلمان کا قاضی (جج) بنانا جائز نہیں ہے۔(2) کافر کو مسلمان کے لشکر کا

WWW.NAFSEISLAM.COM

امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، الشیخ احمد بمعروف مُلا جیون علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: جعله ذا عسكر و خدمته ورئيسا له غير جائز۔

ترجمہ: ''کافر کو مسلمان کے لشکر کا امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، (التفسیراتِ احمدیہ ص:322,223 مکتبہ حقانیہ، پشاور)''۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابی بکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں: واما بيان من يصلح للقضاء فنقول الصلاحية لها شرائط ۔ منها : العقل ۔ و منها :البلوغ ۔ و منها: الاسلام ۔و منها :الحرية ۔ و منها: البصر ۔و منها: النطق ۔و منها: السلامة عن حد القذف لما قلنا فى الشهادة ۔

ترجمہ: ''ان شرائط کے بیان کے بارے میں جو اہلیتِ قضاء کے لئے ضروری ہیں ، حسبِ ذیل ہیں : (1) عقل، (2) بلوغ، (3) اسلام ، (4) حریت (آزاد ہونا)، (5) بصر (بینا ہونا)، (6) نطق، یعنی گویائی وگفتار کی صلاحیت رکھتا ہو، (7) اس شخص پر حدِ قذف نہ لگی ہو، (بدائع الصنائع جلد: 7، ص: 3، مرکز اہلسنت برکاتِ رضا ، گجرات، ہند)''۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: ان الكافر يجوز تقليده القضاء ليحكم بين أهل الذّمّة ذكره الزّيلعى فى التّحكيم الخ

ترجمہ: ''(حاکمِ اسلام) اگر کسی غیر مسلم کو غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے قاضی (جج) مقرر کرے، تو جائز ہے، اسے ''زیلعی'' نے بابِ تحکیم میں ذکر کیا ہے، (مگر مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اُسے اختیار نہیں)، اس کی شرح میں ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (ليحكم بين أهل الذّمّة) أى حال كفره ، والا فقد

علمت أن الكافر يصح توليته مطلقاً لكن لا يحكم الا اذا أسلم ۔

ترجمہ: ’’ تا کہ (غیر مسلم قاضی) غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرے)یعنی جب تک وہ حالتِ کفر میں ہے، مگر یہ معلوم ہے کہ (دیگر امور میں) کافر کو حق ولایت مطلقاً حاصل ہے، لیکن جب تک وہ اسلام نہ لائے اسے منصبِ قضا تفویض نہیں ہوگا، مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں، ۔۔۔۔۔۔۔۔پھر آگے‘

مطلب فی حکم القاضی الدّرزی والنّصرانی ‘‘کے تحت بیان کرتے ھیں :

تنبیه :ظهر من کلامهم حکم القاضی المنصوب فی بلاد الدروز فی القطر الشامی ، ویکون درزیاً ویکون نصرانیاً فکل منهما لا یصح حکمه علی المسلمین ، فان الدرزی لا ملة له کاالمنافق والزندیق وان سمی نفسه مسلماً ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ والظاهر أنه یصح حکم الدرزی علی النصرانی وبالعکس ۔

ترجمہ:’’ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ شام کے خطے میں دُرزی اور نصرانی (کو اگر) قاضی (مقرر کردیا گیا ہو)تو ان کا مسلمانوں کے امور میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دُرزی کا تو کوئی دین ہی نہیں ہوتا ،جیسے منافق اور زندیق ،اگر چہ وہ اپنے آپ کو (بظاہر)مسلمان کہے (اور آگے چل کر لکھا)، ظاہر یہ ہے کہ غیر مسلم کا ایک دوسرے کے لیے جج بنایا جانا درست ہے ،(رد المحتار علی الدر المختار ج:8،ص: 24 دار احیاء التراث العربی ،بیروت)‘‘ ۔

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال ہوا کہ: مسائلِ شرعیہ عبادات میں غیر مسلم کے فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے باوجودیکہ امیر شریعت موجود ہیں؟ جواب میں انہوں نے لکھا کہ:’’ کفار کے پاس فیصلہ لے جانا ممنوع ہے ،اللہ عزوجل فرماتا ہے

الم تر الی الذین یزعمون انّھم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یّتحاکموا الی الطاغوت وقد اُمروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالًا بعیدًا، ترجمہ: ''کیا آپ نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور ان (کتابوں) پر (ایمان لائے ہیں) جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ انہیں گمراہ کر کے بہت دور کی گمراہی میں ڈال دے، (النساء: 60) ،واللہ تعالیٰ اعلم ، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص:246، مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)''۔

محافلِ میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ ''اس میں حضور ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اور اس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''

سوال: 163

بارہ ربیع الاول کو جشن عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایک مقرر نے آقا ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے کہا ''آج کی اس محفل، اس جشن اور اس بزم کے جانِ محفل ذات مصطفیٰ ﷺ ہیں اور شرکاء محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو محفل بھی آقا ﷺ کے نام پر کی جائے آقا ﷺ اس میں شریک ہوتے ہیں اور جس محفل میں خدا کا حبیب ﷺ بھی خود شریک ہو اس میں وحدہ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''۔

اس پر ایک علامہ صاحب نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی ذات شریک ہونے سے پاک ہے۔ لہٰذا یہ کفریہ کلمات ہیں۔ مقرر کو تو بتائب ہونا چاہئے۔ براہِ کرم اس مسئلہ پر

قرآن وحدیث اوراقوال صحابہ وائمہ کی روشنی میں اپنے فتویٰ سے نوازیں، (ڈاکٹر محمد حامد رضا، ایم ڈی، رضامیڈیسن کمپنی مین بازار چشتیاں)۔

سوال: 164

کیافرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مقرر نے اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہا "شرکاءِ محفل میں خود خداوندکریم بھی شریک ہے"۔مقرر نے شریک ہونے کی تفصیل بیان نہیں کی ۔کہ اللہ تعالیٰ کس طرح شریک ہے۔آپ سے دریافت کرنا ہے کہ:

(1) کیااس جملہ پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے یا نہیں؟۔(2) کیاایسے جملوں کو عوام الناس میں استعمال کرنا چاہئے؟ ۔قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، (میاں طاہر حسین ،چشتیاں شریف)۔

جواب :

نوٹ: اس موضوع پر ہمارے پاس چشتیاں ،پنجاب سے دو الگ الگ استفسارات آئے ،ہم نے دونوں درج کردیے ہیں۔ایک مستفتی ڈاکٹر محمد حامد رضا نے تین مفتیانِ کرام (مفتی عبدالقیوم خان ،جامعہ منہاج القرآن ،لاہور، مفتی محمد تنویر القادری، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہوراور ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری، جامعہ رضویہ ،لاہور) کے جوابات بھی منسلک فرمائے ہیں۔ان مفتیان کرام نے اس عبارت کی تاویل وتوجیہ کرکے جواز کا قول کیا ہے۔اس مسئلے میں ہماراموقف درج ذیل ہے:

قرآن وحدیث میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اللہ جل شانہٗ اور مخلوق کے لئے ایک ہی صیغے کا اطلاق کیا گیا ہے، جیسے: (ا) اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ الخ (ب) فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (القرآن) (ج) اَنَا جَلِیْسُ عَبْدِیْ حِیْنَ

يَذْكُرُنِيْ وَاَنَامَعَهٗ اِذَا دَعَانِيْ (الحديث)   (د)اَنَـا عِـنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ اَنَـا مَعَـهٗ اِذَا ذَكَـرَنِـيْ ،فَـاِنْ ذَكَـرَنِـيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ،وَمَنْ اَتَانِيْ يَمْشِـيْ اَتَيْتُـهٗ هَـرْوَلَةً، وَغَيْـرِهَـا مِنَ الْاٰيَـاتِ الْكَرِيْمَةِ وَالْاَحَادِيْـثِ الْـمُبَـارَكَةِ۔ میری عاجزانہ رائے میں ان اطلاقات کو انہی مقامات تک محدود رکھنا چاہئے، جیسے: فَثَمَّ وَجْـهُ اللّٰهِ ، يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ، يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ وغیرها من الآیات الکریمه ، ان مواقع پر یہ کہا جائے کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے یا جو معنٰی اس کی ذات کے شایان شان ہے۔ ہمارے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اس پر مزید قیاسات کریں کہ ید اللہ، وجہ اللہ ہو سکتا ہے تو "قدم اللہ" اور "رأس اللہ" کیوں نہیں ہو سکتا۔ ان اطلاقات کو ان کے محل تک محدود رکھا جائے۔ بلکہ ترجمہ کرتے وقت لکھ دیا جائے کہ اس کا حقیقی مفہوم جو اللہ کی مراد ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس کی تعیین کے ہم شرعاً مکلّف نہیں ہیں، اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ترجمہ کے موقع پر یہ لکھ دیا جائے: "جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے"۔ حقیقی مفہوم کی تعیین کے اعتبار سے ایسی احادیث وآیات کو متشابہات میں سے سمجھنا چاہئے اور اس کے درپے نہیں ہونا چاہئے۔ آج کل اکثر مقررین اور نعت خواں حضرات بڑی جرأت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ: "اس محفل میں حضور تشریف لائے ہوئے ہیں"، ہمارا ایمان وعقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مبارک محافلِ میلاد میں ازراہِ لطف وکرم جب اور جہاں چاہیں تشریف لا سکتے ہیں اور "شمائم امدادیہ" میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہ درج کیا ہے، لیکن تعیین کے ساتھ یہ کہنا کہ: "ہماری اس محفل میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں"، اگر غوث الاعظم محی الدین عبد القادر الجیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ یا مسلّمہ طور پر بلند مرتبہ اولیاءِ کاملین یہ دعویٰ فرمائیں تو بجا ہے اور بارگاہِ الوہیت جلّ وعلا اور بارگاہِ

رسالت میں تقرّب کی وجہ سے انہیں یہ مرتبہ ومقام حاصل ہے کہ وہ یقین کے ساتھ حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ہر ایرے غیرے کو اتنا بڑا دعویٰ کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسا دعویٰ یا تو غیب دانی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، اور بالذات علمِ غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے یا جن مقرّب ومحبوب بندوں کو اپنے کرم سے وہ مطلع فرما دے یا وہ اپنے لئے عام لوگوں کی قوتِ مشاہدہ اور صاحبِ بصیرت وبصارت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ بہت بڑی خودستائی ہے جو اس کے لئے جائز نہیں ہے، اگر قرآن وحدیث میں ایسے کلمات (مثلاً لفظِ صلوٰۃ) آئے ہیں، جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور مومنین پر بیک وقت کیا گیا ہے، تب بھی ان کے معانی کا تعین ہر ایک کے اعتبار سے الگ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے وہی معنیٰ مراد ہوگا جو اس کی شان کے لائق ہے اور اشتراکِ لفظی کے باوجود اشتراکِ معنیٰ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیتِ درود پر کلام کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ اور فرشتوں کو ایک فعل میں شریک کیا ہے اور فرمایا ہے: اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے غیر کو ایک فعل میں شریک کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، حدیث میں ہے: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے کہا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پالی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم برے خطیب ہو یوں کہو جس نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ گمراہ ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر ایک ضمیر میں جمع کریں، کیونکہ اس سے سننے والوں کو یہ وہم ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو برابر سمجھتا ہے،اس لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر الگ الگ صیغوں میں کیا جائے،البتہ اللہ تعالیٰ کسی حکم یا کسی قاعدے کا پابند نہیں ہے،وہ ایک صیغہ اور ایک ضمیر میں اللہ اور اس کے غیر کا ذکر کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے،ایک صیغہ میں دونوں کا ذکر کرنے کی مثال یہ آیت ہے اس میں فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہ وملٰئکتہ یصلون: اللہ اور اس کے فرشتے درود پڑھتے ہیں،اور ایک ضمیر میں دونوں کے ذکر کے مراد لینے کی مثال یہ آیت ہے:و ما نقموا الا ان اغنٰھم اللہ ورسولہٗ من فضلہ ۔ترجمہ:''اور ان (منافقین کو)صرف یہ ناگوار ہوا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کردیا،(التوبہ: 74)''۔اس آیت میں''من فضلہ'' کی ضمیر واحد اللہ اور رسول دونوں کی طرف راجع ہے،اسی طرح یہ آیت ہے:و اللّٰہ ورسولہٗ احق ان یرضوہ ۔ترجمہ:''اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے ،(التوبہ: 62)''۔اس آیت میں''یرضوہ''کی ضمیر واحد اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف راجع ہے۔اسی طرح نبی ﷺ بھی اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور آپ نے بھی اللہ اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں فرمایا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے:حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں وہ ایمان کی مٹھاس کو پالے گا،ایک یہ ہے کہ:ان یکون اللّٰہ ورسولہ احبَّ الیہ مما سواھما۔ ترجمہ:''اللہ اور اس کا رسول اس کو ان کے ماسوا زیادہ محبوب ہو،(صحیح البخاری: ،رقم الحدیث: 16)''۔خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ادب اور اس کی تعظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر دونوں کا ایک ضمیر میں ذکر کرنا جائز نہیں ہے،لیکن اللہ تعالیٰ

اوراس کے رسول ﷺ اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر کو بھی جمع کر دیتے ہیں، کیونکہ جب دوسرے لوگ ایک صیغہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر کریں گے تو ان کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو ہم مرتبہ اور مساوی سمجھتے ہیں، اس لئے دونوں کا ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں ذکر کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اگر وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں دونوں کا ذکر کریں ، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، (تبیان القرآن ،جلد:9،ص:532,533)''۔ محفل میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے ہمارے خطباء کرام فرطِ محبت، جوشِ عقیدت اور عوام سے داد و تحسین پانے کے شوق میں بعض کلمات ارشاد فرما دیتے ہیں ۔ جیسے سوال میں مذکور ہیں کہ: ''اس میں وحدہ' لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''، اگرچہ شرعاً اس کی تاویل و توجیہ کی گنجائش ہے، جیسا کہ منسلکہ فتاویٰ میں مفتیانِ کرام نے فرمائی ہے، لیکن میری مؤدّبانہ اور عاجزانہ رائے ہے کہ اس طرح کے اندازِ بیان سے اجتناب اولیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی اَحدِیَّت اور تَنزِیہ کا جتنا پاس رکھا جاسکے، اتنا ہی افضل و اولیٰ ہے ۔خاص طور پر آجکل بڑے خطباءِ کرام کی تقاریر کے کیسٹ عام ہو جاتے ہیں اور پھر علم سے عاری لوگ بھی ان کو اپنی مجالس میں دہراتے رہتے ہیں ۔تاویلات و توجیہات کی تو ہر جگہ گنجائش رہتی ہے، مثلاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ ترجمہ: ''ہم اس کی (بندے کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں، (سورۃ ق:16)'' اور وھو معکم این ما کنتم ۔ ترجمہ: ''تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے ساتھ ہوتا ہے، (سورۃ الحدید:4)'' ۔اب ان آیات کی روشنی میں کوئی شخص یہ کہے کہ

میں جس مجلس میں بھی رہوں، اللہ تعالیٰ میرے ساتھ شریک ہوتا ہے، تو یہ انداز میرے نزدیک بارگاہِ الوہیت کے شایانِ شان نہیں ہے، اگر چہ توجیہ وتاویل کی گنجائش موجود ہے، کیونکہ یہاں بندے اور رب کے درمیان جس معیت کا ذکر ہے اس سے معیتِ جسمانی یا معیتِ مکانی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم اور قدرت ہر چیز کو محیط ہے اور اسی معنیٰ میں معیت مراد ہے، بعض مُقربین کے لئے مَعیّت خاصّہ مراد ہو سکتی ہے، اس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکات کا بندے کے شاملِ حال رہنا ہے۔ باقی جن علامہ صاحب نے کہا ہے کہ: ''یہ کفریہ کلمات ہیں، مقرر کو تو بتائب ہونا چاہئے''۔ یہ درست نہیں ہے اور بعض علماء کے نزدیک غیر کفر کو کفر قرار دینا بجائے خود مستلزم کفر ہوتا ہے۔ ہم نے اظہارِ رائے کے لئے یہ فتویٰ محترم مفتی محمد رفیق حسنی (جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، کراچی) کو پیش کیا، تو انہوں نے اپنی عبارتِ ذیل کے اضافے کے ساتھ اس کی تائید کی: ''حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے فتوے کی تائید کرتا ہوں بلکہ میرے نزدیک صورتِ مسئولہ کی عبارتیں اور اسی قسم کے عام مقررین اور نعت خوانوں کی عبارتیں کفر تو نہیں مگر عام مجالس میں بیان کرنا حرام ہیں بلکہ متشابہات آیات اور احادیث کا بغیر تاویل اور توضیح کے بھی عام مجالس میں بیان کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے کلمات سے عوام کو جو پیغام پہنچتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تجسیم اور تمثیل جسمی کا ہوتا ہے چنانچہ ایسی تقریریں سننے والے میرے ایک طالبِ علم کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جسم کا قائل ہو چکا ہے۔ اسی طرح شانِ رسالت بیان کرتے وقت یہ کہنا کہ ''اللہ تعالیٰ جو لاشریک ہے وہ درود میں ہمارے ساتھ شریک ہے''، سے عوام کا یہ عقیدہ بنتا ہے شاید اللہ تعالیٰ ہماری طرح ہاتھ میں تسبیح لیکر'' اللھم صل علی الخ یا الصلوٰۃ والسلام علیک

یارسول اللہ" پڑھتا رہتا ہے جبکہ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف صلاۃ کی نسبت ہو تو رحمت مراد ہوتی ہے۔ الغرض مذکورہ کلمات اگرچہ تاویل کی وجہ سے کفر نہیں ہیں مگر عوام کو پیغام پہنچانے اور ان کے عقیدوں کے فساد کے خطرے کے پیش نظر ناجائز ہیں آئندہ علماء کو یہ کلمات نہیں کہنا چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم"۔ **اسی طرح محترم مفتی محمد اسماعیل نورانی (جامعہ انوار القرآن، کراچی) نے یہ تائیدی کلمات لکھے:** ''قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب مدظلہ نے جو جواب تحریر فرمایا ہے اور اس پر مفتی رفیق الحسنی دام ظلہ نے جو اضافہ فرمایا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ فی زمانہ مقررین اور واعظین کے مذکورہ جملوں کی سخت حوصلہ شکنی اور تردید کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جس طرح نعت خوانی کی فیلڈ میں جاہل اور چھچھلے نعت خوانوں نے نظریاتی طور پر اہل سنت کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح غالی قسم کے واعظین اور مقررین نے بھی اپنی بے بنیاد نکتہ آفرینیوں سے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اللہ عزوجل ہدایت خیر عطا فرمائے''۔

خاتون مبلغہ کا غیر شرعی طرز عمل

سوال : 165

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والی ایک مقرر خاتون (جو تنظیم المدارس سے ملحق فوقانی درجے کے ایک ادارے کی مہتمم ہیں) نے اپنی تقاریر پر مشتمل کیسٹ کی سرعام فروخت شروع کر رکھی ہے جن میں ترنم کے ساتھ نعتیہ اشعار بھی پڑھے گئے ہیں موصوفہ سے جب دریافت کیا گیا کہ کچھ عرصہ پہلے تو آپ اپنے اجتماع کے آس پاس بھی کسی مرد کی موجودگی پسند نہیں کرتی تھیں کہ انکے کانوں تک آواز نہ چلی جائے ، اور اب آپ اپنی کیسٹیں ہر جگہ پہنچانے کے لئے کوشاں و مشتاق ہیں تو ان کا جواب یہ تھا کہ یہ دورِ

حاضر کی اہم ضرورت ہے میں فرحت ہاشمی (الہدیٰ سینٹر، اسلام آباد) کی کیسٹوں کے توڑ کے لئے ایسا کر رہی ہوں۔

ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا یہ عمل قانونِ شرع میں کس نظر سے دیکھا جائے گا؟ کیا فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے اہلِ سنت میں "مرد علماء" ناکافی تھے۔ برائے مہربانی پہلی فرصت میں اس پر مدلّل فتویٰ تحریر فرما کر ارسال فرمائیں، کیونکہ اس سے مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والی طالبات، معلمات و منتظمات ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ بعض خوش الحان خواتین اپنی قراءت نعت و تقاریر پر مشتمل کیسٹیں منظرِ عام پر لانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں، یاد رہے کہ مذکورہ خاتون تقاریر کے حوالے سے خواتین میں خاصی مقبول ہیں، اگر اس بات کا فوری نوٹس نہ لیا گیا تو عنقریب مرد علماء کے خطابات سننے والے مفقود ہو جائیں گے۔ اور ہر جگہ اہل سنت کی خواتین کی کیسٹیں بجتی سنائی دیں گی، (سحر سیفی، جامعہ سیفیہ خراسانیہ لبنات الاسلام، مدینہ کالونی بھُسہ روڈ بریلہ شریف، گجرات)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: إن اتّقيتنّ فلا تخضعن بالقولِ فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولاً معروفا ج

ترجمہ: "اگر اللہ سے ڈرتی ہو (اور یقیناً ڈرتی ہو) تو (پسِ پردہ مردوں سے بضرورت) بات کرنے میں (ایسا) نرم لہجہ اختیار نہ کرنا کہ جس کے دل میں (شہوانیت کا) روگ ہے وہ (اپنی خواہش نفس کی تکمیل کا) طمع کرنے لگے اور دستور کے مطابق (اچھی) بات کرنا، (القرآن، سورۃ الاحزاب: 32)"۔

عن يحيى بن سعيد، عن عمرة عن عائشة رضي الله عنها قالت: لو ادرك

رسول الله ﷺ ما أحدث النساء لمنعهنّ، كما منعت نساء بني اسرائيل ـ قلت لعمرة: أو منعن؟ قالت: نعم ـ

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ، فرماتی ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کو اس حال پر پاتے، جو آپ کے بعد ہوا تو آپ ان کو مسجد آنے سے منع فرما دیتے، جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے عَمرہ سے پوچھا! کیا بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا؟، انہوں نے کہا: ہاں!، (صحیح بخاری رقم الحدیث :869، سنن ابی دواؤ، رقم الحدیث: 570)''۔

عن عبدالله، عن النبی ﷺ قال: "صلاة المرأة فی بیتها افضل من صلاتها فی حجرتها، و صلاتها فی مخدعها افضل من صلاتها فی بیتها"۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنھما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت کا دالان میں نماز پڑھنا، صحن میں پڑھنے سے بہتر ہے اور کوٹھری میں دالان سے بہتر ہے، (سنن ابی دواؤ، رقم الحدیث: 571)''۔

عن ابی موسی، عن النبی ﷺ قال: "کل عینٍ زانیة، و المرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهی کذا و کذا ـ یعنی زانیة"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے (یعنی جو اجنبی کی طرف شہوت بھری نظر سے دیکھے) اور بے شک عورت عطر لگا کر کھلی مجلس میں جائے تو ایسی اور ایسی ہے۔یعنی زانیہ ہے، یعنی وہ محرکات واسبابِ زنا اختیار کر رہی ہے، جس کے باعث گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2786)''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ولا یضربن بارجلهن لیعلم ما یخفین من زینتهن۔

ترجمہ: اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اس زینت کا لوگوں کو علم ہو جائے جو انہوں نے چھپا رکھی ہے، (القرآن، سورۃ النور: 31)۔"

علامہ ابو بکر جصاص حنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ پازیب کی آواز سے اس کی اپنی آواز زیادہ فتنہ انگیز ہے، اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے عورت کی اذان کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس میں آواز بلند کرنی پڑتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے، (احکامِ القرآن جلد 3 ص: 319 مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)۔"

علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی لکھتے ہیں:

"علامہ ابن ہمام حنفی نے کہا ہے کہ نوازل میں تصریح ہے کہ عورت کی آواز عورت (واجب الستر) ہے اور اس پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورت کا عورت سے قرآن مجید پڑھنا مستحب ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، (فتح القدیر جلد 6 ص: 374 مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)"۔

علامہ ابو عبد اللہ خطاب مالکی لکھتے ہیں:

"عورتوں کا آواز بلند کرنا مکروہ ہے، عورتوں کا اذان دینا، بلند آواز سے نماز پڑھنا اور بلند آواز سے حج میں تلبیہ (اللھم لبیک) کہنا سب مکروہ ہے، علامہ لخمی نے کہا ہے کہ عورتوں کی اذان ممنوع ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، علامہ خطاب مالکی کہتے ہیں کہ علامہ ابن یونس اور علامہ ابن ناجی وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے کہ عورت کی آواز عورت ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ عورت کا آواز بلند کرنا عورت ہے، کیونکہ صحابہ کرام امہات المؤمنین اور دیگر صحابیات سے احادیث روایت کرتے تھے، (مواہب الجلیل

جلد 1 ص:435 مطبوعہ دارالفکر بیروت)"۔

امام رازی شافعی لکھتے ہیں:

أن المرأة منهية عن رفع صوتها بالكلام بحيث يسمع ذالك الأجانب اذ كان صوتها اقرب الى الفتنة من صوت خلخالها، ولذالك كرهوا أذان النساء لانه يحتاج فيه الى رفع الصوت والمرأة منهية عن ذالك۔

ترجمہ: "عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ عورت کی اپنی آواز پازیب کی آواز سے زیادہ فتنہ انگیز ہے اسی وجہ سے عورت کو اذان دینے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اذان میں آواز بلند کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے ،(تفسیر کبیر جلد 8 ص: 367 مطبوعہ دار احیاء التراث العربي، بیروت)"۔

علامہ بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

"پازیب کی آواز سنانے سے منع کرنا عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت پر زیادہ دلالت کرتا ہے ،انوار التنزیل علی ہامش عنایۃ القاضی جلد، 6 ص: 374 مطبوعہ دار صادر، بیروت)"۔

جس طرح قرآن مجید میں عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت بطور کنایہ اور مبالغہ ہے، سو اسی طرح حدیث میں بھی عورت کے آواز بلند کرنے کو کنایہ اور مبالغہ سے منع کیا ہے، امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عن ابی هريرة رضی الله عنه ،عن النبی ﷺ قال: " التسبيح للرجال ، والتصفيق للنساء "۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: (امام کو سہو پر مطلع کرنے لئے) مردوں کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہنا) اور عورتوں کے لئے تصفیق (یعنی دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا) ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث:1303)"۔

اسی کی مثل حضرتِ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے (صحیح بخاری رقم الحدیث 1304 روایت ہے، اس حدیث کو امام مسلم اور امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی 681 ہجری لکھتے ہیں:

(ویکرہ الجمع بینھما) أی بین الاشارۃ والتسبیح (لأن بأحدھما کفایۃ) وھذا فی حق الرجال، أما النساء فیصفقن یضربن بظھور أصابع الید الیمنی علی صفحۃ الکف الیسری لما مر أن لھن التصفیق لأن فی صوتھن فتنۃ فلا یستحب لھن التسبیح۔

ترجمہ: "(اور تسبیح و تصفیق کا جمع کرنا مکروہ ہے) اور تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا مردوں کا حق ہے، رہا عورتوں کا معاملہ پس وہ تصفیق کریں دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر ماریں، جیسا کہ گزرا کہ ان کے لئے تصفیق ہے اس لئے کہ ان کی آواز "فتنہ" ہے پس ان کے لئے تسبیح (یعنی سبحان اللہ کہنا) مستحب نہیں ہے، (فتح القدیر جلد 1 ص: 419 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکاتِ رضا، گجرات ھند)"۔

نماز میں امام کو متنبہ کرنے کے لئے بلند آواز سے سبحان اللہ کہا جاتا ہے اور چونکہ عورت کا نماز میں آواز بلند کرنا شرعاً ممنوع اور مذموم ہے اس لئے نبی ﷺ نے عورت کو سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے علامہ بدرالدین عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

شارع علیہ السلام نے عورت کے سبحان اللہ کہنے کو اس لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کی

آواز فتنہ ہے اس لئے اس کو اذان ،امامت ،اور نماز میں بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے ۔(عمدۃ القاری جلد 7 ص: 279 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ مصر)"۔

علامہ علی قاری حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

عورت کو تصفیق (ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے) کا حکم اس لئے دیا کہ اس کی آواز عورت ہے ،(مرقات جلد 3 ص:10 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)"۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں عورت کو زمین پر پیر مارنے سے منع کیا ہے تا کہ اس کی پازیب کی آواز سن کر اجنبی مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہوں اور حدیث میں عورت کو نماز میں سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے ،اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا آواز کو بلند کرنا بھی ممنوع ہے ،فقہاءِ احناف کے نزدیک عورت کی آواز عورت ہے ،اور جس طرح ماسوائے ضرورت کے وہ اجنبیوں پر چہرہ ظاہر نہیں کر سکتی ،اسی طرح وہ بغیر ضرورت کے اجنبی مردوں پر اپنی آواز بھی ظاہر نہیں کر سکتی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "عورتوں کا بیانِ میلاد شریف آنحضرت ﷺ " زنانی محفل میں بآوازِ بلند نثر و نظم پڑھنا اور نظم خوش آوازی و لحن کے ساتھ پڑھنا اور مکان کے باہر سے ہمسایہ کے مردوں اور نامحرموں کا سننا تو ایسا پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا:

عورت کا خوش الحانی سے بآواز ایسا پڑھنا کہ نامحرموں کو اس کے نغمہ کی آواز جائے حرام ہے ۔نوازل للامام فقیہ ابو اللیث میں ہے:

نغمة المرأة عورة۔ ترجمہ: "عورت کا اونچی آواز سے شعر پڑھنا "عورت" یعنی محل

ستر ہے"۔

کافی امام ابوالبرکات نسفی میں ہے:لا تلبی جھر الان صوتھا عورۃ ۔

ترجمہ:عورت بلند آواز سے (حج کی) تلبیہ نہ پڑھے اس لئے کہ اس کی آواز قابلِ ستر ہے۔

امام ابوالعباس قرطبی کی کتاب السماع پھر بحوالہ علامہ علی مقدسی امداد الفتاح علامہ شرنبلالی پھر ردالمحتار علامہ شامی میں ہے:

لا نجیزلھن رفع اصواتھن ولا تمطیطھا ولا تلینھا وتقطیعھا لما فی ذٰلک من استمالۃ الرجال الیھن وتحریک الشھوات منھم ومن ھذا لم یجز ان توذن المرأۃ ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

عورتوں کو اپنی آوازیں بلند کرنا ، انہیں لمبا اوردراز کرنا ،(لہجے کو)نرم(اور پرکشش)بنانا اوران میں تقطیع کرنا (یعنی ایک ایک لفظ جدا کر کے تحلیلی عروض کے مطابق پڑھنا)،ہم عورتوں کوان باتوں کی اجازت نہیں دیتے ،کیوں کہ ان کے سبب مردوں کاان کی طرف میلان ہوتا ہےاوران کے جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں ،اسی وجہ سے عورت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اذان دے،واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ت)(فتاویٰ رضویہ ج 22،ص:43-242 رضافاؤنڈیشن،لاہور)۔

مصنف بہارِشریعت علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ "غنیۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"عورت کوعورت سے قرآن مجید پڑھنا غیر محرم نابینا سے پڑھنے سے بہتر ہے کہ اگر چہ وہ اسے دیکھتا نہیں مگر آواز تو سنتا ہےاور"عورت کی آواز بھی عورت ہے"،یعنی غیرمحرم کو بلاضرورت سنانے کی اجازت نہیں (بہارِشریعت جلد 1 ص:207 مکتبہ

رضویہ آرام باغ روڈ کراچی)''۔

سوال میں جس خاتون مبلغہ کا تذکرہ ہے، آپ کے بقول شروع میں ان کا رویہ درست تھا، مگر پھر شاید نمود ونمائش کی خواہش غالب آ گئی، اور فرحت ہاشمی صاحبہ کے غیر شرعی طرزِ عمل کو اپنے لئے جواز کی دلیل بنایا۔ یہ کہاں کا اصول ہے کہ برائی کا مقابلہ کرنے کے لئے خود برائی کا ارتکاب کیا جائے؟ دین کا مبلغ ہونے کے ناطے احکامِ شرع ودین کی پاسداری کرنا اوّلین فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

ترجمہ: ''کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم نہیں سمجھتے؟، (القرآن، سورۃ البقرۃ: 44)''۔

موصوفہ کو چاہئے کہ احکامِ شرع کی پابندی کریں اور سستی و دنیاوی شہرت کے حصول اور خودنمائی کے لئے احکامِ شرع کی پامالی سے اجتناب کریں اور دین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود کو دین میں ڈھالنے کی عادت بنائیں اور دین میں فتنے برپا نہ کریں۔

فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے علماء موجود ہیں اور الحمد للہ ہم نے ''عصمتِ آدم علیہ السلام'' سے متعلق فرحت ہاشمی کے گستاخانہ طرزِ عمل پر اس کا رد کیا ہے فتوی کی نقل آپ کو ارسال کی جارہی ہے۔

(نوٹ): عصمتِ آدم علیہ السلام سے متعلق فتویٰ ''تفہیم المسائل جلد سوم'' میں شامل کیا جاچکا ہے۔

مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے

سوال : 166

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہذا میں کہ مرد کو ریشم کا لباس حرام ہے، لیکن ایسا کپڑا جس میں تھوڑی بہت ملاوٹ ہو ریشم کی جیسا کہ چائنا کا بوسکی کپڑا۔ سوال یہ ہے کہ کتنی مقدار میں ریشم مکس ہو تو حرام ہے؟۔(عبدالقیوم، نورانی مسجد، جہانگیر روڈ، کراچی)۔

جواب:

احادیثِ مبارکہ میں ریشم پہننے پر سخت وعید فرمائی ہے، حدیث پاک میں ہے: عن ثابت قال: سمعت ابن الزبیریخطب یقول: قال محمدﷺ: ''من لبس الحریرفی الدنیا لن یلبسه فی الآخرة۔

ترجمہ: ''حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن زبیر کو فرماتے ہوئے سنا: محمد ﷺ نے فرمایا: کہ جو دنیا میں ریشم پہنے آخرت میں وہ ہرگز ریشم نہیں پہنے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5833)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اس مسئلے پر احادیث نقل فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لاتلبسوا الحریر فانه من لبسه فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة۔رواه الشیخان عن امیرالمؤمنین عمر و النسائی و ابن حبان و الحاکم و صححه عن ابی سعید الخدری و الحاکم عن ابی هریرة و ابن حبان عن عقبة بن عامر رضی الله تعالیٰ عنهم اجمعین۔

ترجمہ: ریشم نہ پہنو جو اسے دنیا میں پہنے گا آخرت میں نہ پہنے گا (اس کو بخاری و مسلم

نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔نسائی، ابنِ حبان اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن حبان نے حضرت عامر بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی، (صحیح بخاری باب لبس الحریر)۔

نسائی کی ایک روایت میں ہے فرماتے ہیں ﷺ: من لبسه في الدنيا لم يدخل الجنة، رواه عن اميرالمؤمنين عمر رضی الله عنه ، ترجمہ: جو دنیا میں ریشم پہنے گا جنت میں نہ جائے گا، امام نسائی نے اس کو امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 22 ص: 156 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

فتاویٰ عالمگیری میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: يجب ان يعلم ان لبس الحرير وهو ما كانت لحمته حريرا وسداه حريرا حرام على الرجال في جميع الاحوال عند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ۔

ترجمہ: ''امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک تمام حالتوں میں، اگر کپڑے کا تانا اور بانا ریشم کا ہو تو وہ امام اعظم ابو حنیفہ (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک تمام صورتوں میں مرد پر حرام ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص: 330 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

صاحبِ بہارِ شریعت علامہ امجد علی رحمۃ اللہ علیہ عالمگیری کے حوالے سے لکھتے ہیں: تانا ریشم ہو اور بانا سوت مگر کپڑا اس طرح بنایا گیا ہے کہ ریشم ہی ریشم دکھائی دیتا ہے تو اس کا پہننا مکروہ ہے، (بہارِ شریعت جلد دوم ص: 620 مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔

مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے

سوال: 167

ایک شخص نے کسی ادارے میں کام کیا، وہاں سے کچھ مال چرالیا اور اسی

ادارے میں نوکری کے دوران بھی پورا وقت نہیں دے پایا۔ مالک کو وقت نہ دینے کے بارے میں معلوم تھا، مگر وہ تنخواہ دے دیا کرتا تھا۔ اب وہ شخص اس ادارے کو ایک ایسی چیز دے رہا ہے، جس سے اس ادارے کو بھرپور فائدہ پہنچے گا، مثال کے طور پر اس شخص نے اس ادارے سے =/200000 دو لاکھ روپے کا مال غائب کیا اور وہ بہت توبہ بھی کرتا ہے اور اس ادارے کے سامنے اپنے اس گناہ کا اظہار کرے گا تو بہت رسوائی کا سامنا ہو گا۔ اب جب کہ وہ شخص اس ادارے کو اگر وہ جو چیز دینا چاہتا ہے، اس کے بدلے کوئی ایسے الفاظ کے ساتھ حیلہ شرعی کر لے کہ اس کا یہ معاملہ عزت کے ساتھ حل ہو جائے۔

برائے مہربانی جتنا ممکن ہو آسان رہنمائی فرمائیں۔

سوال: 168

گناہ کے سبب جن لوگوں کی رقم کھالی یا چرالی اب ان لوگوں سے معافی مانگنا چاہتا ہے، برائے مہربانی ان سے کس طرح معاف کروایا جائے یا معافی مانگی جائے کہ عزت بھی بنی رہے اور کام بھی ہو جائے اور وہ لوگ معاف بھی کر سکتے ہیں، برائے مہربانی کچھ ایسے الفاظ کا شرعی حیلہ بتائیں کہ اس سے کہا جائے اور وہ معاف کر دیں، (محمد ندیم قادری، بلاک 6 لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین امنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاخرۃ ج

ترجمہ: ”بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے، (النور: 19)“۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

اگرچہ قرآن مجید میں ''فاحشہ'' اور ''فحشاء'' کا لفظ بطور استعارہ کے بالعموم زنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس سے عام بے حیائی اور برائی اور اخلاق ذمیمہ بھی مراد ہیں، لہٰذا اس آیت کی رو سے گناہ، برائی، اور بدی کی اشاعت اور اظہارِ گناہ ازروئے قرآن معیوب اور ناپسندیدہ فعل ہے، یہی وجہ ہے کہ قومِ لوط کے جرم کی قبح وشناعت کو عیاں کرنے کیلئے قرآن نے فرمایا کہ:

ولوطا اذ قال لقومه انكم لتاتون الفاحشة ماسبقكم بهامن احدمن العلمين، ائنكم لتاتون الرجال و تقطعون السبيل و تاتون فى ناديكم المنكر ط

ترجمہ: ''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، بے شک تم بے حیائی کا کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا، کیا تم (قانون فطرت کے خلاف) مردوں سے شہوت پوری کرتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور تم اپنی مجلسوں میں اعلانیہ برے کام کرتے ہو، (العنکبوت:28,29)''۔

ان آیات میں قومِ لوط کے اعمال بد کا یہ رخ اجاگر کیا کہ وہ منکر، بے حیائی اور بدی کو چھپا کر کرنے کے بجائے، اس کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور اس کو ذریعۂ تفاخر سمجھتے تھے، اور یہ کیفیت تب پیدا ہوتی ہے، جب کسی معاشرے میں اجتماعی ضمیر مرجاتا ہے، بدی کی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور خیر کی قوتیں مغلوب ہوجاتی ہیں، یعنی بدی کا اعلان واظہار اس کی شناعت وقباحت میں اضافے کا باعث ہے، شریعت کی اصل روح یہ ہے کہ ''بدی'' کو حتی الامکان مستور رکھا جائے، حدیث پاک میں ہے:

(1) عن يزيد بن نعيم عن ابيه ان ماعزا اتى النبى ﷺ فاقر عنده اربع مرات فامر برجمه وقال لهزال لوسترته بثوبك كان خيرالك، قال ابن المنكدران

هزالا امرماعزاً ان یاتی النبی ﷺ فیخبرہ۔

(ترجمہ):یزید بن نعیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ماعز نے نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوکر اپنے جرم (زنا) کا چار بار اعتراف کیا،تو آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا،اور آپ ﷺ نے ہزال سے فرمایا: کاش کہ تم نے اس کے جرم کی پردہ پوشی کی ہوتی یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا،ابن منکدر کہتے ہیں کہ ھزال نے ماعز کو کہا تھا کہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوکر انہیں اپنے گناہ کے بارے میں بتائے،(سنن ابی داؤد،رقم الحدیث:43784377, مطبوعہ موٴسسۃ الریان،بیروت)"۔

(2) عن عبداللہ بن صفوان عن ابیہ انہ نام فی المسجدو توسدرداءہٗ فاخذ من تحت راسہ۔ فجاء بسارقہ الی النبی ﷺ ۔ فامر بہ النبی ﷺ ان یقطع۔ فقال صفوان یا رسول اللہ! ،لم اردھذا، ردائی علیہ صدقۃ، فقال رسول ﷺ "فھلا قبل ان تاتینی بہ"۔

ترجمہ:"عبداللہ بن صفوان نے اپنے والد (صفوان) سے روایت کیا کہ وہ مسجد میں اپنی چادر کا تکیہ بنا کر سوئے ہوئے تھے کہ (کسی شخص نے) ان کے سر کے نیچے سے (چادر چرالی)،تو وہ اپنے چور کو پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے،حضور نے (اعتراف جرم کے بعد) اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا،تو (اس موقع پر) صفوان نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا ارادہ یہ نہیں تھا (کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے)،میری یہ چادر اس پر صدقہ ہے (یعنی اسے معاف کر دیجئے)،تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"تو تم نے مقدمہ میرے پاس لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کر دیا"،(سنن ابن ماجہ :2595)"۔

چونکہ "حد شرعی" کا مقدمہ جب قاضی کے سامنے پیش ہوجائے تو پھر اعتراف جرم یا

گواہوں کے ذریعے جرم ثابت ہونے کے بعد مقدمہ واپس نہیں لیا جا سکتا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حد نافذ فرمادی، لیکن آپ نے اس بات کو پسند فرمایا کہ مدعی، قاضی کی عدالت میں مرافعہ سے پہلے اپنے قصوروار اور ملزم کو معاف کردے اور اس کی ستر پوشی کرے۔ بلکہ اسلام نے مسلمان کی ستر پوشی کو بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(1)من ستر مسلما ستره الله یوم القیمه۔

ترجمہ: "جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب کو (اپنی عفو ومغفرت اور رحمت میں) مستور فرمائے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2442)"۔

(2)من رأی عورة اخیه فسترها کمن احیا موؤدة۔

ترجمہ: "جس شخص نے اپنے (کسی دینی بھائی) کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی، تو وہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) اس شخص کی مانند اجر پائے گا، جس نے کسی زندہ درگور بچی کو (نکال کر) اسے (نئی) زندگی عطا کردی ہو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث 4855)"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین وشریعت کی اصل روح یہ ہے کہ خطا کار کی پردہ پوشی کی جائے، الا یہ کہ کسی خاص صورت حال میں شریعت کا تقاضا اس کے برعکس ہو۔ اب صورت مسئولہ میں چونکہ آپ پر اللہ کا کرم ہوا اور آپ نے ماضی کی معصیت کی زندگی کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور حقوق العباد کی جو حق تلفی آپ سے ہوئی ہے، آپ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ "ستار العیوب" ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور جتنا مال

آپ نے ادارے یا افراد کا ناحق لیا ہے، اتنی مالیت آپ ان کو لوٹا دیں، اس طرح کہ وہ اس پر مالکانہ تصرف کرسکیں، خواہ آپ اسے عطیہ کا نام دیں، ھبہ کا نام دیں یا اعانت کہیں، جو بھی حالات کے تحت مناسب ہو، ان کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ آپ نے ان کا اتنا مال ناجائز طریقے سے لیا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہیں کہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے ظلِ رحمت اور اپنے حبیب کریم ﷺ کے دامانِ رحمت میں پناہ عطا فرمائے اور دنیا و حشر میں رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ اور ان افراد سے یہ کہیں کہ مجھے احساس ہے کہ دانستہ یا نادانستہ مجھ سے آپ کی حق تلفی ضرور ہوئی ہوگی، خواہ آپ کو یاد ہو یا نہ ہو، میری ان سب تقصیرات کو معاف فرمادیں تاکہ میں اپنے ضمیر کو مطمئن کرکے اور احساسِ گناہ کے بوجھ سے ہلکا ہوکر سفرِ حج پر روانہ ہوسکوں اور اللہ تعالیٰ کے اس اجر و ثواب کا یقینی امیدوار بن سکوں، جو رسول اللہ ﷺ نے حجِ مبرور کیلئے بیان فرمایا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویبرأ بردها ولو بغیر علم المالك) فی "البزازیة" غصب دراهم انسان من کیسه ثم ردها فیه بلاعلمه برئ۔

ترجمہ: "اور (جس نے کسی کی کوئی چیز غصب کرلی ہو یا باطل طریقے سے لے لی ہو تو) اسے مالک کے علم میں لائے بغیر اسے لوٹا دینے سے وہ غاصب بری الذمہ ہوجائے گا، اور "بزازیہ" میں ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کی کچھ رقم، اس کے پرس سے نکال لی اور پھر اسے بتائے بغیر واپس رکھ دیا (یا اسے لوٹا دیا) تو وہ بری الذمہ ہوجائے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد: 9، ص: 219, 220، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ولو سالہ سلطان عن فاحشة وقعت منه سرا کزنا

او شرب فله ان يقول ما فعلته لان اظهارها فاحشة اخرى۔

ترجمہ: "اگر حاکم کسی شخص سے اس کے جرم کے متعلق پوچھے، جو اس نے چھپا کر کیا ہے، جیسے شراب پینا یا زنا کرنا تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ کام میں نے نہیں کیا، چونکہ بے حیائی کا اظہار بھی بے حیائی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد:9،ص:525،مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی

سوال: 169

والدہ کے انتقال کے بعد میرے چھوٹے بھائی طارق نے مجھ پر غلط قسم کے الزامات لگائے اور میرے بچوں سے تمام بات کی، مجھے بعد میں معلوم ہوا تو میں نے اس سے پوچھا اس بات پر میرے ساتھ مار پیٹ کی جھگڑا بڑھ گیا اس کی بیوی نے بھی میرے ساتھ تشدد کیا۔ جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی۔ اب آپ شرع حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ قسم کیسے توڑی جائے گی؟ (جہاں آراء، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے: "جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی"، اس میں آپ کے قسم کھانے کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور "اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی" یہ شرعی قسم کے کلمات نہیں ہیں، لغو کلمات ہیں، اگر چہ بندۂ مومن کو اس طرح کے کلمات ادا

نہیں کرنے چاہئیں۔لہذا اگر آپکا سوال درست ہے، حقیقت واقعہ کے مطابق ہے تو اس سے شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی، آپ اپنے بھائیوں سے مل سکتی ہیں، اس میں کوئی کفا رہ عائد نہیں ہوتا، اور آپ کے بیٹے کو بھی اپنے ماموں سے ملنا چاہئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:"لا یحلّ لرجلٍ أن یھجر أخاہ فوق ثلاث لیالٍ"۔

ترجمہ: ''مؤمن کیلئے یہ جائز نہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycoh) کرے۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6077)''۔

نیز آپ کے بھائی نے اگر غلط الزامات لگائے ہیں تو انہیں بھی آپ سے اور اللہ سے معافی مانگنی چاہئے۔

پرائز بانڈز اور شیئرز کا شرعی حکم

سوال: 170

کیا Shares اور Prize Bond کا رکھنا جائز ہے؟،

(کامران، کراچی)۔

جواب:

جن اداروں/کمپنیز کے کاروبار میں سودی لین دین شامل ہے یا کسی حرام چیز کا کاروبار ہے تو اس کے شراکتی حصص (Shares) رکھنا یا اس کا شراکت دار بننا جائز نہیں ہے، اور جن اداروں/کمپنیز کے کاروبار میں سودی لین دین شامل نہیں ہے یا وہ شرعی طور کسی ممنوع وحرام چیز کا کاروبار نہیں ہے تو اس کا شراکت دار (Share Holder) بننا جائز ہے۔انعامی بانڈز (Prize Bond) کی خرید وفروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید وفروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا

اختلاف ہے، ہمارے علماء اہلسنت وجماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے،اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے،میں ماضی میں ایکسپریس کے صفحات پر اس موضوع پر قدرِ تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں،یہ اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے،یہ مسلکی نوعیت کا،اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔دورِ حاضر کے ایسے مسائل جو ''مجتہد فیہ'' ہیں،یعنی جن پر اس عہد کے اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم نے دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے،اور علماء کی فقہی آراء ان بارے میں مختلف ہوتی ہیں،تو ایسی صورت میں عامۃ المسلمین کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فقاہت اور اجتہادی اہلیت پر انہیں زیادہ اعتماد ہو،ان کی رائے پر عمل کرلیا کریں،لیکن یہ ترجیح دیانت کی بنیاد پر ہو محض اتباعِ نفس میں نہ ہو۔

ٹریفک سگنل توڑنے کا شرعی حکم

سوال: 171

ٹریفک سگنل جو کہ عوام کی بھلائی کے لئے بنایا گیا ایک قانون ہے اور عمومی طور پر اس کی پاسداری عوام میں نظر نہیں آرہی ہے،سوال یہ ہے کہ کیا سگنل کا توڑنا گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے؟،(کامران،کراچی)۔

جواب:

اسلام نے حلال وحرام کی حدود مقرر کردی ہیں،جن امور کی حرمت قرآن وسنت میں منصوص ہے،وہ قطعی ہیں ان کی حرمت پر اجماع ہوچکا ہے،ان کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے باقی ایسے تمام امور جو اپنی اصل کے اعتبار سے تشریعی نہیں ہیں،ان کے بارے میں ہمارا مسلّمہ فقہی اصول ہے کہ:''اشیاء میں اصل اباحت ہے''تاوقتیکہ کسی دلیل شرعی سے اس کی حرمت ثابت نہ ہوجائے۔ان مباح

امور کا دائرہ کافی وسیع ہے،ان کے بارے میں حاکم وقت (اس کی حیثیت حاکمہ حالات وزمانہ کے اعتبار سے جو بھی ہو)،مقننہ (Legislature) یا پارلیمنٹ کو اجتماعی مفاد میں قانون سازی کا حق حاصل ہے،''Traffic Signal'' یا یکطرفہ ٹریفک، دائیں یا بائیں مڑنے کی ممانعت یا پارکنگ کی ممانعت سب قوانین اسی کے ذیل میں آتے ہیں،حکومت عوامی مفاد اور انسانی زندگی کو نقصان یا ہلاکت سے بچانے کے لئے تعزیر بھی مقرر کرسکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:لان طاعة الامام فیما لیس بمعصیة واجبة ۔

''یعنی ایسے امور میں حاکم وقت کی اطاعت،جن میں ازروئے شریعت معصیت لازم نہ آتی ہو، واجب ہے،اور ترک واجب گناہ صغیرہ ہوتا ہے،مومن کو ویسے بھی عزت نفس کا پاس رکھنا چاہئے''۔

کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج

سوال: 172

کالجوں میں عام طور پر حساب وکتاب کے حوالے سے سود کا درج کرنا اور اس کو وصول کرنا وغیرہ وغیرہ سکھایا جاتا ہے،کیا اس کی لکھت پڑت جائز ہے حالانکہ یہ عمل صرف سکھانے کی حد تک ہوتا ہے؟اور یہ بھی بتائیں کہ کیا اس کا سکھانا گناہ کے کس درجے میں ہوگا(کبیرہ/صغیرہ)؟،(کامران،کراچی)۔

جواب:

حصول علم کی حد تک یہ جائز ہے، کیونکہ کامرس ،اکاؤنٹنگ اور آڈٹنگ کے نصابی وتربیتی کورسز کا یہ لازمی حصہ ہوتے ہیں،سودی کاروباری ادارے میں ملازمت جائز نہیں ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

بجلی کی چوری

سوال: 173

آپ جانتے ہوں گے کہ عموماً حکومت کے محکموں کی نااہلی کی وجہ سے جیسا کہ بجلی کے بل جو کہ صارف کو بھیجے جاتے ہیں ان میں بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ بل بنا کر بھیج دیا جاتا ہے، جبکہ اس پر اتنا بل لازم نہیں ہوتا وہ صارف اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے بجلی کے میٹر میں کچھ کمی بیشی کرواتا ہے اگرچہ قانوناً یہ جرم ہے لیکن مجبوری میں ایسا کیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟، ناجائز ہونے کی صورت میں صارف اس رقم کی ادائی کس طرح کرے جو کہ چوری کی تھی اور اس چوری کے دوران جتنی عبادات کی تھیں کیا وہ سب ثواب سے محروم ہوگئیں؟ یا ان کا لوٹانا واجب ہے؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:

بجلی کے میٹر میں ردوبدل کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح بجلی کے محکمے کا میٹروں کو تیز کر کے صارفین سے زائد بل لینا، یہ بھی خیانت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صریح خلاف ورزی ہے کہ: ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ ترجمہ: ''آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ (النساء:29)''۔لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا ظلم ہمارے لئے ظلم کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ شیطان کے بہکاوے اور تزویرات ہیں، جو انسان کے نفس کو گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ o ولو القیٰ معاذیرۃ۔ ترجمہ: ''بلکہ انسان اپنے نفس (کے حسن وقبح اور خیر وشر) پر خوب آگاہ ہے، خواہ وہ (فریبِ نفس کے لئے

) کتنے ہی عذر تراشتا رہے،(سورۃ القیامۃ : 15-14)''،اورارشادِ باری تعالیٰ ہے:ان کلُّ نفسٍ لما علیھا حافظ ترجمہ:''ہر نفس اپنے اوپر نگہبان ہے، (الطارق:4)''۔حدیث پاک میں ہے: عن النواس بن سمعان أن رجلاً سأل رسول اللہ ﷺ عن البر و الاثم "فقال النبی ﷺ : "البرُّ حسن الخلق ، والاثم ماحاك فی نفسك و کرھت أن یطلع علیه الناس "۔

ترجمہ:''نواس بن سمعان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ (کی پہچان) کی بابت دریافت کیا،تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے،اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے (یعنی جس پر تمہارے دل میں چبھن اور کسک محسوس ہو)اور تجھے یہ بات ناگوار ہو کہ لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے ،(سنن ترمذی،رقم الحدیث:2389)''۔

حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے،تو قبل اس کے کہ وہ اپنے دل کی بات کہتے ،رسول اللہ ﷺ نے اس کے دل کا حال بیان کرتے ہوئے خود ہی فرمایا: کہ تم نیکی اور گناہ کی بابت پوچھنے آئے ہو؟،انہوں نے عرض کیا:جی ہاں،پھر آپ نے فرمایا:اے وابصہ !اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے،جس پر تمہارے دل کو اطمینان وقرار نصیب ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں دل میں تردُّد ہو (کہ کروں یا نہ کروں)،اگرچہ لوگ تمہیں (اپنے من پسند) فتوے دیتے رہیں، (مسند احمد،جلد 4،ص:228)''۔

عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر محرمات کا اثر پڑتا ہے اور اس سلسلے میں احادیث موجود ہیں:عن ابن عمر ، عن النبی ﷺ قال: "لا تقبل صلاۃ بغیر طھور ،

ولا صدقة من غلول "۔ ترجمہ:"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1)"۔

عن ابی ہریرۃ قال :قال رسول اللہ ﷺ : "ایھاالناس ! ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا ۔وان اللہ أمر المؤمنین بما امر بہ المرسلین ۔فقال : ﴿یاایھاالرسل کلوا من الطیبٰت واعملوا صالحا انی بماتعملون علیم﴾وقال : ﴿یاایھا الذین امنوا کلوا من طیبات مارزقنٰکم﴾ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر ۔ یمد یدیہ الی السماء ۔ یارب ! یارب ! و مطعمہ حرام ، و مشربہ حرام، و ملبسہ حرام و غذی بالحرام ،۔ فانی یستجاب لذالک ؟۔

ترجمہ:"حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ صرف پاک (صدقات کو) مقبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المومنون: 51)"۔پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پراگندہ ہیں، طویل سفر کر کے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگا! اور اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام سے ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2308)"۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائشِ نسل کا جواز

سوال: 174

جانوروں کی نسل بڑھانے کے لئے انجکشن لگانے والا طریقہ جائز ہے یا نہیں؟۔(اسد روف بلوچ، کراچی)۔

جواب:

جانوروں کی افزائشِ نسل (Breeding) کے لئے نَر جانور (Male Animal) کے مادّۂ منویہ (Semon) کے تولیدی جرثومے (Sperm) کو انجکشن کے ذریعے مادّہ جانور (Female Animal) کی بچہ دانی (Uterus) میں پہنچانا جائز ہے،اس کے نتیجے میں حلال جانوروں (بھیڑ، بکری ، گائے، بھینس، اونٹنی وغیرہ) کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی حلال ہوتے ہیں، ان کی قربانی بھی ہر قسم کی کراہت سے پاک ہے اور جائز ہے ۔احکامِ شرعیہ اور رشتۂ ازدواج اور عقد نکاح کی حِلّت (Permission) اور حُرمت (Prohibition) کے احکام کا تعلق انسانوں سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمتِ عقل عطا کر کے خیر وشر اور حلال وحرام میں تمیز کا ملکہ اور فطری استعداد اور جبلّت بھی عطا فرمائی ہے اور انبیاء کرام ورُسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور کتب سماوی کے ذریعے خارجی ہدایت کا بھی اہتمام فرمایا ہے، جانور احکام کے مکلّف نہیں ہیں ۔

روحانی علاج کی شرعی حیثیت

سوال:175

روحانی علاج کا حکم قرآن پاک سے ثابت ہے ۔تو قرآن پاک اور حدیث کی روشنی میں اور مستند کتابوں کے حوالوں سے روحانی علاج کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

سوال: 176

روحانی علاج جو کہ کلام الٰہی سے کرتے ہیں اور اس کا ہدیہ مبارک لیتے ہیں یہ جائز ہے؟ تو قرآن پاک اور حدیثوں کے حوالوں سے او مستند کتابوں کے حوالے سے فتوٰی عنایت فرمائیں، تاکہ ہماری دینی اصلاح ہو جائے۔ (صوفی محمد اقبال قادری چشتی ناصری جلالی، مکان 135/10 سیکٹر 11/D نیو کراچی)۔

جواب:

کسی کے لئے دعائے خیر، آیاتِ الٰہی یا کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنا یا اسمائے مبارکہ اور آیات لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھنا یا لٹکانا شرعاً جائز ہے۔ امراض جس طرح جسمانی وطبعی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی، اخلاقی اور اعتقادی بھی ہوتے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے" شافی الامراض بالذات" صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی مشیت کے بغیر شفاء کا ملنا ناممکن ہے، لیکن یہ عالم اسباب ہے اور ہم شرعاً اسباب کو اختیار کرنے کے مکلّف ہیں یا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔ جیسے بیماری کی صورت میں ہم ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اور دوا کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اسی طرح دعا، دم اور تعویذ وغیرہ ازالۂ مرض وشر کے روحانی اسباب ہیں جیسے دوا مادی سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ونننز ل من القرآ ن ما ھو شفاء ورحمة للمؤمنین لا ولا یز ید الظّٰلمین الّا خسارا o

ترجمہ: "اور ہم قرآن میں ایسی چیز نازل فرماتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے

WWW.NAFSEISLAM.COM

(وسیلہ) شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے لئے تو صرف نقصان ہی میں اضافہ کر رہا ہے۔(بنی اسرائیل:80)"۔

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قرآن اخلاقی اور اعتقادی امراض کے لئے شفا ہے، تاہم جمہور مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیات قرآنی پڑھ کر دم کرنے یا آیات و اسمائے الٰہی کا تعویذ باندھنے سے اللہ تعالیٰ جسمانی امراض سے بھی شفا عطا فرماتا ہے۔بخاری، مسلم ،ترمذی، ابو داؤد اور مسند احمد میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور ایک شخص جو بچھو کے کاٹنے سے تڑپ رہا تھا اسے شفا مل گئی ،انہوں نے اس پر بکریوں کا ریوڑ معاوضہ بھی لیا۔لیکن صحابہ کا آپس میں اختلاف ہو گیا کہ آیا یہ اجرت ،جسے آج کل کی اصطلاح میں نذرانہ کہتے ہیں، جائز ہے یا نہیں؟ لہٰذا انہوں نے توقف کیا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر حضورﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا تو آپ نے نہ صرف اسے جائز قرار دیا بلکہ فرمایا کہ اس میں سے مجھے بھی دو۔یہ بعض مواقع پر حضورﷺ اس لئے کرتے تھے تا کہ صحابہ کرام کو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔آیات قرآنی اور کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنے (نظر بد یا موذی جانوروں کے ایذا یا جنات وغیرہ کے اثر یا مرگی کے دورے سے تحفظ کے) کا ثبوت و جواز متعدد احادیث مبارکہ اور رسول اللہﷺ کے اپنے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے۔لیکن یہ قرآن مجید کی ضمنی اور اضافی برکات ہیں۔بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت اور ضابطۂ عمل ہے جس پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس کے احکام پر عمل بھی اور قرآن پاک کی اسی جہت کو غالب حیثیت حاصل ہے۔جن احادیث مبارکہ میں تعویذ یا دم کی ممانعت آئی ہے وہ اس پر محمول ہے کہ (1) وہ دم یا منتر کلمات شرک و کفر یا کلمات ضلالت پر مشتمل ہو اور (2) یا یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو فراموش کر کے محض اسباب کو مو

مؤثر بالذات مانے۔ بلاشبہ موثر بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائیں اور وہ جب چاہے اسے سلب فرما سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حوالہ جات بالا سے روحانی علاج اور اس پر ہدیہ و نذرانہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿متفرق﴾

والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجرِ آخرت باطل نہیں ہوتا

سوال: 177

کسی نے بتایا تھا کہ والدین کی خدمت کا بہت اجر ہے۔سوال یہ ہے کہ ''اگر ہم اس خدمت کے واسطے سے دعا کریں،تو اس کا اجر کم تو نہیں ہوگا، کہ یہاں مل جائے تو آخرت میں اللہ کہے کہ اجر تو دنیا میں ہی لے لیا ہے،اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو''۔قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں،(حماد خان،بذریعہ ای میل معرفت روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ۔ ترجمہ:''اے ایمان والو! صبر ونماز (کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی) مدد طلب کرو، (البقرۃ:153)''۔اس ارشادِ باری تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ اعمالِ خیر کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے استعانت کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے،آیت میں صبر اور نماز کا ذکر ہے اور بعض مفسرین کرام نے صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔ظاہر ہے کہ وہی عمل خیر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول وماجور ہے جو دنیوی صلہ وستائش کی تمنا کیے بغیر محض اجرِ آخرت اور رضاءِ الٰہی کے لئے کیا جائے اور حدیثِ مبارک ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' یعنی اعمال (پر جو جزا مرتب ہوتی ہے اس کا) مدار (اس کی) نیت اور ارادے پر ہوتا ہے (جو اس عمل کا محرک بنتی ہے)،سے بھی یہی مراد ہے۔اور اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے:

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ترجمہ:''اورانہیں فقط اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کریں کہ اطاعت خالص اسی کی ذات کے لئے ہو، (البینۃ:5)''۔

حدیث پاک میں ہے:امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن ابی اوفٰی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کے کسی بندے سے کوئی حاجت درپیش ہوتو اسے چاہئے کہ وضو کرے اور نہایت اچھے طریقے سے وضو کرے، پھر دو رکعت نماز نفل (صلوٰۃ الحاجت) پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے، پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے اور پھر یہ دعا پڑھے:لَآ اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰـہُ الْـحَلِیْمُ الْکَرِیْمُ،سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، اَسْئَلُکَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِکَ،وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِکَ ،وَالْغَنِیْمَۃَ مِنْ کُلِّ بِرٍّ،وَالسَّلَامَۃَ مِنْ کُلِّ اِثْمٍ، لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْباً اِلاَّ غَفَرْتَہٗ، وَلَا ھَمّاً اِلاَّ فَرَّجْتَہٗ،وَلَا حَاجَۃً ھِیَ لَکَ رِضًا اِلاَّ قَضَیْتَھَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

ترجمہ:''اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، بہت بُردبار نہایت کرم فرمانے والا ہے، اللہ (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے،عرش عظیم کا مالک ہے، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پرودگار ہے، اے اللہ! میں تجھ سے (ان اعمالِ خیر کی توفیق چاہتا ہوں) جو تیری رحمت کا باعث ہوں، اور ایسے نیک پختہ ارادوں کا طلب گار ہوں جو تیری مغفرت کا سبب بنیں، اور تجھ سے تمام نیکیوں کی توفیق کا سوال کرتا ہوں اور ہر گناہ سے حفاظت کا طلبگار ہوں، (میرے) ہر گناہ کو بخش دے، ہر غم (اور رنج والم) میں کشادگی عطا فرما، اے سب سے بڑے رحم فرمانے والے! میری ہر اُس حاجت کو پورا فرما جو تیری رضا کا باعث ہے، (سنن ترمذی، رقم

الحدیث:479)''،اس حدیث کوامام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے،لیکن فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیثیں بھی معتبر ہوتی ہیں۔اسی طرح صحیح بخاری رقم الحدیث:2215میں تین آدمیوں کے غار میں پھنس جانے کا ذکر ہےاور پھر وہ باہمی مشورے سے باری باری اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان نیک اعمال کا ذکر کرتے ہیں ،جوانہوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کئے تھے،ان میں سے ایک شخص نے ماں باپ کی اس خدمت کاوسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا،جواس نے رضاءِ الٰہی کے لئے کیا تھا،اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے اعمالِ خیر کے وسیلے کواپنی بارگاہ میں مقبول فرمایااور وہ چٹان جس نے ان کی غار کا دہانہ بند کر دیا تھااور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے تھے،آہستہ آہستہ سرکتی گئی اور آخر کار غار کا دہانہ کھل گیااور وہ صحیح سلامت باہر نکل آئے۔اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جوعملِ خیر انجام دیا جائے،اس کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے استعانت (مدد مانگنے) کا خوداللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم فرمایا ہے،یہ صیغۂ امر کے ساتھ ہے جوکم درجے میں استحباب کے معنیٰ میں ضرور ہے۔اسی طرح قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے،کوئی بھی نیک عمل جو رضاءِ الٰہی کے لئے کیا گیا ہو،اس کے وسیلے سے دعا مانگنا،خواہ عذابِ آخرت سے نجات کی دعا ہو،یا کسی دنیوی مصیبت سے نجات کی،اس سے اس عملِ خیر کا اجرِ آخرت ضائع نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی امید قائم رکھنی چاہئے، اسی طرح آپ نے سوال میں جووالدین کی خدمت کی بابت دریافت کیا ہے،اگراس کے وسیلے سے کسی دنیوی مصیبت کو ٹالنے کی دعا کی جائے،تو اس سے اس کا اجر باطل نہیں ہوتا بلکہ قائم رہتا ہے،بشرطیکہ والدین کی یہ خدمت کسی دنیوی طمع وغرض سے نہ کی ہو بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے کی ہو۔

پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایامِ تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم

قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے

سوال: 178

کچھ عرصہ قبل نیو کراچی میں ایک مفتی صاحب حلال وحرام کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسکولوں میں چونکہ ماہ جون اور جولائی میں تدریس نہیں ہوتی لہٰذا ان مہینوں کی فیس لینا اسکول والوں کے لئے جائز نہیں۔ مفتی صاحب کی تقریر نے اس علاقہ میں اسکول مالکان کے لئے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ قانون کے مطابق اسکولوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسٹاف کو جون اور جولائی کی تنخواہیں پوری پوری ادا کریں، مزید یہ کہ جو اسکول کرائے کی عمارتوں میں قائم ہیں انہیں ان مہینوں کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جون، جولائی کی فیسیں وصول نہیں کی جائیں تو اسٹاف کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ جناب سے التماس ہے کہ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمائیں۔ (انتظامیہ نالج انگلش اسکول، 25/12 سیکٹر 5-E نیو کراچی)

جواب:

معاہدات وعقود بعض مشروط ہوتے ہیں اور یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے بعد میں کوئی تنازع پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسکول کی انتظامیہ کو چاہئے کہ داخلہ فارم کی شرائط میں واضح طور پر لکھ دے کہ طالب علم کو بارہ ماہ کی فیسیں پوری ادا کرنی ہونگی۔ سالانہ تعطیلات اس لئے نہیں ہوتیں کہ اسکول کی انتظامیہ یا اساتذہ پڑھانا نہیں چاہتے، بلکہ ان تعطیلات کا نظام حکومت کی طرف سے جبری ہوتا ہے اور یہ ایک عالمی

روش ہے۔اگر داخلہ فارم کے معاہدے میں لکھا نہ بھی ہو تب بھی یہ معہود (Under stood) ہوتا ہے اور فقہی قاعدہ ہے کہ "المعہود کالمشروط" یعنی یہ ایک ایسی شرط ہے جو فریقین کے ذہن میں بھی تقریباً طے شدہ ہے اور خارج میں بھی تعاملِ عام (General practice) اسی پر ہے۔لہٰذا اسکولوں کے لئے ایامِ تعطیلات کی فیس لینا جائز ہے اور اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔اس تنازع کے حل کے لئے فریقین یہ بھی کرسکتے ہیں کہ سالانہ بارہ ماہ کی فیسوں کی جو مجموعی رقم بنتی ہے، اسے دس ماہانہ قسطوں میں تقسیم کردیں اور اس طرح تعطیلات کے مہینوں کے بارے میں یہ نزاع پیدا ہی نہیں ہوگا۔اور یہ بات بھی درست ہے کہ اسکول کی انتظامیہ کو اپنے عملے کو بارہ ماہ کی تنخواہ دینی ہوتی ہے ،اور اسی طرح بلڈنگ کا کرایہ اور دیگر واجبات بھی ادا کرنے ہوتے ہیں ہالہٰذا مفتی صاحب کا حقائق کو معلوم کئے بغیر اس پر حرمت کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے، البتہ ان اعلیٰ کیٹگری کے تعلیمی اداروں کے خلاف آواز اٹھانا درست ہے، جو غیر معمولی فیسیں اور مختلف عنوانات کے تحت دیگر رقوم بھی بٹورتے ہیں، جس کی وجہ سے تعلیم صنعت بن چکی ہے، بلکہ یہ سب سے کامیاب اور منافع بخش صنعت ہے، اور یہی سبب ہے کہ اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے صرف اُمراء، صنعت کاروں، اعلیٰ مراتب کے بیوروکریٹ اور اہلِ ثروت کے بچوں کے لئے مختص ہوکر رہ گئے ہیں ۔اور اس طرح تموُّل و غربت پر مبنی یہ ایک طبقاتی نظام بن چکا ہے، جس میں دولت سے محروم طبقات استحقاق، اہلیت ،محنت اور قابلیت کے باوجود وافر دولت نہ ہونے کے سبب مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں، اولین مرحلے ہی میں حاکم و محکوم کی منزلیں جدا ہوجاتی ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

استخارہ کامفہوم،شرعی حیثیت اوراستخارہ کےنام پر ماضی کےاحوال بتانا

سوال: 179

استخارہ کا معنی ومفہوم کیا ہے اور حدیث کی روشنی میں اس کا صحیح طریقہ کیا ہے، کیا ہر معاملے میں استخارہ کرنا ضروری ہے، کسی کام سے پہلے استخارہ نہ کرنے والا یا استخارہ کرنے کے بعد اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کرسکے تو گنہگار تو نہیں ہوگا؟، (منور احمد نعیمی، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

استخارہ کے لفظی معنٰی ہیں: خیر طلب کرنا اور اس کے جامع معنٰی ہیں: وہ معاملہ جس کے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے کا انسان اپنی عقل کی روشنی میں فیصلہ نہ کرسکے اور تردُّد میں مبتلا ہوجائے کہ اسے کروں یا نہ کروں، تو اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرے، اس کا تعلق ماضی کے معاملات سے نہیں ہے، مستقبل میں درپیش ایسے معاملات سے ہے، جن کو کرنا ہے ۔ایسے تمام معاملات جن کا خیر ہونا شریعت میں ثابت ہے، ان کے لئے استخارہ نہیں کیا جائے گا، جیسے نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ، فارسی کا مقولہ ہے ع درکارِ خیر حاجتِ استخارہ نیست ۔ہاں البتہ کسی کارِ خیر کے لئے شریعت میں وقت مقرر نہیں ہے بلکہ توسُّع ہے،تو تعیینِ وقت کے لئے استخارہ کرسکتے ہیں ۔بنیادی طور پر استخارہ مباح امور میں ہوتا ہے، جیسے نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے مشروع ہے اور سنت ہے اور بعض اشخاص کے لئے ان کے بشری احوال کے مطابق واجب کے درجے میں ہے، لیکن نکاح کے لئے کس کا انتخاب کیا جائے،اس کے لئے اگر کوئی پیغام یا پیشکش آئے،تو اس کے لئے استخارہ کیا جاسکتا ہے،حدیث پاک میں ہے:

WWW.NAFSEISLAM.COM

عن جابر رضی اللہ عنہ قال کان النبی ﷺ یعلمنا الاستخارۃ فی الامور کلھا کالسورۃ من القرآن اذاھم احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضۃ ثم یقول اللھم انی استخیرك بعلمك وأستقدرك بقدرتك وأسئلك من فضلك العظیم فانك تقدر ولااقدر، وتعلم ولااعلم، وانت علام الغیوب، اللھم ان کنت تعلم ان ھذاالامر خیرلی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری۔او قال فی عاجل امری واجلہ۔ فاقدرہ لی وان کنت تعلم أن ھذاالامرشرلی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری اوقال فی عاجل أمری واجلہ فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدرلی الخیر حیث کان ثم ارضنی بہ ویسمی حاجتہ۔

ترجمہ:حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہمیں تمام امورمیں ''استخارہ'' کی تعلیم فرماتے تھے،اس اہتمام کے ساتھ،جیسے قرآن کی کسی سورت کی تعلیم فرمایا کرتے تھے،(تو استخارہ یہ ہے کہ)جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے،تو اسے چاہئے کہ دورکعت نفل پڑھے،پھر کہے:اے اللہ! میں تیرے علم کی روشنی میں خیر کی طرف رہنمائی چاہتا ہوں،اورتیری قدرت سے (حصولِ خیر کے لئے)قدرت کا طلبگارہوں اور میں تیرے فضلِ عظیم سے سوال کرتا ہوں،کیونکہ تو قدرت والا اورمیں عاجز وبے بس ہوں،اورتو (ہرمعاملے کے انجام کو) جانتا ہے ،اورمیں کچھ بھی نہیں جانتا اورتو تمام غیبی امورکا بہت زیادہ جاننے والا ہے،اے اللہ! اگرتو جانتا ہے کہ یہ معاملہ (جو مجھے درپیش ہے)،میرے دین،میرے معاش اورانجامِ کار کے اعتبار سے،اورفوری اوردیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے،تو تو اسے میرے لئے مقدرفرما۔اور(اے اللہ!)اگرتو جانتا ہے کہ یہ معاملہ

(جو مجھے درپیش ہے) میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، فوری اور دیر پا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے برا ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے اور مجھے اس سے دور کر دے، اور (اس کے بدلے میں) خیر جہاں بھی ہے، وہ میرے لئے مقدر فرما، پھر اس پر میری طبیعت کو راضی کر دے (یعنی مجھے اس کے بارے میں قلبی اطمینان اور قرار و سکون نصیب ہو جائے کہ بس یہی میرے لئے خیر ہے)، اور "ہٰذا الامر" (یعنی یہ معاملہ) کے بجائے (چاہے تو) اپنی حاجت کا نام لے کر دعا کرے (جیسے شادی، کاروبار، کسی کے ساتھ شراکت وغیرہ، الغرض جو بھی مسئلہ درپیش ہو، اس کا نام لے)، (صحیح البخاری، جلد 4 ص: 2004، رقم الحدیث: 6382 مطبوعہ المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔ اس حدیث کو امام مسلم کے سوا محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے، مثلاً امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام بیہقی وغیرھم۔

"علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ومنھا رکعتا الاستخارۃ۔

اور ان مستحب نمازوں میں دو رکعت نماز استخارہ ہے، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی الحلیۃ ویستحب افتتاح ھذا الدعاء وختمہ بالحمدلۃ والصلوۃ وفی الاذکار انہ یقرء فی الرکعۃ الاولیٰ الکافرون وفی الثانیۃ الاخلاص وعن م بعض السلف انہ یزید فی الاولی "وربک یخلق ما یشاء ویختارُ ط ما کان لھم الخیرۃ ط سبحٰن اللہ وتعلیٰ عما یشرکون o وربک یعلم ماتکن صدورھم وما یعلنون" وفی الثانیۃ وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ۔ الایہ۔ وینبغی ان یکررھا سبعا کما روی ابن السنی یاانس اذاھمت بأمر فاستخر ربک فیہ

سبع مرّات ثم انظر الی الذی سبق الیٰ قلبك فان الخیر فیه ولو تعذرت علیه الصلوٰۃ الستخارۃ بالدعاء اھ ملخصاوفی شرح الشرعۃ المسموع من المشائخ انه ینبغی ان ینام علی طھارۃ مستقبل القبلۃبعد قراءۃ الدعاء المذکورفان رایٰ فی منامه بیاضا او خضرۃ فذالك الامر خیر وان رایٰ فیه سوادا أو حمرۃ فھو شر ینبغی ان یجتنب اھ۔

اور''حلیہ''میں ہے اوراس دعاءِاستخارہ کی ابتدا اورآخر میں حمد وصلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے،اور''الاذکار''میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ''الکافرون''پڑھےاوردوسری میں سورۂ''اخلاص''اوربعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں "وربك یخلق ما یشاء ویختارُ ط ماکان لھم الخیرۃ ط سبحٰن الله وتعٰلیٰ عما یشرکون o وربك یعلم ماتکن صدورھم وما یعلنون o(القصص:69-68) تک ان کلمات کا اضافہ کرے اوردوسری رکعت میں سورۂ احزاب،آیت:36 کا اضافہ کرے۔(اوراگر درپیش مسئلہ کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل نہ ہوتو)سات دن تک مسلسل یہ نماز پڑھے،جیسا کہ ابن السُّنی نے روایت کیا ہے:(ترجمہ:)''اےانس!جب تو کسی کام کاارادہ کرے،تو اپنے رب سےاس میں سات بار رہنمائی کی دعا کرتا رہے،پھر غوروفکر کرکہ تیرے دل میں جو بات قرار پاگئی ہے(یعنی اس کام کا کرنا یا نہ کرنا)،بس خیر اسی میں ہے''،اوراگراس کے لئے نماز پڑھنادشوار ہوتو صرف دعا کرکے استخارہ کرلے،(یہ''اذکار''کی عبارت کا)خلاصہ ہے،اور''شرح الشرعۃ''میں ہے کہ(ہم نے اپنے)مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد باوضو ہوکر قبلہ روسو جائے،اگراپنی خواب میں سفید یا ہرا رنگ دیکھےتو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے،(اوراس کام کو کرلے)اوراگر کالایا سرخ رنگ دیکھے

تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے، پھر اس کام سے اجتناب کرے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد نمبر 2 صفحات 410-409 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہل خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں، لیکن اگر خواب نظر آجائے تو اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب سکون وقرار نصیب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اس کام کو کرلے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامان ہو تو یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہوگئی ہے، اور یا یہ سمجھے کہ اگر اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ (خدانخواستہ) اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیرلکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شرلکم۔

ترجمہ: "ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر) وہ (درحقیقت) تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی) ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لئے پسندیدہ سمجھو (مگر درحقیقت) وہ تمہارے لئے بری ہو، (البقرۃ: 216)"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک دعا کسی نازل شدہ مصیبت کے لئے بھی مفید ہے (کہ اگر وہ صبر وتحمل کا پیکر بن کر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس مشکل سے اسے نجات دے دے گا یا صبر وتحمل پر اسے اجر عظیم سے نوازے گا)، اور ان مصیبتوں کے لئے بھی

دعا مفید ہے، جو ابھی نازل نہیں ہوئی ہیں (یہ دعا ان کے لئے ردِ بلا کا سبب بن جائے گی) سوائے اللہ کے بندو! دعا کو اپنا لازمی شعار بناؤ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی،ص:195)۔صرف نبی کا خواب یا الہام، "حُجّتِ قطعیّہ" ہوتا ہے۔اور غیر نبی کا خواب یا الہام ایک ظنّی امر ہے، لہٰذا اگر کسی نے کسی مسئلے میں استخارہ کرلیا اور کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کیا ہو تو اس سے گنہگار نہیں ہوگا، نہ ہی اس پر کوئی وبال آئے گا۔

"استخارہ" کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگئ دل، حضوریٔ قلب، تضرُّع و عاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہوسکتی۔حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں، (الاسرار الرفوعہ، رقم الحدیث: 249، کشف الخفاء ج 1 ص: 232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج 1 ص: 78)"۔

جو شخص اپنے درپیش مسئلے میں پانچ سات بار عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا اور طلبِ خیر و دعا کے لئے ذہنی، فکری اور عملی طور پر آمادہ نہ ہو، وہ استخارے کی روح اور حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔باقی وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے احوال بتاتے ہیں کہ کسی پر کالا جادو ہوگیا ہے، سفلی عمل کردیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی امور ان پر منکشف ہوجاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ان کا حل بھی نکل آتا ہے، اس کا مجھے علم نہیں ہے، اس سے لوگ توہُّم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیرِ الٰہی پر رضا جو مومن کا شعار ہونا چاہئے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ

سجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیب

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسُّل کے بجائے، اِس روش کو ترک کر کے، اِس طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ درپیش معاملات اور مباح امور میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لئے یا کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں استخارہ کرنا افضل اور مستحب ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار ہوگا۔ اور ویسے کسی مسئلے کے بارے میں دستیاب معلومات اور قرائن وشواہد کی روشنی میں یا اہل فن واہل نظر اور اہل اللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ذہن میں یہ امر واضح ہو جائے کہ یہ کام کرلینا چاہئے، تو اللہ پر توکل کر کے کرلے، اور اللہ تعالیٰ سے اس میں کامیابی اور سرخ رو ہونے کی دعا کرتا رہے۔

قیامِ تعظیمی کا شرعی حکم

سوال: 180

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی محفل میں اگر کوئی بڑی عمر کا فرد یا بزرگ آجائے تو اپنی جگہ سے تعظیم کے طور پر اٹھنا نہیں چاہئے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی مجلس میں تشریف لاتے تھے اور محفل میں موجود لوگ (صحابہ) تعظیماً اٹھتے تھے تو نبی پاک ﷺ انہیں منع فرماتے تھے؟ (سید عابد علی، انچارج ڈی پی ڈپارٹمنٹ، روزنامہ ایکسپریس کراچی)

جواب:

اس موضوع پر گفتگو سے پہلے چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن سعد قال: سمعت أبا امامة قال: سمعت أبا سعيد الخدری رضی الله

عنه يقول : نزل أهل قريظة على حكم سعد بن معاذ، فأرسل النبي ﷺ الى سعد فأتى على حمار ، فلما دنا من المسجد قال للانصار : "قوموا الى سيّدكم ۔أو خيركم ۔ فقال: "هؤلاءِ نزلوا على حكمك "۔فقال : تقتل مقاتلتهم ، وتسبى ذراريهم ، قال: "قضيت بحكم الله ۔ ورُبّمَا قال: بحكم المَلِكِ "۔

ترجمہ:''حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو امامہ سے سنا،وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ:حضرت سعد بن معاذ کے حکم پر بنی قریظہ قلعہ سے نیچے اتر آئے تھے، پس نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کو بلوایا ، وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کے لئے دراز گوش (گدھے)پرسوار ہوکر آئے ،پس جب وہ مسجد کے قریب پہنچے تو آپ نے انصار سے فرمایا: اپنے سردار یا اپنے بہترین فرد کے لئے (احتراماً) کھڑے ہوجاؤ ۔پھر آپ نے فرمایا: یہ لوگ تمہارے فیصلے پر قلعہ سے اتر آئے ہیں (اب ان کا فیصلہ کردو) ،انہوں نے کہا: ان کے جوافراد لڑنے کے قابل ہیں، وہ قتل کردیئے جائیں اوران کے اہل وعیال کوقیدی بنالیا جائے ۔آپ نے فرمایا: تم نے حکمِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور کبھی آپ یہ فرماتے کہ یہ ایک بادشاہ (یاسردار) کے فیصلے کے مطابق ہے،(صحیح بخاری رقم الحدیث:4122،صحیح مسلم،رقم الحدیث:4515)''۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن عائشة أم المؤمنين قالت: مارأيت احدا أشبه سمتاً و دلّاً وهديا برسول الله في قيامها وقعودها من فاطمة بنت رسول الله ﷺ۔قالت و كانت :اذا دخلت على النبى ﷺقام اليها فقبّلهاو أجلسها فى مجلسه ، و كان النبى

ﷺ اذا دخل علیها قامت من مجلسها فقبّله وأجلسته فی مجلسها(الحدیث)۔

ترجمہ:''ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کی عاداتِ مبارکہ کے مشابہ نہیں دیکھا۔ جب حضرت فاطمہ نبی ﷺ کے پاس جاتیں، تو آپ ان کے لئے (ازراہِ شفقت) کھڑے ہو جاتے، پھر ان کو بوسہ دیتے اور انہیں اپنی جگہ بٹھاتے ،اور جب نبی ﷺ حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ (احتراماً) اپنی نشست سے کھڑی ہو جاتیں ، پھر آپ کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتیں ،(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 3872، سنن ابو

داؤد، رقم الحدیث : 5175)''،اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے(الادب المفرد،ص: 204)۔

امام بخاری نے ''قیام الرجل لاخیہ'' کا باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت حضرت سعد والی حدیث کے علاوہ مندرجہ ذیل حدیث بیان کی ہے:

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ عبد اللہ بن کعب کی روایت سے غزوۂ تبوک میں کعب بن مالک کی توبہ کی قبولیت کی تفصیلی حدیث بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: واذن رسول اللہ ﷺ بتوبة اللہ علینا حین صلیٰ صلاۃ الفجر فتلقانی الناس فوجاً فوجاً یھنونی بالتوبة یقولون لتھنك توبة اللہ علیك حتی دخلت المسجد فاذا برسول اللہ ﷺ حوله الناس فقام الیّ طلحة بن عبیداللہ یھرول حتی صافحنی وھنانی ۔

ترجمہ:''اور جب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی تو ہماری توبہ کی قبولیت کا

اعلان کیا تو پھر صحابہ مجھے (قبولیتِ) توبہ پر فوج در فوج مبارک باد دینے لگے، وہ کہتے تھے اللہ کی بارگاہ میں تمہیں توبہ کی قبولیت مبارک ہو، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو (منظر کچھ یوں تھا کہ) رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے گرد صحابۂ کرام موجود تھے، اِس موقع پر طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہوئے، دوڑ کر آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:4418، الادب المفرد ،ص:243)"۔

امام بیہقی لکھتے ہیں:

عن ابی هريرة قال: كان رسول الله ﷺ فی المسجد يحدثنا فاذا قام قمنا قياماً حتی نراه وقد دخل بعض بيوت ازواجه۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہم سے گفتگو فرمارہے تھے، پھر جب آپ کھڑے ہوئے تو ہم بھی (احتراماً) کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ آپ اپنی ایک زوجۂ مطہرہ کے گھر میں داخل ہوگئے، (المدخل الی السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث:717، مکتبہ دار الخلفاء، کویت)"۔

قیامِ تعظیمی کے بارے میں اور بھی روایات ہیں، ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تعظیماً واحتراماً بزرگوں اور بڑوں کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اور صحابۂ کرام سے خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے لئے قیامِ تعظیمی ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ خود حضرتِ سعد کے لئے احتراماً صحابۂ کرام کو کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ ہمارے ہاں قومی ترانے کے موقع پر سب کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ بھی احترام کی ایک صورت ہے اور مسلمہ بین الاقوامی اقدار میں سے ہے اور کسی مکتبۂ فکر کے کسی عالم نے اسے شرک وبدعت قرار

نہیں دیا۔قومی سیرت کانفرنس کے موقع پر جب صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم تشریف لاتے ہیں تو ہال میں موجود تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔حال ہی میں سعودی عرب کے نائب وزیرِ مذہبی امور کراچی کے ایک مقامی ہوٹل میں ایک دعوت میں تشریف لائے تو دیوبندی و اہلحدیث مکاتبِ فکر کے تمام علماء نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور مصافحہ و معانقہ کیا۔

بعض روایات میں قیامِ تعظیمی سے منع فرمایا گیا ہے، لیکن یہ ممانعت علی الاطلاق نہیں ہے، ان کا محمل اور مصداق جدا ہے۔ذیل میں ہم ان احادیث کو ذکر کر کے ان کے محامل بیان کریں گے۔

امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں:عن ابی امامة قال: خرج علینا رسول الله ﷺ متوکئاً علیٰ عصیً، فقمنا الیه فقال: لاتقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضھا بعضاً۔

ترجمہ:ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے، ہم آپ کے لئے کھڑے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا:عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہو، جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں ،(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث:5187)"۔

یہ حدیث اس درجے کی نہیں ہے، جو ہم نے قیامِ تعظیمی کے جائز و مستحب ہونے کے بارے میں ذکر کی ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ سے قیام کا حکم ثابت ہے، خود آپ کا بھی قیام فرمانا ثابت ہے اور حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابۂ کرام کا آپ کے لئے قیام ثابت ہے، جس میں آپ نے اس قیامِ تعظیمی پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، نہ کسی ناگواری کا اظہار فرمایا۔قیامِ تعظیمی کی ممانعت کی یہ حدیث ضعیف ہے، اس کی سند

میں اضطراب ہے، اس کے راوی مجہول ہیں اور اس میں اُس قیام کی ممانعت ہے جو عجمیوں کی طرح ہو، جس میں ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا رہتا ہے اور باقی ہاتھ باندھے تعظیماً کھڑے رہتے ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں: عن جابر قال: اشتکی النبی ﷺ فصلینا وراءہ وھو قاعد وابو بکر یسمع الناس تکبیرہ، فالتفت علینا فرانا قیاماً فاشار الینا فصلینا بصلاتہ قعوداً فلما سلم قال ان کدتم لتفعلوا فعل فارس والروم یقومون علی ملوکھم وھو قعودھم فلا تفعلوا۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ بیمار ہو گئے، آپ نے بیٹھ کر ہمیں نماز پڑھائی، حضرت ابو بکر آپ کے مکبّر کے فرائض انجام دے رہے تھے (دورانِ نماز) آپ ہماری جانب متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ہم سب (آپ کی اقتدا میں) کھڑے ہو کر پڑھ رہے ہیں، آپ نے ہمیں (بیٹھنے کا) اشارہ فرمایا، پھر ہم بیٹھ گئے، پھر ہم نے بیٹھ کر آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی، پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا: مجھے خدشہ ہے کہ تم اہلِ روم اور فارس کی طرح کام کرنے لگو گے کہ ان کے بادشاہ بیٹھے رہتے ہیں اور وہ ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں، پس تم ایسا نہ کرو، (الادب المفرد، ص: 144)''۔

ابتدا میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت تھی، یہ حدیث اسی سے متعلق ہے، بعد میں بلاعذر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت منسوخ ہوگئی۔

قرآن وسنت سے کسی حکم کے اثبات کا عادلانہ طریقہ یہ ہے کہ اس حکم سے متعلق تمام آیات واحادیث کو پیشِ نظر رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے، ایک ہی مسئلے کے بارے میں ثبوت وممانعت کے احکام میں اگر ممکن ہے تو تطبیق کی جائے، مواضع ثبوت کو الگ

واضح کیا جائے اور مواضع منع کو الگ واضح کیا جائے، دونوں کی توجیہ اور محمل بیان کیا جائے یا اگر ایک منسوخ ہے اور دوسرا ناسخ تو دلائل سے واضح کیا جائے۔

ہماری رائے میں قیامِ تعظیمی کے جواز واستحباب اور ممانعت کی حدیثوں کو ہم یکجا کر کے دیکھتے ہیں تو مندرجہ ذیل قیامِ تعظیمی کی صورتیں جائز ہیں:

(1) مشائخ، اساتذہ، علمائے دین، والدین اور محسن ومربی کی تعظیم کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(2) کوئی شخص فی نفسہٖ تو قیامِ تعظیمی کے لائق نہیں ہے، لیکن کسی دینی مصلحت کے تحت بطور مدارات اس کے لئے قیام کرنا جائز ہے۔

(3) محض دنیوی مفاد کی خاطر بطور مداہنت وخوشامد کسی شخص کے لئے قیام تعظیمی مکروہ تحریمی ہے۔

(4) جو شخص سفر سے واپس آئے، اس کے استقبال کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(5) کسی شخص کو کوئی نعمت ملی ہو اس کو مبارک باد دینے کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(6) کسی شخص کو کوئی مصیبت پہنچی ہو تو اس کی تعزیت کے لئے قیام کرنا بھی مستحب ہے۔

(7) عہد رسالت کے عجمیوں کے طریق پر قیام کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہو اور دوسرے مستقل ہاتھ باندھے کھڑے ہوں، ایسا قیام مکروہِ تحریمی ہے، کیونکہ یہ اکرامِ انسانیت کے منافی ہے۔

(8) جو شخص بطورِ تکبر اپنے لئے قیام کرائے یا اس کے تکبر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے قیام کرنا مکروہ ہے۔

(9) اگر کوئی مجلسِ ذکر یا درس وتدریس جاری ہو تو کسی آنے والے بزرگ کے لئے

اسے معطل نہیں کرنا چاہیے اور ایسے موقع پر قیام فی نفسہٖ اپنے جواز کے باوجود مناسب نہیں ہے۔
ان میں سے بعض اقسام کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے قاضی ابو الولید ابن الرشد مالکی کے حوالے سے بیان کیا ہے اور بعض اقسام کو علامہ بدر الدین عینی حنفی نے بیان کیا ہے اور ان تمام صورتوں کو علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد: خامس میں یکجا کیا ہے۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نیاز کا مفہوم اور جواز

سوال: 181

نیاز کا مطلب اور مفہوم سمجھائیں اور کیا نیاز کا کرنا جائز ہے؟،(کامران، کراچی)۔

جواب:

سب سے پہلے معروف اردو لغات کے حوالے سے لفظ نیاز کے معنی ملاحظہ کیجئے:
نیاز: تبرُّک، تحفۂ درویشاں، نذر بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فیروز اللغات) آرزو، غنا، میل، خواہش، اظہارِ محبت، عاجزی، مسکینی، انکسار، تحفۂ درویش، تبرُّک، درود فاتحہ، بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فرہنگ آصفیہ جلد 4)
آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لغت میں نیاز کے متعدد معانی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ: "بھینٹ چڑھاوا" (یعنی وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کے تقرُّب، رضا اور بندگی کے علاوہ کسی اور کے تقرُّب کے لئے کیا جائے، خواہ مالی صدقہ ہو یا قربانی) اس معنی میں اس کا استعمال غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے، ہمارے ہاں عرف میں "نیاز" جن معانی میں استعمال ہوتا ہے، وہ یہ ہیں: تبرُّک، درود فاتحہ وغیرہ مثلاً کہا جاتا ہے کہ: "یہ گیارہویں شریف کی نیاز ہے"، یعنی شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے

ایصالِ ثواب اور فاتحہ کا کھانا ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرُّک بھی کہہ دیتے ہیں، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، علم معانی کا مُسلَّمہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ''ذو معنی'' کلمہ ہے، تو اس کے معنی کا تعین قائل کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً کافر کہے کہ: ''انبت الربیع البقل ''موسم بہار نے سبزہ اگایا، یہ کلمہ اگر کافر کہے تو کلمۂ کفریہ ہوگا، اور اگر یہی کلمہ مومن کہے تو کلمۂ توحید ہوگا، کیونکہ مومن کا ایمان اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت میں اگانے والا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو مانتا ہے،

بارش اور بہار کو سبب مانتا ہے، اس کو اسنادِ مجازی کہتے ہیں، جو روزمرہ گفتگو میں ہم استعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے فلاں دوا سے شفا ملی، حالانکہ اس کا ایمان ہے کہ دوا وسیلۂ شفا ہے، اصل شفا دینے والا اللہ ہے۔

رجب کے کونڈے اور ''تبارک'' کی روٹیاں

سوال: 182

(1) ہمارے ہاں بعض لوگ رجب کی بائیس تاریخ کو ''کونڈے'' (جو ایک خاص قسم کی سوجی، میدے اور دودھ کی میٹھی ٹکیہ ہوتی ہے) پکاتے ہیں، یہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نام پر نیاز ہوتی ہے، ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ رات کو پکائے جاتے تھے اور ایک خاص جگہ بٹھا کر کھلائے جاتے تھے، انہیں باہر نہیں نکالا جاتا تھا، بعض جگہ اس موقع پر ''عجیب داستان'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی پڑھا جاتا تھا، جس میں لکڑہارے کی منظوم داستان ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ بعض لوگ اسے ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔

(2) رجب ہی کے مہینے میں بعض لوگ میٹھی روٹیاں پکا کر بانٹتے ہیں، انہیں ''تبارک'' کی روٹیاں کہا جاتا ہے، غالباً ان پر سورۂ ''تبارک الذی'' (سورۃ الملک) پڑھ کر

ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟،(محمد شمیم خاں،عزیز آباد،کراچی)۔

جواب:

22 رجب نہ امام جعفر صادق کی تاریخ پیدائش ہے اور نہ تاریخ وصال،ان کی ولادت کے بارے میں دو اقوال ہیں:(1)مشہور قول یہ ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت 17 ربیع الاوّل 80ھ (2)ماہِ رجب،لیکن تاریخ مذکور نہیں ہے۔اسی طرح وصال کے بارے میں بھی دو قول ہیں:زیادہ معروف ماہِ شوال 148ھ ہے اور ایک قول رجب کا بھی ہے،(جلاء العیون،ملا باقر مجلسی،ج:2،ص:693)۔لہٰذا22 رجب کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کوئی خاص نسبت نہیں ہے،البتہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وصال 22 رجب 60ھ ہے۔جہاں تک ایصالِ ثواب کا تعلق ہے،یہ فی نفسہٖ مشروع ہے،مستحسن امر ہے،قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور ایصالِ ثواب کے لئے خاص قسم کی ٹکیاں یا روٹیاں پکانا لازمی نہیں ہے،میٹھی ٹکیاں یا روٹیاں بھی ایصالِ ثواب کی نیت سے بانٹی جاسکتی ہیں یا فقراء کو کھلائی جاسکتی ہیں اور کوئی دوسری صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے،البتہ یہ شرط،کہ خاص جگہ پر ہی بٹھا کر کھلایا جائے،فاسد ہے۔"عجیب داستان" کے نام سے جو کتاب پڑھی جاتی ہے،اس کی بھی کوئی اصل نہیں ہے،ہاں،اگر کوئی چیز اپنی اصل کے اعتبار سے خلافِ شرع ہے،تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ختم کردیا،حدیث پاک میں ہے:عن انس قدم النبی ﷺ المدینۃ ولھم یومان یلعبون فیھما،فقال ماھذا ن الیومان؟،قالوا کنا نلعب فیھما فی الجاھلیۃ فقال رسول اللہ ﷺ قد ابدلکم اللہ بھما خیرا منھما یوم الاضحی ویوم الفطر۔

ترجمہ: ''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو (آپ نے دیکھا کہ) اہلِ مدینہ سال میں دو دن کھیل تماشے کیا کرتے تھے، آپ نے ان سے پوچھا: یہ کیسے دو دن ہیں؟، انہوں نے جواباً عرض کیا: ہم زمانہ جاہلیت میں ان دنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان دو دنوں کے بدلے میں تمہیں دو بہتر دن عطا فرمائے ہیں، اور وہ ہیں، عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن، (مشکوٰۃ بحوالہ: سنن ابی داود)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سالانہ میلے ٹھیلے کے دو دنوں کو منع فر دیا اور فرمایا کہ ان کے عوض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عیدین کے مبارک دن عطا فرمائے ہیں۔

اس کے برعکس ایک حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انَّ رسول اللہ قَدِمَ المدینۃ، فوجد الیھودَ صیاماً یومَ عاشورآء، فقال لھم رسول اللہ ﷺ: ماھذا الیوم الذی تصومونَہُ؟، فقالوا: ھذا یومٌ عظیمٌ اَنّجی اللہ موسیٰ وقومَہُ وغَرَقَ فرعونَ وقومَہُ، فصامَہُ موسیٰ شکراً، فنحن نَصُومہُ فقال رسول اللہ ﷺ فنحن اَحَقُّ واَولیٰ بموسیٰ منکم، فصامَہُ رسولُ اللہ ﷺ وامَرَ بصیامہٖ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟، تو انہوں نے جواب دیا: یہ وہ عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم (بنی اسرائیل) کو (فرعونیوں سے) نجات دی، اور فرعون اور اس کی قوم کو (سمندر میں) غرق کر دیا، تو انہوں نے (اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے) شکر کے

طور پر عاشورہ کا روزہ رکھا، تو (ان کی اتباع میں) ہم بھی (اس دن کا) روزہ رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم تمہارے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام (کی سنت کی اتباع) کے زیادہ حق دار ہیں اور ہم تمہاری بہ نسبت ان سے زیادہ قربت رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے خود بھی یومِ عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابۂ کرام کو بھی اس کا حکم فرمایا، (صحیحین بحوالہ: مشکوۃ)۔ ایک اور حدیث مبارک ہے:

عن ابن عباس قال حِینَ صامَ رَسولُ اللّٰہ ﷺ عاشوراءَ وَاَمَرَ بصیامہ قالوا یارسول اللّٰہ: اِنَّہٗ یومٌ یُعَظِّمُہٗ الیہودُ والنصاریٰ فقال رسول اللّٰہ ﷺ لَئِن بَقِیْتُ اِلی قابِلٍ لَاَصُومَنَّ التاسعَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس ہی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور اسے رکھنے کا حکم دیا تو (صحابۂ کرام نے) عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم: یہ ایک ایسا دن ہے جس کی یہود ونصاریٰ تعظیم کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال حیات رہا تو ضرور (یومِ عاشورہ کے ساتھ) 9 محرم کو بھی روزہ رکھوں گا، (صحیح مسلم)۔ اس کی رو سے علماء فرماتے ہیں کہ دو دن کا نفلی روزہ رکھنا افضل ہے یعنی 9، 10 محرم الحرام یا 10، 11 محرم الحرام۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ فی نفسہٖ شرعاً یومِ عاشورہ کی تقدیس ثابت ہے اور نفلی روزہ بھی اپنی اصل کے اعتبار سے مستحسن ہے، اس لئے آپ نے اسے برقرار رکھا اور محض یہود ونصاریٰ سے مشابہت کی بنا پر اصلاً مشروع امر کو منع نہیں فرمایا، بلکہ ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے عاشورہ کے ساتھ ساتھ 9 محرم کے روزے کو بھی شامل فرمالیا۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''رجب میں حضرت امام جعفر صادق کو

ایصالِ ثواب کے لئے پوریوں کے کونڈے بھرے جاتے ہیں، یہ جائز ہیں، اس میں جگہ کی پابندی اور نیاز کو تقسیم نہ کرنے کی پابندی بے جا ہے۔ اس موقع پر ایک کتاب "عجیب داستان" کے نام سے پڑھی جاتی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ نہ پڑھی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کرنا جائز ہے"۔(بہارِ شریعت، حصہ شانز دہم ،ص:230، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی)۔

مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"ماہِ رجب میں امام جعفر صادق کو ایصالِ ثواب کے لئے کھیر پوری پکا کر کونڈے بھرے جاتے ہیں اور فاتحہ دلا کر لوگوں کو کھلاتے ہیں، یہ جائز ہے۔ اس میں ایک بات بڑی غلط رواج پا گئی ہے کہ جہاں کونڈے بھرے جاتے ہیں، وہیں کھائے جاتے ہیں ،یہ ایک غلط حرکت ہے اور یہ غیر شرعی اور جاہلانہ رسم ہے۔ اور یہ ایک کتاب "عجیب داستان" پڑھی جاتی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ نہ پڑھی اور نہ ہی سنی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کریں۔ اللہ کے نیک بندوں کی کرامات برحق ہیں، (سنی بہشتی زیور، حصہ سوم، ص:318)"۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے کونڈوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا: "اہلسنت کے نزدیک جیسے ہر فاتحہ جائز ہے، اسی طرح کونڈوں کی فاتحہ بھی جائز ہے، لکڑہارے کی کہانی من گھڑت ہے۔ کھانے کی ہر چیز کے متعلق ادب سکھایا گیا ہے۔ حدیث میں فرمایا: "دستر خوان پر جو گر جائے اسے اٹھا کر کھا لو"۔ فاتحہ کے کھانے پر قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لئے مسلمان اس کا زیادہ ادب کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں نے یہ شرط لگالی کہ وہیں بیٹھ کر کھالیں، باہر نہ لے جائیں اس شرط کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں، وہاں بھی کھا سکتے ہیں اور باہر بھی

لے جا سکتے ہیں،(وقار الفتاوئ،جلد:اوّل،ص:202،بزم وقار الدین،کراچی)‘‘۔

جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا، 22 رجب المرجب 60ھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات ہے ،(دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ کے معاندین اور ان سے بغض رکھنے والوں نے ان کی وفات پر (معاذاللہ) خوشی منانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا اور چونکہ وہ بنی امیہ کے اقتدار کا دور تھا، اس لئے اسے پوشیدہ رکھنے کے لئے گھر کے کسی خاص کوشے میں کھلایا جاتا تھا، لیکن ہمیں اس کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملا۔اسی طرح ’’تبارک الذی‘‘یعنی سورۃ الملک میٹھی روٹیوں پر پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا شرعاً درست ہے،بشرطیکہ اپنی طرف سے کوئی خلافِ شرع امر اس میں شامل نہ کر دیا گیا ہو،کیونکہ ایصالِ ثواب فی نفسہٖ ایک مشروع اور مستحسن امر ہے،خواہ کسی خاص بزرگ کو ایصالِ ثواب کیا جائے یا تمام مومنین ومومنات کی ارواح کو،بہرصورت درست ہے۔

قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا

سوال: 183

قرآن مجید میں قیامت کے دن حساب وکتاب اور سوال وجواب کے موقع پر جزاوسزا کا فیصلہ کرنے انسان کے اعمال کے وزن کئے جانے کا ذکر ہے ،سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادّہ وزن رکھتا ہے،وزن مادّی اشیاء اور جسمانی اشیاء کا ہوتا ہے ،اعمال تو غیر مادی ہیں،اگر ان کا وزن ہونا ہے تو کس طرح ہوگا،اور اگر نہیں ہوتا تو پھر قرآنی آیات واحادیث کا کیا جواب اور کیا توجیہہ ہوسکتی ہے، جو نقل وروایت کے بھی مطابق ہو اور عقل سلیم کے لئے بھی قابل قبول ہو،(حارث محبوب،بٹگرام)۔

جواب :

یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اسی بات کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَـئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يِظْلِمُونَ۔

(1)ترجمہ: ''اور آج (قیامت) کے دن (اعمال کا)وزن برحق ہے، سو جس کے (نیکیوں کا)پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہوں گے o اور جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنے والے ہیں، اس سبب کہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے، (الاعراف:9-8)''۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً أُولَـئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً۔

(2)ترجمہ: ''(اے رسول!) کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتادوں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہیں گے o یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں رائیگاں گئی، حالانکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں o یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے روبرو (جوابدہی کے لئے) پیش ہونے کا انکار کیا تو ان کے سب اعمال اکارت گئے، پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے، (الکھف:105-103)''۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئاً وَإِن كَانَ مِثْقَالَ

WWW.NAFSEISLAM.COM

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَ كَفَى بِنَا حَاسِبِيْنَ۔

(3)ترجمہ:''اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو رکھیں گے تو کسی شخص پر ظلم مطلقاً نہیں ہوگا،اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا تو ہم اس کو (حساب کے لئے) لے آئیں گے،اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں،(الانبیاء: 47)''۔

فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔

(4)ترجمہ:''تو جس کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے،وہ پسندیدہ زندگی میں رہیں گے o اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا ''ھاویہ'' ہو گا،(القارعہ:6-9)''۔

چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

سمعت عبداللہ بن عمرو ان العاص یقول: قال رسول اللہ ﷺ: ((ان اللہ سیخلص رجلا من امتی علی رء وس الخلائق یوم القیامۃ فینشر علیہ تسعۃ وتسعین سجلا کل سجل مثل مدالبصر، ثم یقول: اتنکر من ھذا شیئا؟ اظلمک کتبتی الحافظون؟فیقول: لا یارب فیقول: افلک عذر؟فیقول: لا یارب فیقول: بلیٰ ان لک عندنا حسنۃ فانہ لا ظلم علیک الیوم، فتخرج بطاقۃ فیھا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ فیقول: احضر وزنک، فیقول: یا ربّ ماھذہ البطاقۃ مع ھذہ السجلات؟ فقال: انک لا تظلم،قال: فتوضع السجلات فی کفّۃ والبطاقۃ فی کفّۃ فطاشت السجلات وثقلت البطاقۃ فلا یثقل مع اسم اللہ شئی))۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک شخص کو قیامت کے دن برسر عام پیش فرمائے گا، اس کے (اعمال کے) 99 رجسٹر اس کے سامنے پھیلا دیئے جائیں گے، ان میں سے ہر رجسٹر حد نظر تک (پھیلا ہوا) ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم ان (اعمال) میں سے کسی بات کا انکار کرتے ہو؟، کیا اعمال لکھنے والے میرے محافظ فرشتوں نے تم پر ظلم کیا ہے؟، تو وہ عرض کرے گا، اے پروردگار! کوئی ظلم نہیں کیا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے پاس کوئی عذر ہے؟، وہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! کوئی عذر نہیں، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: کیوں نہیں، ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی (کی امانت) ہے، کیوں کہ تم پر آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، پھر ایک چٹ (Slip) نکالی جائے گی، اس میں (کلمۂ شہادت کے یہ الفاظ لکھے ہوں گے) اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: اپنے (اعمال کے) وزن کو دیکھو، وہ عرض کرے گا: اے پروردگار! کہاں اتنے (بڑے سائز کے 99) رجسٹر اور کہاں یہ ایک پرچی (Slip)، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: (ترازو کے) ایک پلڑے میں (وہ سب) رجسٹر رکھے جائیں گے اور ایک پلڑے میں (کلمۂ شہادت کی) پرچی، (سارے کے سارے) رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور یہ ایک پرچی بھاری ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ کے نام سے زیادہ وزنی تو کوئی چیز نہیں ہوسکتی، (سنن الترمذی، ج:3، رقم الحدیث: 2639)''۔

(2) ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، تمام

آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے، اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے، اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمۂ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو، تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہو گا، (المعجم الکبیر، ج: 12، ص: 254، رقم الحدیث: 13024، دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

ان آیات و احادیث مبارکہ اور دیگر متعدد روایات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اچھے اور برے اعمال کا وزن ہو گا، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گا اور بدکار بندوں کے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ: آج (قیامت) کے دن (اعمال کا) وزن (کیا جانا) حق ہے، (الاعراف:9)"۔

اب رہا یہ سوال کہ اعمال کا وزن کیسے ہو گا، وزن تو ان چیزوں کا ہوتا ہے جو مادّی وجود رکھتی ہیں، جسم رکھتی ہیں، اعمال تو اعراض ہیں (عرض اسے کہتے ہیں، جس کا اپنا مستقل بالذات وجود نہ ہو، جس کا وجود کسی دوسرے کے ساتھ قائم ہو)، یہ اپنا جسمانی وجود نہیں رکھتے، تو ان کا وزن کس طرح ہو گا۔

اس سوال کے جواب میں چند گذارشات پیش خدمت ہیں:

(1) جب اللہ جل شانہ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہو گا، تو اس پر ہمارا ایمان کامل ہونا چاہئے، اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری فہم و دانش کی سعادت ہے اور اگر اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل کی نارسائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد حق اور سچ ہے۔

بہت سی مادّی اشیا ایسی ہیں، جن کے ماپنے کے آلات یا علم انسان کے پاس نہیں تھا

مگر سائنسی علوم کی ترقی کے ساتھ انسان ان کی پیائش یا طاقت کا معیار و مقدار مقرر کرنے پر قادر ہو گیا اور اس نے ان کے لئے پیائش Measurement، وزن (Weighing) یا قوت (Power)، دباو (pressure) یا دھکیلنے کی صلاحیت (Thrust) کا اندازہ کرنے کے لئے آلات اور پیانے وضع کر لئے۔

مثلاً ہوا کے دباؤ (Pressure) ماپنے کے آلے کو (Barometer) کہتے ہیں، زلزلے سے زمین میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے ریکٹر اسکیل (Rector Scale) ایجاد ہوا، اس کی پیائش کے آلے اور ایٹم بم کے اندر جو دھماکے کی قوت ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے (Seismo meter) ایجاد ہوا، برقی رو (Current) کی مقدار اور طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے مخصوص اکائی (volt) اور کلوواٹ (Kilowatt) اور میگاواٹ (Megawatt) کے پیانے ایجاد ہوئے۔ روشنی کی استعداد کا اندازہ لگانے کا آلہ Light meter یا Exposure meter، اسی طرح پانی کے دباؤ کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Telemeter)

آلات اور پیانے ایجاد ہوئے، اسی طاقت سے ڈیموں اور آبشاروں (Water sheds) سے جو بجلی پیدا کی جاتی ہے، اسے Hydroelectric Power کہتے ہیں۔ مائع کی کثافت (Density) یا ثقل (Gravity) کا اندازہ لگانے کے لئے Hydrometre ایجاد ہوا۔ اعصاب یا پٹھوں (Muscle) کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Ergometer) ایجاد ہوا۔

الغرض بہت سے ایسی مادی اشیاء وموجودات تھیں، جن کا یا تو انسان کو علم نہیں تھا، اور اگر علم تھا تو ان کی پیائش، مقدار، اور قوت کا اندازہ لگانے کے لئے آلات، پیانے اور

اوزان نہیں تھے ،انسان کے علم نے ترقی کی اوران اشیاء کے قطعی تخمینے لگانے کی استعداد حاصل کرلی۔

جب انسانی دماغ اتنی ترقی کرسکتا ہے تو اس سے انسانی دماغ کے پیدا کرنے والا خالق ومالک کے علم کی لامحدودیت اورمحیطِ کل ہونے کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، وہ معقولات (racts Abst)یعنی محض معنوی اشیاءاور مجردات یعنی غیر ماڈی اشیاء (Immaterial) کووزن کرنے یا ان کااندازہ لگانے کے لئے معیار یا پیمانہ مقرر فرمادے۔

(2) ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ان اعمال کو کوئی جسمانی صورت عطافرمادے اوران کا وزن ہو،اعمال خیر کوخوبصورت اجسام میں متشکل کردیا جائے اوراعمال شر کو قبیح اجسام کی صورت میں متشکل فرمادےاوران کا وزن کیا جائے۔

(3) بعض احادیث وروایات میں ہے کہ ان صحیفوں کا وزن ہوگا،جن میں اعمال لکھے ہوئے ہوں گے ،یعنی تحریری ریکارڈ کا وزن ہوگا،جسے حدیث مبارک میں "سِجِلّ" سے تعبیر فرمایا گیا ہے،حالانکہ اس پر بھی عقلی خدشہ وارد ہوسکتا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کے گناہوں کے رجسٹر بہت زیادہ ہوں تو وہ بھاری ثابت ہو جائیں،لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ ان کا وزن ضخامت کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ مندرجات (Written Material) کی کیفیت وماھیت کے اعتبار سے ہو۔

ایصالِ ثواب کا کھانا اور صدقۂ جاریہ

ہمیں چند سوالات مختلف موضوعات پر عبدالکریم حاجی انور سالویز لمبے،ملاوی ، ساؤتھ افریقہ کی جانب سے موصول ہوئے ہم انہیں قارئین کی سہولت کی خاطر ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔

سوال: 184

ہمارے ٹاؤن (افریقہ،ملاوی) کے عوام سال میں دو یا تین مرتبہ نیاز کا کھانا پکاتے ہیں،اس میں بہت سارے پیسے خرچ ہوتے ہیں،اور کھانے والے لوگ تقریباً پیسے والے ہوتے ہیں، نیاز کا کھانا کھانے کے صحیح حقدار کون ہیں،ہم مالدار لوگ کھا سکتے ہیں یا نہیں؟اور یہ پیسے مرحوم کے ثواب جاریہ کے لئے دوسرے دینی کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟بہتر اور افضل طریقہ ارشاد فرمائیں۔

جواب:

''ایصال ثواب'' کے معنی، کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا،خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو،یہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔

(1) ترجمہ:''حضرت موسیٰ نے التجا کی :اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے،(الاعراف:151)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔

(2) ترجمہ:''(حضرت ابراہیم نے دعا کی)اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری،میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا،(ابراہیم: 41)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔

(3) ترجمہ:''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی

مغفرت)فرما، جوہم سے پہلے وفات پا چکے، (الحشر: 10)"۔

رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِناً وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

(4) ترجمہ:"(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح:28)"۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں: ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئیں اور وہ اپنی والدہ کی وفات کے وقت موجود نہیں تھے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول صلی اللہ علیک وسلم! میری والدہ کا میری عدم موجودگی میں انتقال ہوگیا، (اب) اگر میں ان کی طرف سے کوئی صدقہ کروں تو آیا انہیں فائدہ پہنچے گا؟، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: ہاں، (حضرت سعد نے) عرض کیا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کردیا، (صحیح بخاری، ج:1، ص 186 مطبع اصح المطابع، کراچی)"۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعاءِ مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوت، اذکار، درود پاک وغیرہ، اسی طرح کھانے کا وہ اہتمام ہے، جس کا اَعراس کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

سوم، چہلم یا اَعراس کے مواقع پر اجتماعی قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا ہے، بعض مقامات پر محافلِ وعظ ہوتی ہیں اور کھانے کا بھی اہتمام ہوتا ہے، بہ ظاہر کھانے کا یہ اہتمام نفلی صدقہ ہے، تبرُّع ہے، اور نفلی صدقہ کے طور پر جو کھانا تیار کیا جائے، اس کا کھانا اصولی طور پر امراء اور فقراء سب کے لئے جائز ہے۔

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لئے اَعراس کے مواقع پر جو کھانا تیار رہوتا

ہے، اسے ان بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے "تبرک" کہا جاتا ہے، یہ بھی نفلی صدقہ ہے اور امراء اور فقراء دونوں اسے کھا سکتے ہیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: "سوم کے چنوں، بتاشوں کا لینا کیسا ہے؟" آپ نے جواب دیا: "اور سوم کے چنے بتاشے بغرض مہمانی نہیں منگائے جاتے بلکہ ثواب پہنچانے کے قصد سے ہوتے ہیں، یہ اس حکم میں داخل نہیں، نہ میرے اس فتوے میں ان کی نسبت کچھ ذکر ہے، یہ الگ مالک نے محتاجوں کے دینے کے لئے منگائے اور یہی اس کی نیت ہے تو غنی کو ان کا لینا بھی ناجائز، اور اگر اس نے حاضرین کے لئے منگائے تو اگر غنی بھی لے لے گا تو گنہگار نہ ہوگا، اور یہاں بحکم عرف ورواج عام حکم یہی ہے کہ وہ خاص مساکین کے لئے نہیں ہوتے تو غنی کا بھی لینا ناجائز نہیں، اگرچہ احتراز زیادہ پسندیدہ ہے، اور اسی پر ہمیشہ سے اس فقیر کا عمل ہے"۔

اسی طرح ان سے پوچھا گیا: جو کھانا بہ نیت خاص برائے ایصالِ ثواب خواہ بزرگانِ دین سے ہوں یا عام مسلمان، پکوایا جائے تو اس کھانے کو اغنیا کھا سکتے ہیں؟۔آپ نے جواب دیا: "اغنیا بھی کھا سکتے ہیں، سوائے اس کھانے کے جو موت میں بطور دعوت کیا جائے، وہ ممنوع و بدعت ہے"۔

اسی طرح امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا:

جو طعام بہ نیتِ ایصالِ ثواب بروح بزرگان تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو اغنیا بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟، عام اَمواتِ مومنین کے لئے جو کھانا وغیرہ دیا جاتا ہے، اس میں اور اس طعام میں جو انبیاءِ عظام اور اولیاءِ کرام کی ارواح کے لئے ہدیہ کیا جاتا ہے، کچھ ذاتی فرق ہے یا نہیں؟، برکت وعدمِ برکت کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں مصرف ایک

ہوگا، یعنی صرف فقراء کو دینا یا اغنیاء کے لئے بھی کھانا جائز ہوگا۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''طعام تین قسم ہے: ایک وہ کہ وہ عوام ایامِ موت میں بطورِ دعوت کرتے ہیں، یہ ناجائز و ممنوع ہے، اغنیا کو اس کا کھانا جائز نہیں۔ دوسرے وہ طعام کہ اپنے اموات کو ایصالِ ثواب کے لئے بہ نیت تصدُّق کیا جاتا ہے، فقراء اس کے لئے اَحَق (زیادہ حق دار) ہیں، اغنیا کو نہ کھانا چاہئے۔ تیسرے وہ طعام کہ نذورِ ارواحِ طیبہ حضرات انبیاء و اولیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء کیا جاتا ہے اور فقراء و اغنیاء سب کو بطورِ تبرُّک دیا جاتا ہے، یہ سب کو بلا تکلف روا ہے اور وہ ضرور باعث برکت ہے، برکت والوں کی طرف جو چیز نسبت کی

جاتی ہے، اس میں برکت آجاتی ہے، مسلمان اس کھانے کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اس میں مُصیب ہیں''۔

اسی طرح آپ نے سوم کے چنوں کے بارے میں فرمایا: ''یہ چنے فقراء ہی کھائیں، غنی کو نہ چاہئے، بچہ یا بڑا، غنی بچوں کو ان کے والدین منع کریں''۔

گیارہویں شریف کے بارے میں سائل کے جواب میں آپ نے لکھا:

''گیارہویں شریف اپنے مرتبۂ فردیت میں مستحب ہے، اور مرتبۂ اِطلاق میں کہ ایصالِ ثواب ہے، سنت، اور سنت سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ اور یہ سنتِ قولیہ مستحبہ ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:9، صفحات: 605، 609، 610، 612، 614، 615، 672، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ: اپنی اصل کے اعتبار سے ایصالِ ثواب کی مشروعیت قرآن و سنت سے ثابت ہے، یہ سنتِ قولیہ مستحبہ ہے، بزرگانِ دین کے اَعراس کے مواقع پر قرآن خوانی، تلاوت، اذکار و درود شریف، مواعظِ حسنہ اور طعام کا انتظام، یہ

سب ایصالِ ثواب کی جائز صورتیں ہیں۔ عام مومنین ومومنات کے سوم، چہلم یا برسی کے موقع پر دیگر ایصالِ ثواب کی جائز صورتوں کے علاوہ طعام کا انتظام بھی اسی میں شامل ہے، اگر اس میں نذر، فدیہ اور کفارات مالی شامل نہ ہوں، تو یہ طعام (خواہ یہ ایصالِ ثواب بزرگانِ دین کے نام پر ہو یا عام مومنین ومومنات کے نام پر) نفلی صدقہ وخیرات ہے، جسے مالدار اور فقراء سب کے لئے کھانا جائز ہے۔ اگر نذر، فدیہ اور کفارۂ مالی کا کھانا ہو، تو یہ صرف فقراء ومساکین اور مستحقین زکوٰۃ کے لئے جائز ہے، مالدار لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ بزرگانِ دین کے اعراس مبارکہ یا دیگر مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، وہ مالدار اور فقراء سب کے لئے جائز ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرُّک بھی کہا جاتا ہے، یعنی اس میں نفلی ایصالِ ثواب کی نیت کے ساتھ ساتھ ان کی نسبت کی فضیلت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

عام مومنین ومومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے سوم کے موقع پر جو چنے تقسیم کیے جاتے ہیں، یا کھانا وغیرہ نفلی صدقہ کے طور پر تیار کیا جاتا ہے، اس کا کھانا امراء کے لئے جائز ہے، لیکن امام احمد رضا قادری نے اسے پسندیدہ امر قرار نہیں دیا، اس لئے اوپر ہم نے ان کے جو فتاویٰ نقل کیے ہیں، ان میں امراء کے لئے بعض مقامات پر جواز کا قول ہے اور بعض مقامات پر ناپسندیدگی کا، لیکن ناجائز ہونے کا قول نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ہاں جو یہ رسم پڑ گئی ہے کہ سوم، چہلم اور برسی کے موقع پر فوت شدہ مومنین ومومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے جو اجتماعی کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں لوگ اپنے احباب اور رشتہ داروں کو جمع کر لیتے ہیں، جو تقریباً سب کے سب غنی ہوتے ہیں اور فقراء کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو اس طریقہ کار کی تو بہر صورت حوصلہ شکنی ہونی چاہئے، جب کہ ولیمہ جو کہ خالص خوشی کی تقریب ہے، اس کے بارے

میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ شر الطعام طعام الولیمۃ یدعیٰ لھا الاغنیاء ویترک الفقراء۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ولیمہ کا بدترین کھانا وہ ہے کہ: جس میں (صرف) مالداروں کو دعوت دی جائے اور فقراء اور ناداروں کو چھوڑ دیا جائے، (بخاری، ج: 3، رقم الحدیث؛ 5177 المکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

ولیمہ کے ایسے کھانے کے بارے میں، جس میں صرف مالدار لوگ شریک ہوں اور فقراء و نادار لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے وعید فرمائی اور اسے ''شَرُّ الطعام'' (بدترین کھانا) قرار دیا، تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے ایسے کھانے جن میں فقراء کو ترجیح دینی چاہیے یا صرف فقراء ہی کو کھلا دیئے جائیں تو افضل ہے، ان میں فقراء کو بالکل محروم کر دینا میرے نزدیک غیر مستحسن امر ہے اور مقاصدِ شرعیہ کے خلاف ہے۔

ایصالِ ثواب کی مندرجہ بالا صورتوں کے فی نفسہٖ جواز کے باوجود میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایصالِ ثواب میں بھی ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دی جائے، یعنی مصارفِ

ایصالِ ثواب کی ایسی صورتیں اختیار کی جائیں، جن کا فیضان اور اجر و ثواب تا دیر جاری و ساری رہے، اور جس کے ایصالِ ثواب کے لئے یہ برسی یا چہلم کے موقع پر یہ اہتمام کیا جا رہا ہے، اس کے خیر کے کھاتے کھلے رہیں اور اجر و ثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے اعمالِ خیر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے (جن کا اجر وفیضان وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے)، یعنی صدقۂ جاریہ اور علم نافع (جس کا فیضان ان کے تلامذہ کے ذریعے بدستور جاری ہے)، اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1376، دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

''صدقاتِ جاریہ'' کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً (ا) مسجد کی تعمیر (ب) دینی مدارس کی تعمیر (ج) علماء وحفاظِ قرآن کی تعلیم وتربیت وکفالت (د) پانی کا کنواں کھود کر وقف کر دیا (ہ) خیراتی ہسپتال بنانا، دعوتی وتبلیغی دینی لٹریچر وغیرہ۔ اپنے اموات کے ایصالِ ثواب کے لئے ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دینی چاہئے۔ اور صدقۂ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مند لوگوں کے لئے پانی کا انتظام ہے، حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اُمِّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پاگئی ہیں، تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لئے) کنواں کھدوا کر (وقف کر دیا)، اور کہا: یہ اُمِّ سعد کا کنواں ہے، (سنن ابی داؤد، ج:1، ص:236)''۔

حدیث پاک سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ بندے کی طرف تصدق کی نسبت ایصالِ ثواب کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ تعبُّد وتقرُّب (یعنی بندگی اور قرابت) کی نیت سے، جیسے فیصل مسجد، شاہ جہاں مسجد وغیرہ، جب کوئی صدقہ بزرگانِ دین کی طرف

منسوب ہوتا ہے، تب بھی یہی مراد ہوتی ہے، جیسے گیارہویں شریف کا بکرا، یا میری قربانی، ان سب میں بندگی
اللہ تعالٰی کی مقصود ہوتی ہے اور بندوں کی طرف نسبت کا مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے۔

یومِ میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعین

سوال: 185

اللہ کے آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ کتبِ سیرت میں 12 ربیع الاول، 9 اور 8 ربیع الاول کی روایات موجود ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟، جبکہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے ربیع الاول مذکور کی تاریخوں میں دوشنبہ کا دن 9 ربیع الاول کو پڑتا ہے، ان وجوہات کی بنا پر تاریخ ولادت 20 اپریل 571ء تھی، (سیرت النبی، جلد اول، ص: 173 زاہد بشیر پرنٹر، لاہور)۔ مولانا الیاس کاندھلوی لکھتے ہیں: آپ ﷺ 8 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (سیرت النبی، جلد 1 ص: 51)۔ قاضی سلمان منصور پوری رحمۃ اللعالمین میں لکھتے ہیں: آپ کی ولادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔
مصر کے عالم محمود پاشا فلکی نے ریاضی کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ آپ کی ولادت 9، ربیع الاول کو ہوئی۔ مفتی صاحب بعد کی دو کتابوں کے حوالے میرے پاس موجود نہیں، (محمد ذیشان اصغر، گوجرانوالہ)۔

جواب:

دین میں نقل و روایت اصل اور اساس ہے۔ عقلی استدلالات، سائنسی و فنی حسابات سے ہم استفادہ تو کر سکتے ہیں، لیکن اس کی بنیاد پر نقل و روایت کی ساری اساس کو رد نہیں کر سکتے۔ اسی روش کی بنا پر ماضی قریب اور عہدِ حاضر کے متجدّدین نے

WWW.NAFSEISLAM.COM

، جو اہل مغرب سے ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں اور مستشرقین کے پروپیگنڈے سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں، معجزاتِ انبیاءِ کرام کا انکار کیا، واقعۂ اصحاب فیل، معجزۂ شق القمر، معجزۂ معراج النبی ﷺ اور سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کی جو روایات امّت میں تعامل و توارث کے ساتھ مسلّمہ چلی آرہی ہیں، ان کی عقلی تاویلیں شروع کر دیں ۔ اسی طرح ختم المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کا یومِ ولادت باسعادت پیر بارہ ربیع الاول کو ہونا، صدیوں سے امّت میں مسلّم ہے، اسے "تلقّی بالقبول" حاصل ہے اسی پر تعامل و توارث چلا آرہا ہے، لہٰذا اس کے لئے ازسرِ نو بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع کرنا درست نہیں ہے۔ پھر یہ کوئی اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ کسی نے اس معین دن کا انکار کر دیا تو شرعی قباحت لازم آئے گی یا اس کے برعکس اپنی تحقیق کی بنا پر کوئی رائے قائم کر دی تو اسکے محض اس رائے کے سبب فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔ آپ ﷺ کے یومِ ولادت کا متبرّک و مقدس ہونا مسلّم ہونا چاہئے، تعیین پر اعتقاد و یقین ضروریاتِ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔ جدید سائنسی و فنی علوم کی بنا پر رائے قائم کرنے والے خود بھی آپس میں متفق نہیں ہیں اور یہ حقیقت آپ کے سوال میں بھی عیاں ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک پر انحصار کر کے ہم نقل و روایت اور تعامل و توارث پر مبنی متفقہ رائے کو بدل بھی دیں، تو اختلاف کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا۔ پس اصل مبحث یہ نہیں ہے کہ تاریخ کونسی تھی، اصل مرکزِ عقیدت یومِ میلاد النبی ﷺ کی تقدیس، تعظیم اور حرمت ہے اور اہلِ عقیدت و محبت کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے عہدِ حاضر کے علماء میں سے جسٹس علامہ پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف ضیاء النبی میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی، اہلِ ذوق اس کی جلد دوم، صفحات 33 تا 39 پر تفصیل سے

ملاحظہ فرمالیں ۔ ہمارے ایک دوسرے دینی اسکالر پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے بھی اپنی تصنیف میلاد النبی میں اس پر بحث کی ہے ۔ہم ان دونوں اہلِ علم کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ چند دلائل کا ذکر کر رہے ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فخرِ کائنات سرورِ دو عالم ﷺ کا یومِ میلاد دوشنبہ (پیر) کا دن تھا،اس پر بھی تمام علمائے امّت کا اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا اور متقدمین ومتاخرین کا اجماع اسی پر ہے کہ تاریخ ولادت 12 ربیع الاول عام الفیل ہے ۔بقول قاضی سلمان منصور پوری مصنف ''رحمۃ اللعالمین'' یہ 22اپریل 571 عیسوی اور ہندی مہینوں کے حساب سے یکم جیٹھ 628 بکرمی بنتی ہے۔معروف سیرت نگار علامہ محمد رضا مصری مصنف ''محمد رسول اللہ ﷺ'' اور محمد صادق ابراہیم عرجون کی تحقیق کے مطابق سنِ عیسوی کے حساب سے 20 اگست 570 عیسوی بنتی ہے ۔علم الہیئت کے ماہر محمود پاشا فلکی مصری اور بعض دیگر متاخرین کی تحقیق 9 ربیع الاول کے حق میں بھی ہے ،مگر عالمِ اسلام میں قدیم زمانے سے اجماع 12 ربیع الاول پر ہی چلا آرہا ہے اس لئے قولِ مختار کا درجہ اسی کو حاصل ہے ۔اس حوالے سے ہم بعض آئمہ کی تحقیق بیان کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق متوفی 151 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شھر ربیع الاول ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بروز 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، (الوفا ص:88)''۔

مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفی 213 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من شھر ربیع الاول عام الفیل۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ پیر کے دن 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، (سیرت النبویہ، جلد 1، ص: 158، مطبوعہ: دار الجیل، بیروت)"۔

معروف مفسّر و مؤرّخ امام ابن جریر طبری متوفی 310 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شھر ربیع الاول۔

ترجمہ: "رسول کریم ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بروز پیر 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، (تاریخ الامم والملوک المعروف تاریخِ طبری، جلد 2، ص: 125)"۔

علامہ ابن خلدون متوفی 808 ہجری جو علمِ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں بلکہ فلسفۂ تاریخ کے موجد بھی ہیں، لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من ربیع الاول لا ربعین سنۃ من مّلك کسریٰ نوشیروان۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت عام الفیل کو ماہِ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، نوشیرواں کی حکمرانی کا چالیسواں سال تھا، (التاریخ ابن خلدون، جلد 2، ص: 710، مطبوعہ: بیروت)"۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی متوفی 429 ہجری، جو علمِ سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" علمِ سیاست کے طلباء کے لئے بہترین ماخذ ہے، اعلام النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں: لانہ ولد بعد خمسین یوما من الفیل وبعد موت أبیہ فی یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول۔

ترجمہ: "واقعۂ اصحاب الفیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز پیر بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (اعلام النبوۃ ص: 192)"۔

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن یحیٰ بن سید الناس الشافعی الاندلسی متوفی 734ہجری، لکھتے ہیں: ولد سیّدنا ونبیّنا محمد رسول الله ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل قیل بعد الفیل بخمسین یوماً۔

ترجمہ: "ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد ﷺ پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ واقعۂ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی، (عیون الاثر، جلد 1، ص: 26، مطبوعہ: دارالمعرفہ، بیروت)"۔

دورِ حاضر کے سیرت نگار محمد صادق ابراہیم عرجون، جو جامعہ ازہر مصر کے کلیہ "اصول الدین" کے مدیر رہے ہیں، اپنی تصنیف "محمد رسول اللہ" میں لکھتے ہیں: وقد صح من طرق کثیرة انّ محمدا علیه السلام ولد یوم الاثنین لاثنتی عشرة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل فی زمن کسریٰ نوشیروان ویقول اصحاب التوفیقات التّاریخیة انّ ذالك یوافق الیوم المکمل للعشرین من شهر اغسطس ۵۷۰ م بعد میلاد المسیح علیه السلام۔

ترجمہ: "بکثرت طُرق روایت سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ بروز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول عام الفیل، کسریٰ نوشیرواں کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ایسے علماء، جو شمسی اور قمری تاریخوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں، نے کہا ہے کہ اس دن شمسی تاریخ 20 اگست 570ء بنتی ہے، (محمد رسول اللہ، جلد 1، ص: 102، مطبوعہ: دارالقلم، دمشق)"۔

اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہری ''ضیاء النبی ﷺ'' میں لکھتے ہیں: ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں یہی تاریخ روایت کی ہے، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں: رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ عن عفّان عن سعید بن میناء عن جابرٍ وابن عباس انّھما قالا ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول وفیہ بُعث وفیہ عُرج بہ الی السمآء وفیہ ھاجر وفیہ مات وھذا ھو المشھور عند الجمھور واللہ اعلم بالصواب ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ عام الفیل روز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، اسی روز آپ ﷺ کی بعثت ہوئی، اسی روز آپ کو معراج عطا ہوئی، اسی روز آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی اور آپ ﷺ کے وصال مبارک کا دن بھی یہی ہے، جمہورِ امت کے نزدیک یہی تاریخ (بارہ ربیع الاول) مشہور ہے، واللہ اعلم بالصواب''۔

اس کے پہلے راوی ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں ان کے بارے میں ابو زرعہ رازی متوفی 264 ہجری کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا ۔محدث ابن حبان فرماتے ہیں ابو بکر عظیم حافظِ حدیث تھے ۔دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایا امام، ثقہ اور صاحبِ ضبط واتقان ہیں ۔تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ یہ صحیح الاسناد روایت دو جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: برصغیر پاک وہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا

فلکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا بلکہ پیر کا دن نو ربیع الاول کو بنتا ہے، لہٰذا نو تاریخ صحیح ہے، لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے، مفتی محمد شفیع صاحب انہیں مکّی لکھتے ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے انہیں قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجّم بتایا ہے۔ مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا، البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے "نتائج الافہام" کے نام سے عربی میں کیا، اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدر آباد نے اردو کا جامہ پہنایا اور 1898ء میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔ محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں تو صحابۂ کرام، تابعین اور دیگر قُدَماء کی روایات کو جھٹلانے کے لئے ان پر انحصار کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی بھی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔ محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے علمِ نجوم کے حسابات سے یومِ ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: اہل زیچ (جنتریوں کا حساب نکالنے والے) کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعے حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی۔ پس ہمیں قدیم سیرت نگاروں مُحدّثین، مفسّرین، تابعین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی بات ماننا پڑے گی، (ضیاء النبی ﷺ جلد دوم ص: 33 تا 39، مطبوعہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔")

محافلِ میلاد میں مخلوط اجتماعات

سوال : 186

میلاد شریف وگیارہویں ،مجالسِ وعظ وقرآن خوانی اورایصالِ ثواب کی ایسی محافل ، جہاں بے پردہ عورتیں اکثر حاضری دیتی ہیں،تو اس طرح کا نیاز پکانا، بہت سے پیسے خرچ کرنا ،مالداروں کو کھلانا اور بے پردہ عورتوں کا مردوں کے ساتھ جمع ہونے کے بارے میں ازروئے شرع کیا حکم ہے؟۔

جواب:

محافلِ ایصالِ ثواب ہوں، جیسے محافل میلاد شریف ،گیارہویں شریف کی محفل ،مجالس وعظ ،قرآن خوانی کی محافل ،اپنے اموات کی سوم، چہلم یا برسی کی محافل وغیرہ ، یا شادی کی محافل ودیگر سماجی تقریبات ،ان سب میں مرد وزن کا ایسا مخلوط اجتماع (Mixed ghathering)،جن میں خواتین غیرمحرم مردوں کے ساتھ بےتکلف اور بے حجاب گھل مل جائیں،شریعت کی روسے یہ جائز نہیں ہے،اورخاص طورپروہ تقاریب یا اجتماعات جو نیک مقاصد کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منعقدکئے جاتے ہیں،ان
میں شریعت کی پاسداری کا زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔

کس دور میں کس چیز کا اجر زیادہ ہے،میری سمجھ کے مطابق یہ ہر جگہ اور مقام کے اعتبار سے لوگوں کی مقامی ضروریات پرمنحصر ہے،کہیں پانی کی فراہمی اشد ضرورت ہے،تو اس کا اجر زیادہ ہوگا،کہیں مسجد یا دینی مدرسے کے قیام کی زیادہ ضرورت ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا،کہیں لوگ خوراک ولباس کے محتاج ہیں،تو اس کا اجر زیادہ ہوگا،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''وہ دشوار گزار گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا، اور (اے انسان!) تجھے کیا خبر کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟، (لوگوں کی) گلوخلاصی کرانا، یا (شدید) بھوک کے دن کھانا کھلانا یا کسی ایسے یتیم کو جو (تمہارا) رشتے دار بھی ہے، یا کسی ایسے مسکین کو (جو تنگ دستی کے مارے) خاک میں رل رہا ہے، (البلد: 16-11)''۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کا زنا میں حصہ لکھ دیا ہے، وہ اسے بہر حال پائے گا، آنکھ کا زنا دیکھنا ہے، اور زبان کا زنا (فحش) گفتگو کرنا ہے، اور نفس (گناہ) کی تمنا کرتا ہے اور (مبتلائے) شہوت ہوتا ہے، اور شرم گاہ اس طرح سب کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (یعنی بالآخر ان مبادی واسباب اور محرکات زنا کے مراحل سے گذرنے کے بعد انسان شہوت نفس سے مغلوب ہوکر زنا کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرلیتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نفس پر قابو پاکر بچ جاتا ہے)، (صحیح البخاری: 4، رقم الحدیث: 6243، المکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

اس لئے احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان زنا کے محرکات (Incentives) واسباب سے ہمیشہ بچ کر رہے تاکہ غلبۂ شہوت سے مغلوب ہوکر اس گناہ میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور مردوں اور عورتوں کے مخلوط بے پردہ اجتماعات گناہ کے مبادیات ومحرکات ہی میں شمار کیے جائیں گے۔

تبرکات انبیاء کرام کا احترام

سوال: 187

ہمارے شہر میں بارہ ربیع الاول کے دن رسول پاک ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ایک مسجد میں موئے مبارکہ کی زیارت کا اہتمام کیا جاتا ہے

WWW.NAFSEISLAM.COM

،جس میں عورتیں بھی بغیر پردہ زیارت کے لئے مسجد آتی ہیں، دوران زیارت نماز کا وقت ہوجاتا ہے،تو نماز بجائے مسجد کے ملحقہ مدرسہ میں ادا کی جاتی ہے، یہ سب باتیں کہاں تک صحیح ہیں؟۔

جواب:

انبیاء کرام کے آثار اور تبرکات کا احترام قرآن وسنت سے ثابت ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔

ترجمہ:"اوران کے نبی نے ان سے کہا: بیشک ان کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا،جس میں تمہارے رب کی طرف سے (تمہارے دلوں کا) سکون ہے،اور آل موسیٰ اور آل ہارون کے باقی ماندہ (تبرکات) ہیں،اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے،بلاشبہ اس میں تمہارے لئے ضرور ایک نشانی ہے،اگر تم مومن ہو، (بقرہ:248)"۔

رہا یہ سوال کہ اس تابوت یا صندوق میں کیا تھا،جسے اللہ کے نبی نے حضرت طالوت کی سلطنت کی نشانی اور رب کی طرف سبب باعث تسکین قرار دیا ہے،تو اس کے بارے میں کئی تفسیری اقوال ہیں،ان کے مطابق اس میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے عصا،الواحِ تورات کے ٹکڑے،ان کے کپڑے اور بعض روایات میں نعلین کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اذْهَبُواْ بِقَمِيصِي هَـذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيراً ۔

ترجمہ: ”(یعقوب علیہ السلام نے فرمایا) میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، (یوسف: 93)“۔

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء برکت و کامرانی کا باعث ہوتی ہیں۔

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

”حضرت اسماء بنت ابی بکر کے غلام عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھیجا اور کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے، انہوں نے ایک طیالسی کسروانی جبہ نکالا جس کی آستینوں اور گریبان پر ریشم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، حضرت اسماء نے کہا:

ھذہ کانت عند عائشۃ رضی اللہ عنھا حتی قبضت فلما قبضت قبضتھا و کان النبی ﷺ یلبسھا فنحن نغسلھا للمرضیٰ ونستشفی بھا۔

یہ جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک ان کے پاس تھا، اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر میں نے اس پر قبضہ کر لیا، نبی اکرم ﷺ اس جبہ کو پہنتے تھے، ہم اس جبہ کو دھو کر اس کا پانی بیماروں کو پلاتے تھے اور اس جبہ سے ان کے لئے شفا طلب کرتے تھے، (صحیح مسلم جلد: 2، ص: 190 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، 1375ھ)“۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ”خبیب بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں خبیب بن عدی کا ہونٹ کٹ کر لٹک گیا رسول اللہ ﷺ نے لعاب دہن لگا کر اس کو جوڑ دیا، (دلائل النبوت ج: 3، ص: 98-97، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ، بیروت)“۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن (ج:1،ص:929-928 -930-،فرید بک اسٹال لاہور) میں تبرکات انبیاء کے موضوع پر باحوالہ مفصل ومدلل بحث کی ہے۔ اس وقت دنیا میں کئی مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے "موئے مبارک" کی موجودگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے،ان کی زیارت بھی کرائی جاتی ہے،ہم اس مقدس نسبت کی تعظیم اوراکرام واحترام کرتے ہیں،لیکن ان دعووں کی تصویب وتوثیق کے ہمارے پاس کوئی قطعی شواہد نہیں ہیں،

اس لئے قطعیت کے ساتھ نہ ہم نسبت کی نفی کرسکتے ہیں، نہ اثبات،لیکن نسبت کا احترام ہمارا عقیدہ بھی ہے اور عقیدت بھی۔یہ ایسا ہی ہے کہ بعض روایات کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام کی مجموعی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے،لیکن ہر مسلمان کے لئے تعیین شخصی کے ساتھ

ان پچیس انبیاءِ کرام پر ایمان لانا فرضِ عین ہے کہ جن کے اسماءِ مبارکہ قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقص عليك۔

ترجمہ:"اور ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے،ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان کرفرمادیااوران میں سے بعض کا حال آپ پر بیان نہیں فرمایا،(المؤمن: 78)"۔

لہٰذاان معین ومشخص انبیاءِ کرام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دیگرانبیاءِ کرام پر اجمالی طور پرایمان لانا فرض عین ہے،یعنی ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو بھی مختلف ادوار میں نبی یا رسول بنا کربھیجا ہے،وہ سب حق پر تھےاوران میں سے کسی

کی بھی نبوت کا انکار کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ۔

ترجمہ: ’’رسول (مکرم) ایمان لائے اس (کتاب) پر جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (تمام) مومن بھی (اس کتاب پر ایمان لائے)، سب سے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی (تمام) کتابوں پر اور اس کے (تمام) رسولوں پر، (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم (ایمان لانے میں) اس کے (تمام) رسولوں کے درمیان کسی ایک کے بارے میں فرق نہیں کرتے، (کہ اس پر ایمان نہ لائیں)، (بقرہ: 285)‘‘۔

لہٰذا موئے مبارک کی زیارت اور اس کا احترام واکرام باعث سعادت ہے، لیکن اس کے لئے انتظامیہ کی طرف سے مسجد میں جماعت کو موقوف کر دینا یا مسجد سے متصل دوسری عمارت میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ’’نماز باجماعت‘‘ واجب ہے، مسجد میں جماعت مشروع ہے، جبکہ موئے مبارک کی زیارت ایک مستحب و مستحسن امر ہے، تو امرِ مستحب کی خاطر واجب کو ترک کرنا یا جماعت کو مسجد سے منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ موئے مبارک کی زیارت کا اہتمام مسجد کے متصل مدرسہ کی عمارت میں کیا جاسکتا ہے۔ اور نماز باجماعت کے وقت زیارت کو موقوف کر لینا چاہئے تاکہ لوگ باجماعت نماز پڑھیں، کیونکہ موئے مبارک کی زیارت کی مُحرّک عقیدت ومحبت رسول ہے، اور اس عقیدت ومحبت کا تقاضا ہے کہ نماز باجماعت کو ترجیح دی جائے، یا نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں زیارت کا اہتمام کیا جائے، عورتوں کے لئے الگ اہتمام ہو اور ان پر لازم قرار دیا جائے کہ وہ باپردہ

اور حجاب شرعی کے اندر رہتے ہوئے زیارت کے لئے آئیں۔

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں

سوال: 188

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے؟۔

جواب:

عوام کا یہ کہنا کہ: ''ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے''؟۔یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ درست ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاء إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔

ترجمہ: ''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ ہی بے نیاز (ہر احتیاج سے پاک) ہے، سب خوبیوں والا ہے، (فاطر:15)''۔

اردو میں لفظ''غریب''مفلس ونادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ کہ عربی میں اس کے معنی ہیں اجنبی اور مسافر۔اور مفلس، نادار اور محتاج کے معنی میں لفظ''فقیر'' اور ''مسکین'' آتے ہیں۔اور اس میں کیا شک ہے کہ ہم سب اللہ کے محتاج ہیں، اور اگر کوئی دنیوی اعتبار سے غنی اور مال دار بھی ہے تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے، وہ چاہے تو نواز دے اور چاہے تو سب کچھ سلب فرمادے، بندے کی کیا مجال۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔

ترجمہ: ''(لوگو! آخر) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ آسمانوں اور زمینوں کا (حقیقی) وارث تو اللہ ہی ہے، (الحدید:10)''۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

نمازِتراویح کی امامت کامعیار

سوال: 189

ہمارے یہاں رمضان شریف میں اپنی سنی مسجدوں میں قرآن شریف کی تراویح ہوتی ہے،تراویح پڑھانے والے مدرسے کے طالب علم ہی ہوتے ہیں،جن کوقرآن صحیح یادنہیں ہوتااورتجویدبھی نہیں جانتے،سال میں اکثراوقات نمازکی پابندی بھی نہیں کرتے،اورداڑھی بھی منڈھواتے ہیں،ان میں سے بعض کوتونماز کے مسائل بھی نہیں آتے،ایسوں کوتراویح میں امام بنانا کیسا ہے؟اورکیاان کے پیچھے تراویح ہوجاتی ہے یانہیں؟،کچھ لوگوں نے انتظامیہ مسجد سے بات کی،جواب میں کہاگیا کہ حافظوں کوپریکٹس کے لئے چانس دیتے ہیں،توایسا سسٹم چلانے میں گنہگارکون ہے؟اوریہ سب کام ہمارے یہاں ایک مفتی صاحب کی زیرنگرانی ہورہاہے،جوحکم شرع ہوبیان فرمائیں۔

جواب:

متشرع ودین دارحافظ وقاری وعالم امام کی موجودگی میں ایسےافرادکونماز تراویح کاامام بناناہرگز درست نہیں ہے،جوکہ:

(ا)نابالغ ہوں(ب)تلاوت قرآن میں ایسی غلطیاں کرتے ہوں جوفسادنماز کا باعث بنتی ہیں(ج)داڑھی منڈھواتے ہیں یاکٹواتے ہیں اورحدشرعی سے کم ہوتی ہے (د)یارمضان المبارک سے قبل محض قرآن سنانے کے لئے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان کے بعدمنڈوادیتے ہیں یاحدشرعی سے کم کردیتے ہیں،(کیوں کہ اس میں سنت رسول کااستخفاف ہے

جس کے لئے بڑی وعید ہے) (ہ)یاسال بھرنماز کے تارک رہتے ہیں۔مفتی

صاحب کو انتظامیہ کمیٹی یا بااثر لوگوں کی رضامندی کی خاطر شرعی حدود وقیود کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔انہیں چاہئے کہ حفاظ کرام کو وہ اتباع شریعت کی تلقین کریں اور جب تک وہ

اتباع شریعت پر کاربند نہیں ہوتے،انہیں امام نہ بنائیں،بلکہ جماعت سے باہر ایک دوسرے کو قرآن کی منزل سنا کر اس کی حفاظت کریں۔

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت

سوال : 190

ہمارے یہاں مدرسے میں سال بھر کے بعد ایک سالانہ رپورٹ چھپواتے ہیں،جس میں کچھ اساتذہ اور طلبا کی تصاویر ہوتی ہیں،ایسی تصویریں جائز ہیں یا ناجائز؟۔

جواب:

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کا شائع کرنا درست نہیں ہے،اس سے اجتناب بہتر ہے،کیونکہ یہ ایسی ضروریات میں سے نہیں ہے،جن پر اس فقہی اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ:"الضرورۃ تبیح المحظورات"یعنی"ضرورتیں ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں"۔البتہ ہم دینی،دعوتی وتبلیغی مقاصد کے لئے (Movies/video)فلم کے جواز کے قائل ہیں،بشرطیکہ ان میں دیگر ممنوعات ومحارم شامل نہ ہوں،مثلاً بے پردہ بے حجاب و بے تکلف مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات وغیرہ،بعض علماء (Vedeo/Movie) کے عدم جواز کے قائل ہیں،عوام جس عالم،فقیہ یا مفتی پر اعتماد کریں،اس کے فتوے پر عمل کریں۔